

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے فروغ میں  
مولانا وحید الزمان کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کردار

مقالہ نگار

قمر الزمان

شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



**MAULAVI WAHIDUZZAMAN KARANVI HIS  
CONTRIBUTION TO ARABIC LANGUAGE  
AND LITERATURE IN INDIA**

**THESIS**

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

**Doctor of Philosophy  
in  
Arabic**

BY

**QAMRUZZAMAN**

Under the Supervision of

**Prof. Syed Kafeel Ahmad Qasmi**

DEPARTMENT OF ARABIC  
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY  
ALIGARH  
2000-2001

# فہرست ابواب

صفحہ	عنوان
------	-------

مقدمہ

## باب اول

ہندوستان بیسویں صدی میں

۱	سیاسی احوال
۱۰	مذہبی و سماجی احوال
۱۲	عربی زبان و ادب

## باب دوم

مولانا وحید الزماں کیرانوی

۱۸	نام نسب اور خاندانی کوائف
۲۳	تعلیم و تربیت
۳۰	دارالعلوم دیوبند سے وابستگی سے قبل
۳۴	ملی و اجتماعی سرگرمیاں
۴۰	وفات

## باب سوم

دارالعلوم دیوبند

۴۲	دارالعلوم میں تدریس
----	---------------------

۵۳	دارالعلوم کے انتظامی امور میں آپ کا حصہ
۵۹	دارالعلوم کا سانحہ
۷۵	دارالعلوم سے مولانا کی علیحدگی

## باب چہارم -----

۸۸	عربی زبان و ادب کی ترویج
۹۶	دارالفکر
۹۸	دارالمؤلفین
۱۰۱	النادی الادبی
۱۰۸	صحافتی خدمات
۱۳۴	اسلوب تحریر

## باب پنجم -----

۱۴۹	ادبی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ
۱۷۳	اصلاحی تصانیف
۱۷۹	معاصرین کی نظر میں مقام و مرتبہ
۱۸۸	دارالعلوم میں مولانا کے اثرات
۱۹۲	خاتمہ



## مقدمہ

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ زمانہ قبل از اسلام عرب تاجروں کی آمد سے ہندوستان عربی زبان سے روشناس ہوا اور پھر مسلمانوں کی سکونت و استقرار کے بعد عربی زبان و ادب کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلام اور عربی زبان کا رشتہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، کسی عہد اور کسی ملک میں بھی یہ رشتہ منقطع نہ ہو سکا اسکی اہم وجہ عربی زبان میں قرآن مجید کا نزول ہے اور مسلمانوں کیلئے قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی کتاب قابل احترام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی مسلمانوں نے بھی قرآن مجید ہی کی نسبت سے عربی زبان کو گلے لگایا اور اسکی نسبت سے عربی زبان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا، ہر دور میں ایسے ایسے علماء و ادباء پیدا ہوئے جن کی عبقریت دانشوروں کے درمیان مسلم رہی ہے، عربی زبان و ادب میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک زریں باب کا درجہ رکھتی ہیں۔

جن ارباب علم و فضل نے عربی زبان و ادب کو خاص دلچسپی کا میدان قرار دیا اور اپنی صلاحیتیں صرف کر کے افکار و خیالات کو احاطہ تحریر میں لائے ان کی فہرست طویل ہے۔

آٹھویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری تک کا زمانہ عربی زبان و ادب کے لئے خود عرب ممالک میں انحطاط و زوال کا دور تھا، لہذا طبعی طور پر ہندوستان بھی ان اثرات سے خالی نہیں رہا۔ جمود و تعطل کا یہ دور اس وقت ختم ہوتا دکھائی دیا جب کہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں یورپ کے علوم و فنون سے عرب ممالک آشنا ہوئے، آہستہ آہستہ عربوں کو احساس ہوا اور انھوں نے عربی زبان و ادب کی طرف توجہ دینی شروع کی یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری میں عربی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس صدی میں زبان و ادب کی تجدید ہوئی اور اس زمانہ میں عربی کے بے شمار ادیب، انشاء پرداز، صحافی، شاعر اور نقاد پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے علم و حکمت سے عربی زبان و ادب کو مالا مال کیا، ہندوستان میں بھی متعدد علمی و ادبی شخصیات ابھر کر سامنے آئیں۔ مثال کے طور پر نواب صدیق حسن خاں، پروفیسر عبدالعزیز میمن، سید عبداللہ الحئی رائے بریلوی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہم عربی زبان و ادب کی یہ وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اس دور میں ہندوستان میں عربی زبان و ادب کا علم بلند کیا اور عربی زبان کی درس و تدریس کا ایک سلسلہ شروع کیا، انھیں کی پیروی کرتے ہوئے اس دور کے ایک معتبر عالم مولانا وحید الزماں نے اپنا علمی سفر شروع کیا۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی بیسویں صدی کے وہ فرد ہیں جس کی پوری صدی میں شاید ہی کوئی مثال

ہو، ہندوستان میں عربی زبان و ادب کو ان کے قلم سے جو جلا ملی اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، خاص طور پر دارالعلوم دیوبند میں جو کارنامہ انجام دیا اور عربی زبان و ادب کی جو تحریک چلائی اسکی مثال کوئی شخص بھی پیش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں کم ہی لوگ ایسے گزرے ہیں جن کو ایک ساتھ کئی فنون پر مہارت تامہ حاصل تھی۔ کسی نے حدیث کے ذریعہ عربی زبان و ادب کی خدمات انجام دی کسی نے سیاسی طور پر اسے استعمال کیا کسی نے اس زبان کو سوانحی انداز میں پیش کیا اور کسی نے اس صلاحیت کا اظہار شاعرانہ لب و لہجہ میں کیا، اس طرح یہ حضرات عربی زبان کے ماہرین تسلیم کئے گئے مگر اسکے برعکس ہم جب مولانا کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو بیک وقت بہت سے علوم میں ان کی مہارت تسلیم کی جاتی ہے، قرآن فہمی، حدیث دانی، فقہی بصیرت، علمی سیاست، علم اخلاقیات، منطق و فلسفہ جیسے سائنس کے بیشتر علوم میں خواہ وہ تجرباتی ہوں یا فکری ان کی صلاحیت مسلم ہے۔

مولانا وحید الزماں مدارس عربیہ اور فضلاء دارالعلوم دیوبند کے لئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے افکار و نظریات اور ان کا عمل ہمیں ایک ایسی راہ کا پتہ دیتا ہے جس کی پیروی دینی مدارس اور ان کے فضلاء کے لئے منزل مقصود کا حصول یقینی بناتی ہے بلکہ ہم یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ دینی مدارس اور ان کے ارباب حل و عقد اگر خلوص نیت کے ساتھ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس منزل تک پہنچنے کیلئے مولانا مرحوم جیسے بصیرت مند اور روشن دماغ عالم دین کے افکار و خیالات اور عملی تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میدان میں مفید خدمات انجام دی جاسکتی ہے۔

دینی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم پر ایک عرصہ سے بحث جاری ہے اس سلسلہ میں کچھ حضرات کے خیالات بہت زیادہ قدامت پرستانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں تو کچھ اور حضرات ضرورت سے زیادہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مولانا وحید الزماں اس ضمن میں نہایت معتدل و متوازن اور حقیقت پسندانہ موقف رکھتے تھے ان کے یہاں قدامت پسندی بھی ہے اور جدت طرازی بھی، وہ اسلاف کی زریں روایات کو سینہ سے لگائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے لیکن عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے قدردان تھے لیکن وہ روایات کے نام پر جمود و تعطل اور وقت کی ضرورتوں سے آنکھیں بند کر لینے کو کوتاہ اندیشی قرار دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ مقصد اور وسائل میں فرق کرنا ضروری ہے مقصد کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا لیکن وسائل کو حالات کے مطابق نہ صرف بدلا جاسکتا ہے بلکہ کئی بار بدلنا ضروری ہوتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔

مدارس اسلامیہ کا بنیادی مقصد ملت کے نو نہالوں کو علوم شریعت سے بہرہ ور کرنا ہے تاکہ وہ ملت کی دینی ضرورتوں کی تکمیل اور اسلام کا پیغام عام کر سکیں۔ اس نصب العین سے ایک انچ بھی ہٹنا ہمیں کسی قیمت

پر گوارہ نہیں کرنا چاہیے، ہمیں ان کی افادیت کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لئے کسی بھی جائز اور مفید اصلاح و ترمیم کو قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے، یہ کہہ دینا کہ انہی وسائل کے ذریعہ ہمارے اکابر نے مثالی خدمات انجام دی تھیں اس لئے ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، محض کوتاہ نظری اور اپنی ذمہ داری سے فرار کے مترادف ہے، جو وسائل کسی عہد میں تھے ضروری نہیں کہ ہر زمانہ میں ان کی افادیت برقرار رہے۔ ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے مدارس سے نکلنے والی نئی نسل معیار پر پوری نہیں اتر پار ہی ہے اور معاشرہ پر علماء کا اثر و رسوخ بڑی تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے تو اس کے تدارک کے لئے ہمیں ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ وسائل میں کسی تبدیلی کو قبول نہ کرنے پر اڑے رہنے کے نتیجہ میں بالآخر مقصد اصلی ہی فوت ہو کر نہ رہ جائے۔

مولانا کے یہ حقیقت پسندانہ نظریات محض ذہنی خاکہ نہیں تھے بلکہ جب بھی موقع ملا انھوں نے ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ دارالعلوم کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے بعد مولانا نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے ذہنی خاکوں میں رنگ بھرنا اور عرصہ سے چلی آرہی تعلیمی و انتظامی کمزوریوں کو دور کرنے کا عمل شروع کر دیا اور اتنی ہی تیزی سے اس کے خوشگوار نتائج بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے لیکن افسوس کہ کوتاہ بینوں اور ظلمت پسندوں کو یہ گوارہ نہ ہو سکا اور مولانا کو بڑی مختصر مدت کے اندر ہی اپنے عہدہ سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ اگر مولانا کو کچھ اور مہلت ملی ہوتی تو ہمیں یقین ہے کہ وہ مزید اصلاحات کے ذریعہ دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو تیز رفتار ترقی کی راہ پر ڈال دیتے۔

اس سے پہلے عربی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے بھی مولانا نے اپنے حقیقت پسندانہ نظریہ کو عمل کا ملبوس پہنا کر اور حیرت انگیز نتائج پیدا کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا، اس بات سے مولانا کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کم از کم عربی زبان کی تعلیم کی حد تک ایک مختصر سی مدت کے اندر ناقابل یقین انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے تدریس کا انداز بدلا، مشق و تمرین کے نئے طریقے ایجاد کئے، حسب ضرورت نصابی کتابیں مرتب کیں، طلباء کی ذہنیت بدلی، ان کا انداز فکر ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو غرض ہر چیز میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا جو طلبہ کئی برس تک عربی زبان کے قواعد اور عربی کی کتابیں پڑھنے کے باوجود عربی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت سے عاری تھے وہ سال دو سال کے اندر عربی زبان کے ماہر بن جاتے تھے مولانا نے کسی بھی معاملہ میں پرانی لکیروں کو پیٹتے رہنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے جدت طراز ذہن سے نئے طریقے اور نئی راہیں ایجاد کیں اس طرز عمل کی تہہ میں وہی فکر کار فرما تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا کہ مقصد اصلی کے حصول کے لئے حالات کے مطابق وسائل میں اصلاح و تبدیلی کرنا نہ صرف مناسب بلکہ بسا اوقات ضروری ہوتا ہے۔ مولانا نے عربی زبان کی تعلیم کے لئے جو لائحہ عمل اختیار

کیا اگر ہم انہیں خطوط پر تمام علوم و فنون کی تعلیم کا نظم قائم کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ عربی زبان کے شعبہ میں جو نتائج برآمد ہوئے ویسے ہی نتائج دوسرے شعبوں میں بھی برآمد نہ ہوں۔

بہر حال مولانا تنہا مدرس ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے مربی بھی تھے، مردم سازی میں وہ اپنی مثال آپ تھے، ایک بلند مدرس و معلم کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مقرر بھی تھے، علاوہ ازیں غیر معمولی تصنیفی صلاحیتوں کے مالک بھی تھے، چنانچہ آپ کی تصنیف کردہ لغات (القاموس الجدید اردو-عربی، عربی-اردو، اور القاموس الاصطلاحی عربی-اردو-عربی) برصغیر میں اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ جس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس وقت اس سلسلہ کی پانچ کتابیں مطبوعہ ہیں جن سے اس زمانہ میں برصغیر کا شاید ہی کوئی عالم مستغنی نہ ہو اسی طرح ترین کے لئے ”القرأة الواضحة“ کے تین اجزاء آپ کا علمی کارنامہ ہیں۔ ”نفس اللادب“ کے عنوان سے ایک مختصر رسالہ (جو دارالعلوم کے درسی نصاب میں شامل ہے) بھی آپ کی یادگار ہے، اس کے علاوہ دارالعلوم کے ابتدائی تدریسی دور میں آپ کے جو ہر سہ ماہی عربی جریدہ ”دعوة الحق“ کی شاندار تحریروں اور مقالات سے بھی نکھر کر سامنے آئے۔ آپ کی تحریروں میں ایمانی جوش و ولولہ اور عربی سلاست و روانی جھلکتی دکھائی دیتی ہے، بعد میں جمعیت علماء ہند کے عربی ترجمان ”الکفاح“ پر آپ نے بے انتہا محنت کی اور اس کے واسطے سے جمعیت کا تعارف عربی حلقوں میں کرایا، آپ کی وہ تحریریں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

علاوہ ازیں یہ باب ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ مولانا وحید الزماں صاحب چونکہ ایک انقلابی شخصیت کے مالک اور دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے اور ایسی شخصیتوں کی زندگی اختلافی امور سے صرف نظر کر کے اس شخصیت کو سمجھنا اس کی تہ بہ تہ پر توں کو کھولنا اور اس کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہو سکتا، ہمارے خیال میں مولانا کا جب بھی ذکر آئے گا خلافت کا ذکر بھی ناگزیر ہوگا، خاص طور پر دارالعلوم کے دور اختلاف کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسکے بغیر آپ کی شخصیت کے تمام راز اور پوری صلاحیتیں سامنے نہیں آسکتی، جب محتاط مورخین بھی تاریخ اسلام اور سیر صحابہ مرتب کرتے وقت مشاجرات صحابہ سے صرف نظر نہ کر سکے اور جنگ جمل و صفین کو چار و ناچار جگہ دینی پڑی تو اس عہد کا مؤرخ اور کسی قابل احترام شخصیت کا سوانح نگار اس سے کس طرح اغماض برت سکتا ہے، البتہ یہ اظہار ضروری ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حتی الامکان اعتدال برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے اور حقائق سے صرف نظر نہیں کیا جائے۔

بہر حال اب جب کہ وہ عہد گزر چکا ہے اور اختلاف و شکایات کے وہ اسباب بھی زائل ہو چکے ہیں جو اس وقت بہت اہم نظر آتے تھے، تو اب سعادت مند اخلاف کے لئے صحیح راستہ اور مناسب طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے کو معذور بلکہ ماجور سمجھیں اور ان کے لئے دعاء مغفرت کرتے رہیں۔

اس مقالہ میں مولانا کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول : اس باب میں بیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، ثقافتی و ادبی احوال کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں کیا عوامل کار فرما رہے ہیں اور انہوں نے کن حالات میں پرورش پائی ہے، آگے چل کر ان حالات نے آپ کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں کیا رول ادا کیا ہے۔

باب دوم : اس باب میں مولانا کی احوال زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اس ضمن میں آپ کے خاندان، ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت، دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کا عبوری دور، ملی و اجتماعی سرگرمیاں اور وفات تدفین کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم : اس باب میں دارالعلوم دیوبند اور وہاں پر آپ کی تدریسی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ آپ کی دارالعلوم میں سرگرمیوں اور جن مواقع پر آپ نے قائدانہ رول ادا کیا ہے بالتفصیل بیان کیا گیا ہے، خاص طور سے اجلاس صد سالہ اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم : یہ اور اس کے بعد والا باب اس تحقیقی مقالہ کا خاص اور اصل حصہ ہے، اس باب میں ان ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا تعلق درس و تدریس سے نہیں تھا بلکہ آپ نے عربی زبان و ادب کو فروغ دینے اور طلبہ میں عربی تکلم کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے جو انجمن اور ادارے قائم کئے تھے، اسی کے تحت آپ کی صحافتی خدمات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

باب پنجم : اس باب میں مولانا کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے، نیز علماء معاصرین کے مابین آپ کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ساتھ آپ کے دارالعلوم میں کیا کیا اثرات باقی ہیں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اس موضوع سے متعلق تمام مواد تک رسائی حاصل کر سکوں لیکن باوجود ہزار ہا کوشش کے بعض مراجع تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا، اگرچہ اس موضوع پر تحریری مواد تو بہت ہی کم دستیاب ہوا البتہ آپ کے شاگرد اور معاصرین نے زبانی رہنمائی کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے، مجھ پر ان لوگوں کا احسان ہے، میں ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

چنانچہ زیر نظر مقالہ میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ مولانا اور ان کی علمی خدمات کا کوئی پہلو باقی نہ رہ جائے، خصوصاً ان کی عربی زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں میری یہ کاوش رہی کہ جو وسائل میسر آسکیں ان سے استفادہ کیا جائے، بہر کیف ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے یہ مقالہ پیش کر رہا ہوں، اس



مقالہ کی کوتاہیوں اور خامیوں کا مجھے پورا پورا احساس ہے، اپنی بساط کے مطابق مقالہ کو خوب سے خوب تر بنانے کیلئے متعدد کتب خانوں اور اہل علم و دانشوروں سے رابطہ قائم کیا جو اس مقالہ کیلئے اہم ماخذ ہے مولانا کی جائے پیدائش اگرچہ کیرانہ ہے لیکن آپ کی شخصیت کی نشوونما دیوبند میں ہوئی اور آپ کا تعلق دیوبند سے ہی زیادہ رہا اس لئے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اور اہل دارالعلوم دیوبند نے اس مقالہ کی تکمیل میں جو تعاون دیا ہے ان کے شکریہ کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

من لم يشكر الناس لم يشكر الله کے تحت ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فریضہ ہے جنہوں نے میری علمی معاونت فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

سب سے پہلے میں ار مغان تشکر استاد محترم پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی صاحب کی جناب میں ہدیہ شکر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس اہم موضوع پر اپنی زیر نگرانی کام کرنے کیلئے میری ہمت افزائی کی، اگر قدم قدم پر ان کی نظر عنایت نہ ہوتی تو شاید میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ کر سکتا۔ استاذ مکرم جناب پروفیسر عبدالباری صاحب صدر شعبہ عربی کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اس عنوان پر کام کرنے کی اجازت مرحمت فرما کر میری دیرینہ خواہش کی تکمیل فرمائی۔

اہل دارالعلوم دیوبند کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے دقت طلب مسائل و مباحث کو بڑی آسانی سے حقائق کی روشنی میں میرے سامنے بیان کر دیا۔ خاص طور پر مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا نور عالم خلیل امینی، مولوی خضر محمد صاحب، منشی محمد طالب صاحب اور مولوی عبدالجبار صاحب ان تمام حضرات نے جس قدر خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

نیز مولانا کے اعزاء جن کا بارِ احسان میری گردن پر ہے اور جن کی عنایت و لطافت کو شاید زندگی بھر نہ بھلا سکوں، انہوں نے میری قدم قدم پر رہنمائی کیں خاص طور پر مولانا عمید الزماں صاحب اور بدر الزماں صاحب نے جو معاونت فرمائی اس کی مثال ملنا مشکل ہے ان کے علاوہ دوسرے اہل خانہ نے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا تعاون فرمایا، میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

علاوہ ازیں مولانا منزل الحق الحسینی، آفس سیکریٹری تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہے اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید بہت سی چیزیں پردہ خفاء میں ہی رہتی، میں ان کا بیحد ممنون ہوں، علاوہ ازیں دفتر تنظیم ابناء قدیم کے ملازمین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے پورا پورا تعاون دیا۔ نیز مولانا کے رفیق محترم جناب پروفیسر بدرالدین الحافظ کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مقالہ کی تیاری میں مفید مشوروں سے نوازا۔ مولانا آزاد لائبریری، شعبہ عربی لائبریری اور شعبہ عربی کے آفس کے لوگوں کا بیحد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہر وقت مجھے مکمل تعاون دیا۔

اپنے رفقاء و احباب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا، خصوصاً ڈاکٹر راشد علی، ڈاکٹر عبدالجبار، مولوی عبدالقدوس نیرانوی، محمد محترم، محمد نعمان، محمد احتشام، محمد مزل، عبدالمتعم محمد امجد، محمد جاوید، محمد سلطان صاحبان محمد سلمان نبیل احمد محترمہ شمیم اعجاز اور محترمہ عائشہ رنیب خاں، عمارہ بانوں اور نرگس عمران وغیرہا۔

نیز اپنی بڑی ہمشیرہ اور بہنوئی جن کے سایہ عاطفت نے کبھی بھی میرے دل میں والدین کے فراق کا احساس تک نہ ہونے دیا اور انہوں نے ہر لمحہ اور قدم قدم پر میری ہمت افزائی کی انکا بیحد ممنون ہوں۔

آخر میں اپنے اہل خانہ خصوصاً دادا محترم والدین صاحبان کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میرے اندر حوصلہ پیدا کیا کہ جس قابل بھی ہوں وہ سب میرے والدین اور اہل خانہ ہی کی بدولت ہے۔

آپ کی خدمت میں چونکہ میری یہ حقیر کاوش پیش ہے حتی الامکان اسے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے تاہم اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی طالب علمانہ کاوش کو پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے۔

قمر الزماں

# باب اول

هندوستان بیسویں صدی میں

سیاسی احوال

مذہبی و سماجی احوال

عربی زبان و ادب

## سیاسی احوال

انسانی شخصیت مختلف عوامل و موثرات سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ عوامل منفی اور واضح خارجی اور داخلی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کسی اعلیٰ فن کار کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد اور ماحول کی معرفت لازمی ہے۔ جس کے موثرات کے نقوش شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے فن پر مرتسم نظر آتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر ادیب و شاعر عام فطرت انسانی کے مطابق اپنے زمانہ کے متنوع سیاسی، سماجی اور تہذیبی میلانات سے ضرور متاثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات ماحول کے خارجی موثرات کا عکس فن کے بین السطور اتنا صاف جھلکتا ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر اس ادیب یا شاعر کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جس طرح فن میں شخصیت اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے اسی طرح شخصیت پر عہد اور ماحول کے مخصوص کوائف کا عکس بھی نہایت گہرا ہوتا ہے۔

تاریخ ہند کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان ہندوستان میں تاریخ کے جس دور میں آئے اس وقت یہاں کا ماحول اور حالات آج سے زیادہ امید افزا نہیں تھے، لیکن وہ حالات اور ماحول کی شکایت میں نہیں لگ گئے بلکہ عزم و ہمت کو ہمرکاب بنا کر انھوں نے حالات کو سازگار بنایا، اپنی عظمت و شرافت، اصول پرستی، عدل و مساوات اور انسانیت نوازی کے کارناموں سے یہاں کے لوگوں کو روشناس کرایا، اپنے بلند اخلاق و رواداری کے مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر کے اہل ہند کو اتنا متاثر کیا کہ ہندوستان کی سرزمین نے ان کے لیے اپنی آغوشِ محبت کھول دی اور ان کو عزت و احترام کے بلند مقام پر بٹھایا، تاریخ کی ایک لمبی مسافت ہے جو مسلمانوں نے اس سرزمین میں عظمت و سر بلندی کے لہراتے ہوئے پرچم کے سایہ میں طے کی ہے۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ اس پروقار سفر کی آخری سرحد ثابت ہوئی اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر پوری قوم خون کے دریا میں ڈوب گئی اور اس سے نکلنے کے لیے کوئی چھلانگ کامیاب نہ ہو سکی، انحطاط و زوالِ سلطنت کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی تباہی و بربادی بھی جاری رہی، وہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں پست ہوتے چلے گئے اور سیاسی طور پر تو ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی، اگرچہ ملک کی عام تباہی کا اثر ہندو اور مسلمان دونوں پر تھا لیکن ہندوؤں کے نقصان کی تلافی کچھ نہ کچھ ہو جایا کرتی تھی، لیکن مسلمانوں کا نقصان کسی صورت میں بھی مرہونِ تلافی نہ ہو سکا۔ بہر حال ان تمام اسباب سے جو مسلمانوں کی تباہی کے لیے فراہم کئے

گئے تھے سخت ترین نتائج نکلے اور ایک قلیل وقفہ میں ایک بڑی قوم تباہ ہو گئی۔ (۱)

۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ غلام ہندوستان کا بدترین دور تھا، انگریزوں کی وحشت و بربریت پورے شباب پر تھی اور ان کا دماغ اس ملک پر قابو پانے کے بعد آسمان پر تھا، برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے نئی نئی اسکیم اور نئے نئے منصوبے تیار کیے جا رہے تھے، عام لوگوں کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ انہیں خوف و ہراس میں مبتلا رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے، مزید ستم یہ کہ انہوں نے مشق ستم کے لیے مسلمانوں کو چھانٹ رکھا تھا اور پورے اس دور میں کون سا زہریلا تیر ہے جو ان پر نہیں چلایا گیا؟ کون سی عبرتناک سزا ہے جو ان کو نہیں دی گئی؟ بقول سر سید احمد خاں:

”کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو گو وہ رام دین اور ماتا دین نے ہی کی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جو اس نے پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو، کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانہ میں نہیں اگا جس کی نسبت مسلمانوں کی طرف نہ کی گئی ہو اور کوئی آتشیں بولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ وہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔“ (۲)

لیکن بیسویں صدی نے مسلمانوں کے انحطاط کے رخ کو بدلنے میں بھرپور مدد کی، علم کی اہمیت، قرآن و حدیث کی عظمت، بدعات و منکرات کی مخالفت، مذہبی اصلاحات اور ادبی سلیقہ مندی نہ صرف امراء بلکہ عوام الناس میں رائج ہو گئی۔ وہ قوم جو زوال کی طرف بہت سرعت سے بڑھتی چلی جا رہی تھی اس کی رفتار نہ صرف سست پڑ گئی بلکہ اس میں اپنے منصب عالی کا احساس بھی بیدار ہونا شروع ہو گیا، ۱۸۵۷ء کے خونیں اور ہمت شکن حالات نے قوم کو اضمحلال کا شکار اور دل برداشتہ کر دیا تھا۔ کافی کوششوں کے نتیجے میں دیرینہ شکستگی کے آثار ختم ہونے شروع ہو گئے، جہالت اور علم و فن کی جس پیچاری میں امت مبتلا ہو گئی تھی اب سنبھال لے کر بیدار ہونے لگی۔ علم کے چراغ جو مصلحین امت نے بڑے غور و فکر اور تدبیر سے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں روشن کئے تھے اب اتنی روشنی دینے لگے تھے کہ ان کی اہمیت کا احساس عالمگیر ہوتا جا رہا تھا، سیاسی بیداری کی مہر کے ساتھ آزادی کے ہر طرف چرچے ہونے لگے اور کئی سستوں سے کام شروع ہوا اور آئینی جنگ کے کچھ نئے راستے بھی سامنے آئے۔ (۳)

۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کی تجویز اہل بنگال کے سامنے رکھی گئی جس میں انگریزوں نے دورخی پالیسی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے تحریک آزادی اور مسلمان، مولانا اسیر اردوی ص ۲۲ دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء۔

۲- اسباب بغاوت ہند، مقدمہ فوق کریبی ص ۴۷ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۷۱ء۔

۳- تفصیل کے لیے دیکھئے، تاریخ جمعیۃ علماء ہند، مولانا اسیر اردوی ص ۵۰۔



اپنائی مسلمانوں کو یہ کہہ کر بہکایا گیا کہ تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر ہو رہا ہے کیونکہ ایک حصہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مکمل طور پر مسلمانوں کے کنٹرول میں ہوگا، مسلمانوں کو ہر قسم کی آزادی اور سیاسی بالادستی ہوگی، ہندو زمینداروں کی غلامی سے نجات ملے گی، اس طرح کے شوشے چھوڑ کر مسلمانوں کو خوش کر دیا، لیکن دوسری طرف ہندوؤں کو اس کی مخالفت کے لئے اکسایا گیا اور حکومت نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ یہ افواہ پھیلا دی کہ تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفاد اور ان کے دباؤ میں کیا جا رہا ہے جس کا سیدھا نقصان بنگال کے ہندوؤں کو ہوگا، چنانچہ جب یہ حالات پیدا ہوئے تو ہندوؤں نے اس کی مخالفت شروع کر دی جس میں بنگال کی کانگریس پارٹی بھی ہندوؤں کے شانہ بشانہ تھی ان واقعات کے ظہور کے بعد فریقین میں ایک دوسرے سے بدگمانی پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ کھلم کھلا ایک دوسرے کی مخالفت شروع ہو گئی۔ (۱)

اسی دوران مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مسلمانوں کو حکومت کے تئیں وفادار بنانا اور انگریزی حکومت کی ترجمانی کرنا تھا۔ اس لئے لیگ نے لڑائی کا رخ انگریزوں کے بجائے دوسری تنظیموں کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح یہ تنظیمیں آپس میں ہی الجھ کر رہ گئیں، ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی کے اعلان کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور آپس میں نفرت کی ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ جو آج تک دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ (۲)

۱۹۱۲ء تک مسلم لیگ نے سیاست میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوئی جس نے عالم اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات بھی مشتعل کر دیئے۔ اب مسلمان قومی و بین الاقوامی سیاست میں شعوری طور پر آگے بڑھے۔ ترکی کی امداد میں اپنی سخاوت و مروت، جوش و حمیت اور ہمدردی کا ثبوت دیا۔ عملی طور پر جو کچھ ممکن تھا کر گزرے، یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمان صحافت کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی اخبارات مطلع صحافت پر نمودار ہوئے، جنہوں نے عوام کی سیاسی بیداری خاص طور پر مسلمانوں کی بیداری میں کافی اہم رول ادا کیا۔ (۳)

۱۹۱۴ء میں ترکی کا جرمنی سے اتحاد کرنا تھا کہ روس، فرانس اور برطانیہ نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا بقول جواہر لال نہرو ”ترکی کی ہمدردی نے عام مسلمانوں کو حکومت کے خلاف کھڑا کر دیا، مسلمانوں نے چندے جمع کئے اور ان کے لیڈروں کو اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرائی۔ (۴)

اسی زمانہ میں جب کہ پہلی جنگ عظیم پورے شباب پر تھی اور حکومت برطانیہ کی تمام تر توجہ اسی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”سیاست ملیہ“ محمد امین زیری ص ۸۷، ۸۸، ۹۰۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”تاریخ مسلم لیگ“ مرزا اختر حسن ص ۳۶۔

۳- تفصیل کے لیے دیکھئے، ماہنامہ گنگن (ہندوستانی مسلمان نمبر) ۱۹۷۵ء بمبئی ص ۳۳۳۔

۴- تفصیل کے لیے دیکھئے ”تاریخ تحریک آزادی“ تارا چند، ج ۳ ص ۲۸۲۔

جنگ پر مرکوز تھی کچھ ہندوستانی لیڈران (جن کی قیادت ڈاکٹر بھوپالی کر رہے تھے) نے اندرونی جنگ کا نقشہ مرتب کیا اور جرمنی کے فوجی افسران کے ساتھ مل کر افغانستان کے آزاد قبائل کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے لگے تاکہ حکومت برطانیہ کا دو طرفہ جنگ سے نبرد آزما ہونا مشکل ہو جائے لیکن یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ انگریزوں نے کچھ نیم ملاؤں کے ذریعہ یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ بغیر امیر کی اجازت کے جہاد جائز نہیں ہے۔ اسی طرح کی اسکیم شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بھی تیار کی تھی اور باقاعدہ جنگ کا نقشہ تیار کر کے ایک شاگرد خاص کو سپرد کیا اور خود امیر ترکی سے فتویٰ حاصل کرنے چلے گئے لیکن اچانک حجاز میں بغاوت برپا ہونے کی وجہ سے آپ کو وہیں پر ایک سازش کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور سارا منصوبہ عمل درآمد سے قبل ہی ناکام ہو گیا۔ (۱)

۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت قائم ہوئی جس کا مقصد امت مسلمہ کو یکجا کرنا اور خلافت کے خاتمہ کی ناپاک کوششوں کو روکنا تھا اس کے روح رواں ممبر محمد علی و شوکت علی جوہر (علی برادران) تھے اگرچہ یہ تحریک وقتی ثابت ہوئی لیکن اس نے جو سیاسی شعور اور عوامی بیداری کیلبر پیدا کی اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آئی۔<sup>۲</sup> اسی تحریک کے بانی نے پہلی بار لندن کی گول میز کانفرنس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جس کے الفاظ یہ تھے :

”میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے اس وقت لوٹوں گا

جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا پروانہ ہوگا اور اگر تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میرے لئے اسی سر زمین میں ایک قبر کی جگہ تو دینی ہوگی“ (۳)

بہر حال آزادی کا پروانہ تو مل نہ سکا البتہ آپ کی دوسری خواہش پوری کر دی گئی اور آپ کو ایک قبر کی جگہ ضرور مل گئی، اسی تحریک کے پلیٹ فارم سے جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا جس کی بناء فرنگی محل کے مولانا عبدالباری، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے ہاتھوں عمل میں آئی، جس کا مقصد مسلمانوں کی ہر طرح سے رہنمائی کرنا اور ملک کی آزادی کے لئے دوسری تنظیموں کے شانہ بشانہ تحریک چلانا تھا۔ یہ تنظیم مسلمانوں میں کافی موثر ثابت ہوئی اور اس تنظیم کی ہر آواز کی مسلمانوں میں تائید کی گئی، یہاں تک کہ تحریک عدم تعاون کا بل جب خلافت کمیٹی نے پاس کیا تو جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اس پر فتوے کی مہر ثبت کر دی، تمام مسلمانوں نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے اس میں مکمل تعاون دیا۔ اس فتوے کے نتیجے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کو گرفتار کر کے ان

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”فکر و نظر“ تحریک آزادی نمبر علی گڑھ ۱۹۵۸ء ڈاکٹر صلاح الدین عمری ص نمبر ۲۱۷-۲۲۳۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”تاریخ تحریک آزادی ہند“ تارا چند ص ۷۰۰۔

۳- ”تحریک آزادی اور مسلمان“ مولانا اسیر ادروی ص ۱۹۵۔

پر مقدمہ چلایا گیا۔<sup>۱</sup> دورانِ مقدمہ آپ نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے صاف لفظوں میں لکھا :

”اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی کو سلب کرنا چاہتی ہے تو صاف صاف اعلان کر دے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس پر غور کر لیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا۔ اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کر لیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیے، کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی، اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے ہندوستان بھیجے گئے ہیں کہ قرآن مجید کو جلادیں اور حدیثوں کو مٹادیں اور فقہ کی کتابوں کو تباہ و برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا“ (۲)

خلافتِ تحریک اور جمعیتِ علماء ہند کے رہنماؤں کے دلیرانہ اقدامات و بیانات نے پورے ملک میں گرمی پیدا کر دی اور سیاسی کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہر طبقہ کے لوگوں نے بڑی ذہنی اذیت کے ساتھ یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ہماری قومی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی تباہیوں کا واحد سبب صرف برطانوی حکومت ہے اس لئے قدرتی طور پر ملک کے ہر طبقہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت و غصہ کا جذبہ بھڑک اٹھا جس طبقہ کو جب بھی اور جہاں بھی موقع ملا اس نے انگریزی حکومت کے خلاف اپنی شدید نفرت و غصہ کا اظہار کیا۔ (۳)

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مسلم اتحاد عروج پر تھا دونوں قومیں انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ کھڑی تھیں۔ دونوں کا مقصد غیر ملکیوں کے پنجے سے نجات حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ اتحاد انگریزوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس لئے انھوں نے دونوں قوموں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ افواہیں پھیلا کر شروع کر دی کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے اور مسلم قوم باہر سے آئی ہوئی ہے علاوہ ازیں انھوں نے ہندو مذہب کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ بہت سے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنالیا ہے۔ یہاں کے مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا ہے اور اس کی شہادت کے لئے ”بابری مسجد“ کی من گھڑت تاریخ بھی لکھ ڈالی کہ یہ مسجد واقعتاً ایک مندر تھا جہاں ہندوؤں کے اوتار ”رام“ پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں عوام میں پھیلائی گئیں جس کے باعث ہندوؤں میں نفرت کی لہر پیدا ہو گئی اور یہیں سے ”شدھی سنگٹھن“ جیسی تحریک کی بنیاد پڑی اور ایک طرح سے یہی ”آر، ایس، ایس“ کی بھی بنیاد تھی اس کے بانی سوامی شر دھانند تھے۔ اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بھی کئی تنظیمیں بنا ڈالی، لہذا آج ہندوستان میں جو

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”فکر و نظر“ تحریکِ آزادی نمبر ۱۹۸۵ء (جمعیتِ علماء ہند ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری)

ص ۱۰۶ - ۱۰۸

۲- ”تحریکِ آزادی اور مسلمان“ مولانا اسیر ادروی ص ۱۹۹

۳- تفصیل کے لیے دیکھئے ”تاریخِ جمعیتِ علماء ہند“ مولانا اسیر ادروی ص ۲۴ - ۶۰

فرقہ پرستی اور نفرت کا زہر پھیلا ہوا ہے اسکی بنیاد بھی یہیں سے شروع ہوئی۔ (۱)

علاوہ ازیں حکومت برطانیہ نے دونوں قوموں کے رہنماؤں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے لئے کمیونل ادارہ کا قانون بنایا اور مذہب کی بنیاد پر ووٹوں کو تقسیم کر دیا جس کی رو سے مسلمان صرف مسلمانوں کے ووٹوں کے مستحق قرار دئے گئے اور ہندو ممبر غیر مسلموں کے ووٹوں کے مستحق قرار پائے۔ اس طرح ہندوستان میں دو قوموں کا تصور پیدا ہوا اور ایک قوم کو دوسری قوم کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ بہر حال اس طریقہ انتخاب کے نتیجہ میں پہلے ایک دوسرے سے بیگانگی پیدا ہوئی اور اسی بیگانگی نے بالآخر منافرت کی شکل اختیار کر لی جس کا خمیازہ بالخصوص غریب مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

۱۹۳۲ء کے انتخاب میں مسلم لیگ اور کانگریس نے ایک ساتھ مل کر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا، دونوں پارٹیوں نے یوپی میں سب سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا کانگریس نے صرف ۹ مسلم ممبر ہی کھڑے کئے باقی سیٹیں مسلم لیگ کے لئے چھوڑ دیں۔ لیگ کے ۲۷ ممبر کامیاب ہوئے لیکن کانگریس کا کوئی مسلم ممبر کامیاب نہ ہو سکا صرف ایک ضمنی انتخاب میں کانگریس کا بھی ایک مسلم ممبر کامیاب ہو پایا۔ چونکہ دوسرے صوبوں کی طرح کانگریس کو یوپی میں بھی اکثریت حاصل ہو گئی تھی اس لئے اسے ہی حکومت سازی کی دعوت دی گئی۔ اس نے چھ لوگوں کو کابینہ میں لینے کا فیصلہ کیا جس میں دو مسلم اور چار ہندو۔ ان دونوں مسلم ممبران میں ایک لیگ کا اور ایک قوم پرور کا تھا۔ جب کہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی تھی جو کانگریس اور لیگ کے درمیان انتخاب سے قبل ہوا تھا کہ کابینہ میں دونوں ممبر مسلم لیگ کے ہوں گے۔ کانگریس کے اس فیصلہ سے لیگ کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے کابینہ میں شرکت سے قطعاً انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کو یہ محسوس ہوا کہ کانگریس نے جیت کے نشے میں نہ صرف اس سے بد عہدی کی ہے بلکہ اس کو ذلیل بھی کیا ہے لہذا دونوں پارٹیوں میں مخالفت کا دور شروع ہو گیا اور یہی اختلاف ملک کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ (۲)

یوپی کانگریس نے اس موقع پر دو افسوسناک غلطیاں کیں ایک یہ کہ لیگ سے بد معاملگی کر کے اپنی اخلاقی پوزیشن کو کمزور کر لیا دوسرے اس نے لیگ کی موجودہ طاقت کا اندازہ اس کی سچھلی تاریخ کی اصلیت سے بہت کم لگایا اور اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ اب لیگ ایک عوامی جماعت بن گئی ہے۔ اس بد معاملگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مسلمانوں میں بد دلی پھیل گئی اور اس سے بھی بڑا یہ ہوا کہ لیگ جو اب تک قومی اتحاد کی حامی تھی اب اس کی طرف سے قطعاً مایوس ہو گئی لہذا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لیگ کے اجلاس لاہور میں پاکستان کا رزلوشن پاس کر دیا گیا۔ (۳)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں عروج و زوال“ رفیق زکریا ص ۳۸۱-۳۸۵۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ طفیل احمد منگلوری ص ۴۱۔

۳- تفصیل کے لیے دیکھئے ”سیاست ملیہ محمد امین زبیری ص ۴۲۱-۴۳۰۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جب ہندوستان کے الیکشن ہوئے تو تقریباً ۷۵ فیصد مسلمانوں نے لیگ کے حق میں ووٹ دیا جس سے واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے لہذا اس بار زیادہ واضح اور پُر زور طور پر پاکستان کا مطالبہ کیا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد انگلستان کے نئے انتخاب میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور اس نے ہندوستان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک ڈیلی گیشن بھیجا، ڈیلی گیشن کی کورپورٹ کے بعد وزیراعظم نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کو کامل آزادی دی جائے گی اور ایک کمیٹی مشن آئینی مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ اس نے کانگریس اور لیگ دونوں کے مطالبات پر غور کیا۔ لیگ نے اس وقت پاکستان کے مطالبہ کو پس پشت ڈال ایک ایسے وفاق کا نقشہ پیش کیا جس میں مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک گروپ بنایا جائے اور باقی صوبوں کا دوسرا گروپ اور دونوں کی آئین ساز مجلسیں بھی الگ الگ ہوں لیکن دونوں گروپ کا بینہ اور مجلس ساز نمائندگی میں برابر کے شریک ہوں اور ہر صوبہ کو رائے عامہ کے استصواب کے بعد گروپ سے اور دس سال بعد یونین سے علیحدگی کا اختیار حاصل ہو۔ کانگریس نے اس پالیسی کی مخالفت کی اور اس نے تجویز پیش کی کہ آئین ساز مجلس ایک ہو اور اس میں بھی دفاع، رسل رسائل، سکے، کسٹم اور امور خارجہ یونین حکومت کے اختیار میں ہوں۔ البتہ باقی معاملات میں صوبے اپنا ایک گروپ بنانا چاہیں تو ان کو بھی اختیار ہے، اس تجویز کی کمیٹی مشن نے بھی تائید کی، بہر حال پھر بھی کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور کمیٹی مشن واپس چلا گیا۔

کمیٹی مشن کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں عبوری حکومت قائم کر دی اور اس میں مسلم لیگ کو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا گیا۔ لہذا لیگ پھر اپنے پرانے مطالبہ (پاکستان) پر واپس آگئی اس بار کانگریس نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ آئندہ ان حالات میں ہندوستان کا چلنا مشکل ہے اس لئے پاکستان کے مطالبہ کی تجویز منظور کر لی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نگرانی میں اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اور لوگوں کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ جو یہاں رہنا چاہتے ہیں وہ رہ سکتے ہیں اور جو یہاں آنا چاہتے ہیں وہ بھی آ سکتے ہیں۔ (۱)

تقسیم ہند کے بعد بہ ظاہر مسلمانوں پر جو مصیبت گزری تھی وہ تبادلہ آبادی کے دوران دہلی، پنجاب اور ایک حد تک بنگال میں محدود رہی اور اسکے بدلے میں انہیں ہندوستان اور پاکستان میں آزادی کی دولت ملی جس کے لیے وہ سو سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء سے کہیں زیادہ مصیبت و ابتلاء کا سامنا ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد چند سالوں میں کرنا پڑا اور ایک حد تک آج بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی اذیت جس نے شاید ان کے دلوں کو خود اپنے عزیزوں کے لئے اور مارے جانے نے نہیں پہنچائی تھی۔ وہ یہ کہ پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی



آنکھوں میں نفرت اور انتقام کے شعلے اور پرانے غیر مسلم ہمسایوں کی نظروں میں ملامت اور شبہ کی چنگاریاں ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتی تھی۔ ایک طرف یہ صدمہ کہ دوسروں کے فعل کا ذمہ دار خواہ مخواہ ان کو ٹھہرایا جاتا ہے، دوسری طرف اس تلخ حقیقت کا احساس کہ اس دارمکافات میں انسان کو اپنے بھائیوں کے کرتوت کی سزا بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ (۱)

بہر حال تقسیم کی یکطرفہ ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انہیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا، پورے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے بعض حصوں میں زبردست ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے، شمالی ہند میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے صاحب حیثیت اور پڑھے لکھے طبقے نے پاکستان کی طرف ہجرت اختیار کر لی۔ اور درمیانی طبقے کے لوگ خوف و ہراس کے سایہ میں زندگی بسر کرنے لگے۔ ممکن ہے مرورِ ایام کے باعث ان کے زخم مندمل ہو جاتے اور حالات و واقعات پر وہ مایوسی کے بجائے پر امید نقطہ نظر سے غور کر سکتے لیکن بد قسمتی سے ان فسادات کے بعد بھی فسادات کا سلسلہ کلیہً منقطع نہیں ہوتا تھا جب تک کہ بہت سے مسلمان مع مال و اسباب کے اس کی بھیٹ نہ چڑھ جاتے، ایسے حالات میں یہاں کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل سے بھی کوئی خیر کی توقع نہیں تھی۔ اور بہت سے لوگ تو اس قدر رنجیدہ اور خوف زدہ تھے کہ ان کا اعتماد نہ صرف اپنے مستقبل کی طرف سے اٹھتا جا رہا تھا بلکہ وہ بحیثیت مجموعی انسانیت کے مستقبل سے بھی مایوس ہو چکے تھے اور ایک شاعر کے بقول:

الظلم من شیم النفوس فان تجد..... ذاعفہ فلعتہ لا یظلم

کے قائل ہو گئے تھے۔

ایک طرف یہ پریشانیاں تھیں تو دوسری طرف ان سے بھی زیادہ شدید پریشانی ان کو یہ درپیش تھی (اور آج بھی ہیں) کہ مسلمان چاہے ایمان و اسلام سے واقف ہو یا نہ ہو لیکن اسلام کے ساتھ بالکل غیر شعوری طریقہ سے ایک والہانہ محبت و عقیدت کا جذبہ ہمیشہ اس کے دل میں موجزن رہتا ہے لیکن ہم وطنوں کی جانب سے اس جذبہ کو قصد اوبلا یا بلا قصد طرح طرح سے مجروح کیا جاتا، ملک کے بڑے بڑے لیڈران اور ہندو تنظیمیں علانیہ کہتے پھرتے کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہو یہاں تک کہ اسکولوں کے نصاب کی کتابوں میں بھی مسلم عقیدہ کے خلاف بہت سی باتیں شامل کر لی گئیں۔ اگر مسلمان اس پر احتجاج بھی کرتے تو ان کی کوئی سنوائی نہ ہوتی۔ (۲)

ان حالات میں بچی کچھی مسلم قیادت اور ان کی دینی و ملی تنظیموں کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی قوم کی ڈھارس بندھائیں اسے راہِ فرار اختیار کرنے سے روکیں، فسادات کے بھڑکتے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دعوت“ ہندوستانی مسلمان نمبر مارچ ۱۹۹۹ء ج ۲۷ شمارہ ۲۸ ص ۲۳-۲۴

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں“ سید عابد حسین ص ۲۰۰۔

ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کریں اور فسادات و دیگر آفات و مصائب میں گھرے مسلمانوں کے لئے ریلیف و باز آباد کاری کا کام انجام دیں۔ نیز دستور میں دی گئی آزادی کو سلب ہونے سے روکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان غیر معمولی کوششوں نے مسلمانوں کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جما دیا البتہ مسلم قیادت کی اقدامی و تعمیری سرگرمیاں اس سے بہت متاثر ہوئیں اور تمام تر توجہ مسلمانوں کے تحفظ اور دفاع پر لگا دینی پڑی، جس کے سبب مسلمان ہر میدان میں پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

بہر حال تقسیم کے بعد مسلمانوں کا اس حالت کو پہنچ جانا یقیناً تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے اور اس سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ان کا ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ ان کے مستقبل کے لئے نہایت ہی برا شگن ہے۔ افراد ہوں یا اقوام کوئی بھی مایوسی میں مبتلا ہو کر اپنی زندگیوں کو زیادہ دنوں تک بچا نہیں سکتا اور کم از کم باعزت زندگی کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا ہے۔ (۱)

## مذہبی و سماجی احوال

ہندوستان ہمیشہ مختلف تہذیبوں کا سنگم اور نوع بنوع مذاہب و ادیان کا گہوارہ رہا ہے کیونکہ یہاں دنیا کی مختلف اقوام کی آمد کا سلسلہ ہر عہد میں برابر جاری رہا اور مختلف رنگ و نسل، زبان و معاشرت، عقائد و نظریات اور معاشرت کی حامل یہ قومیں اپنے جلو میں اپنی مخصوص تہذیب کے جلوے ساتھ لائیں۔ مختلف تہذیبوں کا یہ حسین گلدستہ صدیوں سے سدابہار رہا ہے اور اس کے باعث ہندوستان میں ایک مشترکہ سماجی تہذیب کا ارتقاء ہوا لیکن انگریز حکومت نے جہاں زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا وہیں ہندوستان کے معاشرتی سمندر کی پر سکون سطح میں بھی ارتعاش پیدا کیا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں صرف سیاسی تسلط کی بنیادیں استوار نہیں کیں بلکہ اپنے مذہب و زبان اور تعلیم و تہذیب کے فروغ کی بھی حیرت انگیز کوششیں کیں۔ قانون فطرت کے مطابق مفتوح اقوام فاتح قوموں کی ذہنی غلامی میں اسیر ہو جاتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں مغربی تہذیب اور عیسائیت کے فروغ کی ایک برقی لہر چل پڑی، جس سے خاص طور پر یہاں کی نوجوان نسل بہت متاثر ہوئی اور اس کے نتیجے میں سماج سدھار اور مذہب محافظ تحریکوں کا آغاز ہوا۔

ہندوؤں میں سماج و تہذیبی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں جن میں سب سے قابل ذکر برہمو سماج کی تحریک ہے جسے راجہ رام موہن رائے نے قائم کیا تھا۔ اس نے مذہبی اور سماجی دونوں طرح کی اصلاحیں کیں وہ خود وحدت کے قائل تھے اور مورتی پوجا کو ہندوؤں کے مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی مساعی کے نتیجے میں بالخصوص عورتوں کی پس پست خستہ حالت میں بہت سدھار ہوا اور ان کے بہت سے حقوق بحال ہوئے۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دعوت“ ہندوستانی مسلمان نمبر مارچ ۱۹۹۹ء ج ۴۷ شمارہ ۲۸ ص ۳۵

مثلاً سستی پر تھا تعداد ازواج اور کم عمر کی شادی کا خاتمہ ہوا۔ بیوہ کو نکاح ثانی کا حق ملا اور عورتوں کی تعلیم کا رجحان عام ہوا۔ (۱)

ہندوؤں کی اپنے مذہب و سماجی تحفظ و اصلاح کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بھی اصلاحی تحریکیں برابر سرگرم عمل رہی۔ اور دین و عقیدہ کی حفاظت و اسلامی معاشرہ کی اصلاح کیلئے نمایاں کردار ادا کیا۔ انگریزی حکومت کے قیام و استحکام اور نئے حکمرانوں کے بغض و عناد اور بدگمانی کے باعث مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں مبتلا تھے ان کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا۔ معاشی و قارگر گیا تھا۔ اقتصادی حالت بدتر ہو گئی تھی۔ دینی عقائد و نظریات بگڑ گئے تھے یہاں تک کہ اپنی معاشرتی زبان سے محروم کر دیے گئے تھے۔ پوری قوم دفعۃً پستی و اضمحلال اور کمپرسی کی آخری سرحد تک پہنچ گئی تھی انگریزی تعلیم کی جانب مسلمان بالکل مائل نہ تھے اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ انگریزوں کے وحشیانہ اور بے رحمانہ سلوک ان کے پیش نظر تھے بلکہ ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ملک بھر میں کوئی تعلیم گاہ ایسی نہیں تھی کہ جہاں وہ اپنے قدیم قومی تمدن اور معاشرت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی حاصل کر سکتے اسکول و کالج جو تھے وہ پادریوں کے قائم کئے ہوئے تھے اور وہاں کے اساتذہ یا تو انگریز تھے یا ہندو۔ ان کالجوں میں تعلیم کم عیسائیت کی تبلیغ زیادہ ہوتی تھی۔ قومی زوال اور مصائب کے ایسے نازک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسید احمد خاں جیسے عظیم مصلح اور رہنما مل گئے انھوں نے اپنی منظم اصلاحی سرگرمیوں سے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچالیا آپ نے کچھ سوسائٹیاں قائم کیں اس کے علاوہ سماج میں پھیلی برائیوں کو ختم کرنے اور قومی بیداری لانے کے لئے ”تہذیب الاخلاق“ نامی رسالہ جاری کیا۔

مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح و درستگی کے لئے سرسید احمد خاں کی کوششوں نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی جو تاریخ میں ”علی گڑھ تحریک“ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ (۲)

اجتماعی جدوجہد کے سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کی مساعی بھی قابل ذکر ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر اس کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے ہیں، بدعات و رسوم کی اصلاح، عقائد کی درستگی، تبلیغ دین، فرق ضالہ سے مناظرہ وغیرہ۔ اسی طرح نکاح بیوگان اور عورت کے حق وراثت کے بارے میں دیوبند نے مثبت اصلاحی کام سرانجام دئے۔ دینی امور میں لوگوں کی رہنمائی کے لئے دارالافتاء قائم کیا جس نے ملک و بیرون ملک مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ دیوبند کے اساتذہ نے عیسائی مشنریوں اور ہندوؤں کے آچاریہ سماجیوں کے فتنہ انگیزیوں کا جواب بھی دیا اور اس سلسلے میں بہت

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ہندوستانی سماجیات“ جعفر حسن ص ۱۲۵-۱۲۶۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم“ ڈاکٹر سلامت اللہ ص ۵۵۔

وقع لڑپچر تیار کیا گیا۔ قرآن پاک کے پیغام کو عام کرنے کے لئے مولانا محمود الحسن، اسیر مالٹا نے اردو ترجمہ کیا، جو قرآن کے مقبول ترین تراجم میں ہے۔ دیوبند کے ہی ایک فرزند مولانا عبدالحقؒ نے ”تفسیر حقانی“ لکھی جس نے اپنے دور کی کلامی مباحث کو بڑی خوبی سے سمیٹ لیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، قاری محمد طیب صاحب اور بعد کے لوگوں میں مولانا وحید الزماں وغیرہ نے علوم اسلامیہ کی ترویج اور سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دیں، ضمنیہ بھی ہے کہ ان کے لڑپچر نے خود اردو اور عربی کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ (۱)

## بیسویں صدی میں عربی زبان و ادب

انیسویں صدی میں سامراجیت نے دنیا کے مختلف ملکوں کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا ان سامراجی حکمرانوں کا سب سے پہلا قدم محکوم قوم کو جہالت و غربت میں مبتلا کرنا تھا، پوری سامراجیت نے محکوم ملکوں کے قدرتی و مادی وسائل پر قبضہ کیا وہاں کے مدارس اور اسکولوں کو بند کیا اور وہاں کے باشندوں کو محتاج بنادیا انھوں نے اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو عام کر نیکی ہر ممکن کوشش کی، اس کے لئے انھوں نے پورے ملک میں مشینریوں کا جال بچھادیا اور ایسے سرکاری ادارے قائم کئے جن میں تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے اپنے دین و مذہب سے بیگانہ ہو جائیں اور محض انکی مشین کے پرزے بن کر رہے سرسیدؒ جیسے سیکولر ذہن کے مالک انسان نے بھی اس نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا تھا:

”مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے

ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا ان کو غیرت نہیں آتی۔“ (۲)

بہر حال مسلمانوں نے انکے مذہب اور تہذیب کو آسانی سے قبول نہیں کیا اپنے تشخص اور انفرادیت کو باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ان کی اس سازش کا توڑ کرنے کے لئے مسلم علماء اور رہنماء کمر بستہ ہوئے اور ہر طرح سے ان کے حملوں کا دفاع کیا اس لئے وہ ان سامراجی طاقتوں کا نشانہ دیگر قوموں کی نسبت زیادہ بنے، علماء نے ایک طرف پادریوں سے مناظرہ کر کے انکا منہ توڑ جواب دیا اور دوسری جانب پورے ملک میں اپنے مدارس کا جال بچھادیا، ان مدارس کے قیام کا حقیقی مقصد اسلام کی نشر و اشاعت اور اسلامی تہذیب کا بقاء و تحفظ تھا۔

چنانچہ سامراجی طاقت بھی اس حقیقت سے واقف ہو گئی کہ جب تک مسلمانوں کا رشتہ مذہب اور اسلام سے منقطع نہ کر دیا جائے۔ انہیں عملی میدان سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا، چونکہ ہندوستان میں

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ رفیق منزل“ مسلم تعلیمی تحریکات شخصیات خصوصی نمبر - مئی و جون ۱۹۹۷ء، ص ۳۱

۲- ”اسباب بغاوت ہند“ مقدمہ فوق کری ص ۶۵

ہزاروں مدارس علوم شرقیہ اور علوم اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے تھے اوقاف انکی آمدنی کا واحد ذریعہ تھے انگریزوں نے اولاً اوقاف کے نظام کو کالعدم قرار دیا، رفتہ رفتہ یہ مدارس جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے محافظ اور عربی زبان و ادب کی ترقی کے ضامن تھے یکایک زمین بوس ہو گئے اس طرح عربی زبان کا علم حاصل کر خاصاً مشکل ہو گیا، لیکن سر سید کی علمی تحریک اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مذہبی تحریک نے ایک بار پھر مسلمانوں کے اندر مشرقی اور سائنسی علوم حاصل کر نیکا حوصلہ پیدا کیا اور آج ان بزرگوں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے نہ صرف اپنے مذہبی ورثے کی حفاظت کی بلکہ سائنسی علوم میں بھی مہارت پیدا کی! ہندوستان میں ایسے عربی ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا نہ صرف لوہا منوایا بلکہ عرب دنیا نے بھی انکے تحقیقی و تصنیفی کاموں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ”ہندوستانی مسلمان“ میں ان مصنفین کا تذکرہ جن کی شہرت ہندوستان کی حدود سے متجاوز ہو کر دوسرے ممالک میں پہنچ چکی ہے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ اس صدی کے عربی مصنفین کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ہندوستان نے اس صدی میں بھی بکثرت ایسے مصنفین پیدا کئے جو زود نویسی اور کثرت تصانیف میں پورے عالم اسلام سے بازی لے گئے۔ ان میں ہر شخص کی حیثیت ایک مستقل اکیڈمی اور سرگرم عمل انجمن کی تھی چنانچہ نواب صدیق حسن دہلوی بھوپال کی تصانیف کی تعداد دو سو بائیس ہیں جن میں ۵۶ کتابیں عربی زبان میں ہیں ان میں ”فتح البیان فی تفسیر القرآن“ (دس جلد) ابجد العلوم، التاج المکمل، البلغة فی اصول اللغة، العلم الخفاق من علم الاشتقاق قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تقریباً چھپائی کتابیں عربی زبان و ادب میں ہیں جن میں ”السعابة فی شرح الوقایة، مصباح الدجی، التعليق الممجّد، ظفر الامانی اور علماء احناف کے تذکرہ میں انکی کتاب ”الفوائد البہیة“ سب سے مقبول کتاب ہے۔ اسی طرح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی سیکڑوں تصانیف میں سے ۱۳ کتابیں عربی میں ہیں۔“ (۲)

تذکرہ و تراجم پر مشتمل ایک عظیم الشان تصنیف ”معجم المصنفین“ ہے جس کے مصنف مولانا محمود حسن خان ٹوکنی ہیں یہ تقریباً بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس میں چالیس ہزار مصنفین کے حالات جمع کئے گئے اس کتاب کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مؤلف نے تقریباً دو ہزار

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”اردو دائرہ معارف اسلامیہ“ لاہور سید عبداللہ ج ۲ ص ۱۲۱۔

۲- ہندوستانی مسلمان (ایک تاریخی جائزہ) سید ابوالحسن علی ندوی ص ۴۳۔



ایسے مصنفین کے حالات جمع کئے ہیں جن کا نام ”احمد“ ہے اس کتاب کے چار حصے بیروت سے چھپ چکے ہیں۔

فن حدیث کی خدمات میں علماء ہند کا انہماک و شغف مشہور ہے خصوصاً اس فن کی تعلیم میں تو انہیں سب پر فوقیت حاصل ہے بلکہ زمانہ مابعد میں تو اس کی قیادت و امامت انہیں کے حصہ میں آئی بقول علامہ رشید رضا مصری :

”اگر ہندوستانی علماء اس زمانہ میں علم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو یہ فن مشرقی دنیا سے رخصت ہو جاتا کیونکہ مصر شام، عراق و حجاز میں دسویں صدی ہجری سے علم حدیث زوال پزیر ہو گیا تھا“ (۱)

ہندوستان میں اس فن کو عام کرنے میں جہاں ہزاروں مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہیں پرانے شمار علماء کا بہت بڑا احسان ہے جنہوں نے اس فن پر کتابیں اور شروحات لکھی ہیں عربی لغت اور فلسفہ زبان کے موضوع پر کسی عجمی النسل ہندوستانی کا قلم اٹھانا اس کے باکمال اور باذوق ہونے کی دلیل ہے چنانچہ علماء ہند کی بیشتر تصانیف اسی موضوع پر پائی جاتی ہے۔ دور حاضر میں بھی ہندوستانی علماء نے عربی زبان کی خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا چنانچہ متعدد قواعد و معاجم اور ڈکشنریاں ہیں جو دور حاضر میں علماء ہند کے درخشاں کارنامے ہیں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی جو دارالعلوم کے ہونہار فاضل تھے، ان کی عربی اردو ڈکشنری ”مصابح اللغات“ ان کے ادبی ذوق کی واضح دلیل ہے اگرچہ یہ کتاب ”المعجم“ کا ہی ترجمہ ہے لیکن یہ لغت علماء و طلباء کے نزدیک آج بھی بے حد مقبول ہے (۲)

اسی طرح قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی فاضل دارالعلوم دیوبند نے قرآنی لغت پر کام کیا ہے اور انہوں نے قاموس القرآن کے نام سے ایک لغت مرتب کی، جس میں تمام الفاظ قرآنی کا صحیح اردو، ترجمہ اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح کے علاوہ جملہ وضاحت طلب الفاظ پر سہل و شیریں زبان میں مختصر مگر جامع اور مستند نوٹ لکھے گئے ہیں، اسی موضوع پر سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور لغت ”لغات القرآن“ شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ہے۔ اس قاموس کی چھ جلدیں ہیں، چار جلدوں کے مؤلف مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی ہیں اور آخری دو جلدوں کے مؤلف مولانا سید عبدالداہم جلالی ہیں۔

اسی طرح قاضی زین العابدین صاحب کی جدید عربی لغات کی سمت ایک کوشش ”بیان اللسان“ ہے

۱- مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ علامہ رشید رضا مصری مترجم محمد قولا عبدالباقی مصر ۱۹۳۲ء۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند“ (عرب زبان و ادب اور ہندوستان - مولوی ابوالعاص و حیدری) ج ۷ ص ۲۷

مؤلف نے عربی میں جدید الفاظ کی نئی تعبیرات تلاش کرنے اور آجکل کی صحافت میں مستعمل الفاظ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آپ کی یہ کوشش بہت ہی محدود ہے، چنانچہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر زبیر احمد فاروقی لکھتے ہیں:

”یہ ایک درمیانی ضخامت کی اردو عربی ڈکشنری ہے جس میں تقریباً ان بیس ۲۰۰۰۰ ہزار الفاظ کی تشریح کی گئی جو درس نظامی، جامعات کی درسی کتابوں میں مستعمل جدید و قدیم تالیفات، اخبارات و رسائل میں مروج ہیں اس میں مؤلف نے جدید الفاظ اور نئے انداز کی رعایت کی ہے اور اس کی ترتیب عصری قوامیس کے طرز پر کی ہے اور ان کلمات کے جن کے مختلف معانی ہیں صرف مروّج و معروف معنی پر اکتفا کیا ہے اگرچہ بعض جگہوں پر ایسے معنی بھی بیان کر دئے گئے ہیں جو آجکل غیر معروف اور عصری قوامیس میں مستعمل نہیں ہے، اور مؤلف جناب قاضی زین العابدین صاحب نے دوسرے ایڈیشن میں بھی اس طرح کی غلطیوں کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ (۱)“

اسی طرح اردو عربی ”المعجم“ نامی ڈکشنری بھی قابل ذکر ہے جسکی ترتیب و تالیف کا شرف مولانا خلیل الرحمن نعمانی مظاہری کو حاصل ہے لیکن عربی میں مستعمل دوسری زبانوں کے الفاظ مولانا سید سلیمان ندوی کی تلاش ہے محاورات و ضرب الامثال کی تالیف مولانا خلیل الرحمن صاحب کی کاوش ہے اور الفاظ مترادفہ کے جامع مولانا محمد تقی عثمانی ہے۔

نیز دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار اور عربی زبان و ادب کے میدان میں جدید اسلوب نیا طرز فکر اور نئے زاویہ نگاہ کے حامل مولانا وحید الزماں کیرانوی کی یگانہ تالیف ”القاموس المجدید“ (عربی اردو، اور اردو عربی) ”القاموس الاصطلاحی“ (عربی اردو، اردو عربی) اور ”القاموس الوحید“ یہ تمام ڈکشنریاں موجودہ ترقی یافتہ دور میں زبان و ادب، اسلوب و نگارش اور طرز تعبیر میں واقع ہونے والے تغیرات اور صنعتی، سائنسی، علمی، طبی، سیاسی اور صحافتی اصطلاحات و تعبیرات کے لئے انتہائی مدد و معاون ہیں اور علماء و طلبہ مدارس کے لئے ترجمہ و انشاء کے میدان میں زبردست آسانیاں فراہم کرتی ہیں، یہ ڈکشنریاں ہندوستان کی تاریخ میں یقیناً ایک زبردست اضافہ ہے (۲)

عربی زبان میں شعر و سخن کے میدان میں بھی علماء ہند کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ اس میدان میں

۱- ثقافت الہند (مسماۃ علماء دارالعلوم دیوبند فی الادب العربی- پروفیسر زبیر احمد فاروقی) ج ۳۸ شماره ۱-۲ ۱۹۸۷ء

ص ۶۹۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ج ۴۷ شماره ۳ جون ۱۹۷۴ء ص ۱۹-۲۱۔

انھوں نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی چنانچہ ہندوستان میں بے شمار خوشگو، پرگو، مغز بیان شعراء پیدا ہوئے مثلاً قاضی عبدالمتقندرکندی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی صاحب ”سبع سیارة“، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، علامہ انور شاہ کشمیری مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا حبیب الرحمان عثمانی اور اس دور کے مشہور قصیدہ گو شاعر مولانا عبدالمنان دہلوی قابل ذکر ہیں۔ (۱)

علاوہ ازیں اس صدی میں ایسے ایسے عربی ادباء پیدا ہوئے جنکی عربی دانی، اسلوب نگارش، عربی لغات اور نحو صرف پر گہری نظر و علمیت کا لوہا عربوں نے بھی مانا ہے۔ اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے جن میں سے پروفیسر عبدالعزیز میمن، مولانا محمد سورتی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا وحید الزماں کیرانوی قابل ذکر ہیں، پروفیسر عبدالعزیز میمن کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اہل عرب نے مفصل و مستند عربی لغت ”لسان العرب“ کی تصحیح کی کمیٹی میں آپ کو شریک کر کے آپکے علمی استناد و امتیاز کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح مولانا ابوالحسن علی الندوی جن کے علم کی ضیاء پاشیاں دائرہ ہند سے نکل کر بلاد عربیہ تک روشنی کر چکی ہے، ہندوستان کے وہ پہلے شخص تھے جنہیں ”رابطہ عالم اسلامی کا صدر ہونیکا فخر حاصل رہا ہے۔ آپکی تصانیف اہل عرب میں بہت ہی مقبول ہیں ان چند مایہ ناز کتابوں میں ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين“ رجال الفكر و الدعوة، الارکان الاربعة، الصراع بین الحضارة الاسلامیہ والغربیة فی الاقطار الاسلامیة“ قابل ذکر ہیں۔

نیز مولانا وحید الزماں صاحب بھی ہندوستان کے ادیبوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں، آپکی تحریروں کو بھی اہل عرب نے بہت سراہا ہے خاص طور سے وہ تحریریں جو ”دعوة الحق اور الکفاح“ میں شائع ہوئی، عربی زبان و ادب سے متعلق آپکی دو مشہور کتابیں ہیں ”القرأة الواضحة“ تین حصے ”نقحہ الادب“ جو مختلف مدارس عربیہ و عصری جامعات کے درس میں داخل نصاب ہیں، ہندوستان عربی ادیبوں میں مولانا کو جس چیز میں امتیاز حاصل ہے وہ انکا عملی اسلوب ہے۔ (۲)

عربی صحافت کے میدان میں ہندوستان نے غیر معمولی ترقی کی ہے، عربی ہندوستانیوں کی عامیہ زبان نہ ہونیکے باوجود بھی بہت سے عربی رسائل و اخبارات یہاں سے شائع ہوتے ہیں، اگرچہ ان میں کوئی بھی روزنامہ نہیں ہے لیکن پندرہ روزہ، ماہنامہ، اور سہ ماہی رسائل و اخبارات کی تعداد معتد بہ ہے کچھ اخبارات و رسائل قلت و سائل اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے اپنا تسلسل قائم نہ رکھ سکے لیکن جتنے رسائل و اخبارات

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ثقافتہ الہند“ پروفیسر زبیر احمد فاروقی ج ۳۸ شمارہ ۱-۲ ۱۹۸۷ء ص ۶۲۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند“ ج ۴۷ شمارہ ۲ جولائی ۱۹۷۳ء ص ۴۱-۴۳۔

آج شائع ہو رہے ہیں انکے قارئین کی تعداد کافی ہے اور دن بدن اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ شائع ہونیوالے اخبارات و رسائل میں چند مشہور ہیں ”الرائد“ پندرہ روزہ ”البعث الاسلامی“ ماہنامہ یہ دونوں دعوت و اصلاح کے ترجمان اور اسلامی افکار و تصورات کے داعی کی حیثیت سے ندوہ سے پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں عالم عربی میں ایک اہمیت کے حامل ہیں ”الداعی“ جو دارالعلوم دیوبند سے نکلتا ہے اور دارالعلوم کے نظریہ کا ترجمان اور ہندوستان و بیرون ہند کے مسلمانوں کے مسائل کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے اکثر و بیشتر سیاسی اور سماجی احوال پر بھی سیر حاصل تحریر شائع کرتا رہتا ہے۔ اور عربی انشاء کا اچھا معیار پیش کرتا ہے اس کے بانی مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں اور موجودہ ایڈیٹر مولانا نور عالم خلیل الایمنی ہیں اسی طرح حیدر آباد سے سہ ماہی رسالہ ”الصحوۃ الاسلامیہ، الجامعۃ السلفیہ“ بنارس اور ”صوت الامتہ، ثقافت الہند“ دہلی بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ رسائل و اخبارات جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے شائع ہونے بند ہو گئے لیکن عربی زبان و ادب کے فروغ میں ان کا قابل قدر حصہ ہے اور ان کی تحریر و مضامین آج بھی تحقیق و تالیف میں بڑی رہنمائی کرتی ہے ان میں ”البیان“ لکھنؤ سے نکلتا تھا جس کی مجلس مشاورت میں مولانا عمادی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ تھے ”الجامعہ“ ہفت روزہ، مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں کلکتہ سے نکلتا تھا، ”الضیاء“ ماہنامہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ترجمان تھا اسکے ایڈیٹر مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے مولانا وحید الزماں صاحب کی ایڈیٹر میں سہ ماہی مجلہ ”دعوت الحق“ اور جمعیتہ العلماء ہند دہلی کے شعبہ نشر و اشاعت سے جمعیتہ کا ترجمان اور مسلمانوں کے مسائل کا علمبردار ”الکفاح“ پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا۔ یہ تمام رسائل و جرائد اپنے اسلوب، طرز فکر صاف گوئی اور بعض خصوصیات کی بنا پر آج بھی عربی سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں کافی مشہور ہیں، ان رسائل و اخبارات کی کاوشوں کی وجہ سے ہندوستان میں عربی زبان و ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ (۱)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ہندوستانی مسلمان“ (ایک تاریخی جائزہ) مولانا ابوالحسن علی الندوی ص ۴۸ - ۵۰۔

## باب دوم

### مولانا وحید الزمان کیرانوی

نام نسب اور خاندانی کوائف

تعلیم و تربیت

دارالعلوم دیوبند سے وابستگی سے قبل

ملی و اجتماعی سرگرمیاں

وفات

## نام و نسب اور خاندانی کوائف

مغربی اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے مردم خیز قصبہ ”کیرانہ“ کے متوسط اور علمی خانوادے میں ۱۷ فروری ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ یہی وہ قصبہ کیرانہ ہے جہاں جنگ آزادی کے عظیم مجاہد اور صف اول کے جلیل القدر مشہور زمانہ کتاب ”اظہار الحق“ کے مصنف علامہ رحمت اللہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو دادھیال اور نانہال دونوں جانب سے شیخ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپ کا سلسلہ ۳۳ واسطوں سے حضرت ابویوب نصاریٰ سے ملتا ہے۔

یہ خانوادہ علم و فضل، تہذیب و شائستگی اور دین و تقویٰ میں کیرانہ میں ممتاز تھا۔ اس میں کئی پشتوں تک نامور عالم ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کے پردادا محمد حسین دادا مولانا محمد اسماعیل مرحوم، والد محترم مولانا مسیح الزماں الغرض تمام بزرگان سلف اور اجداد علم دین کی دولت سے مالا مال تھے۔ جن کی زندگیاں اشاعت اسلام اور تبلیغ دین میں گزری۔ ان میں علماء، صوفیاء، ادباء، صالحین، متقین اور عارفین سبھی پیدا ہوئے۔ (۱)

### سلسلہ نسب:

”مولوی وحید الزماں بن مولوی مسیح الزماں بن قاضی مولوی محمد اسماعیل بن قاضی محمد حسین بن قاضی غلام حسین بن قاضی قلندر بخش بن قاضی محمد ظہیر الدین بن قاضی محمد زماں بن قاضی شیخ حسین بن قاضی علی احمد بن قاضی محمد عبدالنبی بن خواجہ قاضی مولانا احمد عرف بہل بن خواجہ محمد، بن خواجہ نظام الدین، بن خواجہ قاضی شمس الدین، بن خواجہ علاؤ الدین المدنی (دارد ہندوستان در قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر) بن خواجہ ظہیر الدین بن خواجہ قوام الدین بن خواجہ بدر الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ قطب الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن ہاشم بزرگ بن خواجہ اسماعیل عبداللہ ہرائی بن خواجہ ابو محمد منصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ علی بن خواجہ جعفر بن خواجہ ابی منصور بن ابویوب نصاریٰ صحابی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم“ (۲)

آپ کی والدہ مولانا عبد المجید جھنجھانوی کی صاحبزادی اور مولانا قطب الدین مصنف ”مظاہر حق“ کی نواسی تھی یعنی دونوں جانب دادھیال و نانہال میں علماء کا ایک سلسلہ تھا۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم جدید“ نئی دہلی خصوصی شمارہ (خود نوشت سوانح، مولانا حید الزماں) ص ۳۵-۶۱۔

۲- ”صحیفہ ابرار،“ (شجرہ نسب انصاریان قصبہ کیرانہ) تنویر علوی ص ۶۷۔

## قصبہ کیرانہ :

کیرانہ مغربی یوپی کے ضلع مظفر نگر کے تاریخی قصبات میں سے ہے۔ یہ شمالی ہند کے مشہور و معروف قصبات میں سے ایک ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۰ ہزار ہے اور مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد ہے۔ یہ مظفر نگر سے ۱۴۸ کلومیٹر کے فاصلہ پر جنوبی اور مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں ۳۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر قصبہ دیوبند اور ایک سو سولہ (۱۱۶) کلومیٹر کے فاصلہ پر سہارنپور سے جنوبی اور مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ یہ قصبہ کوروں اور پانڈوؤں کے زمانہ کی یادگار ہے اور پانڈوؤں کے مہاراجہ کرن کا آباد کیا ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام کیرانہ ہوا۔ یہ قصبہ قدیم زمانہ میں چوہان اور راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا ہے۔ چونکہ اور بائیس ضلع کرنال میں چوہان آباد تھے ان کے مورث اعلیٰ رانا ہرہ کی اولاد ہے۔ رانا کلسہ قصبہ کیرانہ کا حکمران تھا جس کی وجہ سے قصبہ اور نواح قصبہ کے چور اسی گاؤں کلسیان گوجر کہلاتے ہیں، رانا کلسہ چوہان، راجپوت تھا مگر نواح قصبہ میں گوجر آباد تھے۔ اس لئے رانا نے گوجر قوم میں شادی کی۔ رانا سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا۔ سلطان کی اجازت سے سید سالار مسعود غازی مجاہدین کی ایک بڑی تعداد لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور قصبہ جھنجھانہ ہو کر کیرانہ پر حملہ کیا۔ شہر کے شمالی اور نواح میں ابھی بھی مزار شہداء موجود ہیں۔ ایک قبر شہر کے شمال کی جانب چند گز طویل ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عرب شہداء کی قبر ہے اس میں بہت سے شہیدوں کو ایک جگہ دفن کیا گیا ہے۔

سید سالار مسعود غازی کے کیرانہ پر حملے کی یادگار اب تک سالاری قوم قصبہ میں موجود ہے۔ یہ عرب نژاد قوم قصبہ میں شتربانی کا کام کرتی ہے اور اونٹ ان کا ذریعہ معاش ہے۔ سلاطین تغلق کے زمانے میں شیخ علاء الدین انصاری علاقہ کے منصب قضاء پر مقرر ہوئے اس وقت سے شیخ انصار قوم کیرانہ میں آباد ہیں۔ شیر شاہ کے زمانہ میں ”کاکڑنی“ افغان آباد ہوئے۔ جن کی اولاد اب تک ہے۔ یہ قصبہ دریا جمنہ کے قریب واقع ہے یہاں کی زمین چکنی اور ریتیلی ہے۔ یہاں سرخ مرچ و پیاز کی بہت بڑی پیداوار ہوتی ہے جو دور دور تک سپلائی کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہاتھ کے پنکھے کی صنعت بھی قریش برادری میں عورتوں کا عام مشغلہ ہے جو دور دور تک مشہور ہے اسی طرح اس علاقہ میں مسلمان کاشتکاروں کی اکثریت ہے۔ شیعہ و سنی دونوں فرقوں کے لوگ بڑے میل جول سے رہتے ہیں۔ (۱)

## خاندانی حالات

خاندان دادھیال شیوخ کیرانہ نانہال شیوخ جھنجھانہ سرال شیوخ کا مذہلہ۔ آپ کے والد محترم مولانا مسیح الزماں جید عالم دین تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیری و علامہ شبیر احمد عثمانی۔ فاضل دارالعلوم دیوبند، فراغت کے بعد انجمن حمایت الاسلام امرتسر میں مبلغ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ کے والد محترم کا انتقال

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”مظفر نگر گزیٹر ایچ آر نیولی ج ۳ ص ۵۶۷-۵۶۹۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”آثارِ رحمت“ امداد صابری ص ۵۶۔

ہو گیا۔ انتقال کی خبر سن کر امرتسر سے کیرانہ تشریف لائے اور اہل خانہ کے اصرار پر کیرانہ ہی میں مستقل قیام فرمالیا۔ جائیداد و تولیت مسجد کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور انہماک کے ساتھ انتظامی اور سیاسی امور میں مشغول ہو گئے اور روز بروز سیاسی انہماک بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ جمعیتہ علماء ہند کے ممبر بن کر تحریک آزادی میں حصہ لیا جس کی بناء پر جیل کی سختیاں بھی برداشت کرنی پڑی۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں سے تعلق کے باوجود ہمیشہ ”جمعیتہ علماء ہند“ کے اصولوں پر قائم رہے۔ آپ کی رفقاء میں سے بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے لیکن آپ نے ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ (۱) مولانا خود نوشت سوانح میں والد محترم کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اگرچہ مزاج میں سختی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی طبیعت میں فراخی اور سخاوت بھی تھی غیرت و حمیت، خودداری اور سخاوت ان کے نمایاں اوصاف تھے، سخت مزاجی اور سخت گیری کے باوجود عفو و درگزر میں بے مثال تھے۔ اگر افراد خانہ یا بیرونی افراد سے ناراض ہوتے تو اس کا اظہار ہر طرح سے کرتے۔ ترک کلام کر دیتے۔ لیکن معافی کے بعد ان کا غصہ اس طرح زائل ہو جاتا کہ اس کا اثر بالکل بھی باقی نہ رہتا اور دل صاف ہو جاتا، بہادری اور شجاعت مشہور تھی، کبھی بھی کسی سے خوف زدہ نہ ہوتے، اگر کسی نے حکم سے سرتابی کی تو فوراً مشتعل ہو جاتے، ایفاء عہد کے پکے تھے، نماز کے اس قدر پابند تھے کہ اگر عدالت میں نماز کا وقت ہو جاتا تو مجسٹریٹ سے صاف کہہ دیتے کہ نماز کے لئے جا رہا ہوں، یہاں تک کہ سفر کا پروگرام بھی نمازوں کی ترتیب کا خیال کر کے بناتے۔ غریبوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ سائل کا مطالبہ ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کرتے، غریب کی دعوت ہمیشہ قبول کر لیتے اور اس کے گھر جا کر کھا بھی لیتے۔“ (۲)

## دیگر اہل خانہ :

مولانا مسیح الزماں کی تین شادیاں ہوئیں پہلی شادی کیرانہ میں ہی ہوئی جن سے دو بچے ہوئے۔ فرید الزماں اور وحید الزماں۔ لیکن یہ دونوں بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئے اور اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ پھر دوسری شادی جھنڈھانہ میں ماموں زاد بہن سے ہوئی جن سے آٹھ اولادیں پیدا ہوئیں دو کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا اور ایک کا انتقال بارہ سال کی عمر میں ہوا، صرف پانچ باقی رہے جن میں مولانا وحید الزماں اور حمید الزماں ابھی چند سال قبل انتقال فرما گئے ہیں۔ تین میں عمید الزماں، فرید الزماں، معید الزماں الحمد للہ بقید حیات ہیں۔ تیسری شادی پر سولی گاؤں میں ہوئی جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو الحمد للہ بقید حیات ہے اور مولانا غیاث الحسن ایڈیٹر ماہنامہ ”دینی مدارس“ کے عقد زوجیت میں ہے۔

۱- مولوی عمید الزماں کراچی برادر خورد مولانا وحید الزماں کراچی (بالشفاف)۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء (خود نوشت سوانح، مولانا وحید الزماں کراچی) ص ۳۰۔



## برادرانِ محترم :

مولوی عمید الزماں فاضل دارالعلوم دیوبند ایم اے دہلی یونیورسٹی مختلف انجمنوں اور رساں سے وابستہ رہنے کے بعد ایک مدت تک سعودی سفارتخانہ نئی دہلی کے شعبہ ترجمہ صحافت و اطلاع و نشریات کے ذمہ دار کی حیثیت سے کام کیا اور حال ہی میں ریٹائرمنٹ لے کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ عربی اور انگلش پر عبور حاصل ہے۔ مزاجاً انتہائی خوددار اور باوقار رفتار و گفتار کے عادی ہیں۔ اپنے والد محترم کی صفات کے آئینہ دار ہیں۔

ڈاکٹر معید الزماں، فاضل دارالعلوم دیوبند بی یو ایم ایس جامعہ طیبہ دہلی اس وقت دیوبند میں دارالشفافا قاسمی کے نام سے مطب چلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفاء فرمائی ہے۔ غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اسی وجہ سے مطب پر اکثر کافی لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔ سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔

## فرید الزماں :

انہیں بھی قاسمی ہونے کا شرف حاصل ہے حفظ کے بعد شعبہ قرآت سے تجوید پڑھی، دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے کیا۔ ۱۹۸۱ء میں عراقی سفارتخانہ نئی دہلی میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے پھر ۱۹۸۲ء سے تاحال کویت ایجینسی نئی دہلی میں ویزا سیکشن کے انچارج ہیں۔ انتہائی خوش مزاج سنجیدہ نرم دل اور ملتسار ہیں۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ ان کے حسن اخلاق کی بناء پر تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

## اولاد :

مولانا کی شادی شیوخ کاندھلہ میں ہوئی اور ان سے چار اولاد ہوئیں۔ الحمد للہ چاروں بقید حیات ہیں۔ بدر الزماں فاضل دیوبند، بی اے دہلی یونیورسٹی آٹھ سال تک سعودی سفارتخانہ میں عربی انگلش مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد آٹھ سال تک قطر میں سرکاری ملازم کی حیثیت سے ایک اہم عہدہ پر فائز رہے۔ تانہوز سعودی سفارتخانہ نئی دہلی میں بحیثیت ٹرانسلیٹر ملازم ہیں۔ علاوہ ازیں والد محترم کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کی صفات کی جھلک ان میں صاف نظر آتی ہے۔ ان سے چھوٹی ایک لڑکی ہے جس کی شادی دیوبند میں ہی مولوی محمد رفعت مدرس دارالعلوم دیوبند سے ہوئی۔ نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا لڑکا صدر الزماں بھی فاضل دیوبند ہے اور ان سے چھوٹے قدر الزماں جو بعض مجبوریوں کے سبب صرف دارالعلوم سے عالمیت ہی کر سکے فضیلت کی سعادت ان کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہ دونوں بھائی کتب خانہ حسینیہ دیوبند (جس کی شروعات مولانا نے کی تھی) کی ذمہ داری بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ (۱)

## زمانۂ طفولیت، ابتدائی تعلیم :

مولانا وحید الزماں کی شخصیت کے نشوونما کا اگر جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہو گا کہ وہ ابتداء ہی سے عام

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے ”وہ کوہ کن کی بات“ مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۱۴۶۔

روش سے الگ اور ایک امتیازی شان کے مالک تھے پھر انتظام قدرت کچھ ایسا تھا کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کو ابھرنے اور نکھرنے کے مواقع ملتے چلے گئے، آپ کو مبداء فیاض سے گونا گوں صلاحیتیں عطا ہوئیں تھیں جن کے آثار بچپن سے ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ بچوں کے عام کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے ان کی دلچسپی کا کھیل اگر کوئی تھا تو وہ یہ کہ کاغذ پر مکانات کے نقشے بناتے، قینچی سے خوبصورت مساجد اور تعمیرات کے فوٹو تراشتے اور اچھے اچھے ڈیزائن تیار کرتے ایک بار بچپن ہی میں اپنے ہاتھ سے ٹوٹے ہوئے برتن کو تراش کر اینٹیں بنائیں اور ان سے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تیار کیا جو فنی اعتبار سے بہت عمدہ اور خوبصورت تھا۔ آپ کے والد محترم کے پاس علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی آمد و رفت رہتی تھی۔ جب علامہ نے اس چھوٹے سے کمرہ کو دیکھا تو تعجب کیا اور فرمایا کہ اتنی کم سنی اور یہ فن کاری۔

بچپن میں آپ نے خواب دیکھا کہ جامع مسجد کیرانہ کے حوض میں وضو کر رہا ہوں اور حوض سے روئی کے گالے اُبل اُبل کر آسمان میں پھیل رہے ہیں۔ والدہ صاحبہ سے خواب کا ذکر کیا۔ انھوں نے اپنے بھائی حافظ محمد عیسیٰ (مرحوم) سے اس کی تعبیر دریافت کی جو اس وقت ایک متقی بزرگ اور تعبیرات کے علم سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے تعبیر بتائی کہ اس بچہ کے علم سے ایک دنیا فیض یاب ہوگی۔ (۱)

## تعلیم و تربیت

مولانا وحید الزماں اپنے خاندانی پس منظر کے اعتبار سے ایک علمی خانوادہ کے وارث اور جانشین تھے۔ جہاں صرف زمینداری ہی اپنے تمام کروفر کے ساتھ سایہ فگن نہ تھی بلکہ پشتہا پشت سے خانوادہ وحیدی علم دین کا گہوارہ بھی تھا۔ چنانچہ آپ کے جدی سلسلہ کے پانچ بزرگ بلا انقطاع عالم دین ہوئے ہیں۔ ان کی دینی نشو و نما اور علمی ساخت و پرداخت میں علی الترتیب ان کے ولی صفت والد محترم مولانا مسیح الزماں اور یگانہ عصر استاد حضرت علامہ ”مامون الدمشقی“ؒ مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ اول الذکر پاک نفس بزرگ نے آپ کے مزاج میں دین کی عظمت و محبت اور حمیت و صلابت پیدا کی، بچپن کا یہ دینی انصباع آپ کی ذات میں نمایاں رہا اور ثانی الذکر علمی مربی نے آپ کے اندر تحصیل علم کی ایسی چاہت و محبت بھردی کہ آپ کی شخصیت زندگی برائے علم کا نمونہ بن گئی۔ آپ آغاز طفولیت ہی سے نہایت ذہین اور طباع تھے۔ اس وقت اکثر قدیم گھرانوں اور شرفاء کے خاندانوں میں رواج تھا کہ ۴-۵ سال کی عمر میں بچہ کو مکتب میں بٹھا دیا جاتا اور اس کی بسم اللہ خوانی ہو جاتی۔ چنانچہ آپ کے گھرانہ کا طریق کار بھی یہی تھا۔ قرآن مجید حفظ کرانا اس خاندان کا خصوصی شعار اور تعلیم کا پہلا ضروری مرحلہ تھا پھر اس کے بعد دوسری تعلیم اسی رواج کے مطابق آپ کو بھی مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ اس وقت جامع مسجد کیرانہ قرآن کی تعلیم کا مکتب تھا جس کے سرپرست آپ کے والد محترم ہی تھے۔ اور اس میں پڑھنے والوں کی تعداد تقریباً دو سو سے زائد تھی اور اس تعداد

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۳۳۳۔

کو پڑھانے کے لئے صرف دو استاد مقرر تھے۔ حافظ ہدایت اللہ اور حافظ رحمت اللہ دونوں استاد غیر معمولی محنتی تھے۔ لہذا آپ نے اسی مکتب سے حفظ کی تعلیم حاصل کی۔ حفظ کے ساتھ ساتھ حساب وغیرہ کی تعلیم کے لئے ایک ماسٹر سے ٹیوشن بھی لگا دیا گیا۔ پھر اسی مکتب میں درجہ عربی و فارسی بھی قائم ہو گیا۔ مولانا خالد بلا معاوضہ عربی بڑھانے لگے شروع میں تین طالب علم ہی تھے۔ جن کو فارسی کی گلستاں و بوستاں پڑھائی گئی اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہو گئی (۱) مولانا اپنی اس تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

”گلستاں و بوستاں والے سال ہمارے مدرسے میں ایک ہندو ماسٹر مولانا خالد سے ایک عربی کتاب پڑھنے آتے تھے۔ اس میں عربی کے چھوٹے چھوٹے جملے تھے۔ ہم جب ان جملوں کا ترجمہ سنتے تو یہ شوق پیدا ہوتا کہ ہم بھی عربی کی کوئی ایسی ہی کتاب پڑھیں گے اور ہمیں عربی بولنا آئے گا لیکن جب عربی کا پہلا سال شروع ہوا اور میزان و منشعب و پنج گنج اور علم الصیغہ وغیرہ کتابیں سامنے آئیں تو ساری ہمت اور خوشی کا فور ہو گئی اور دماغ پر عجیب قسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا کیونکہ ہر کتاب میں مشکل گردانوں اور مشکل ترین تعلیمات وغیرہ کے ذکر کے علاوہ کوئی دلچسپی کی چیز نہیں تھی۔“ (۲)

پنج گنج اور علم الصیغہ کے بعد آپ نے قدوری اور نور الایضاح بھی مولانا خالد سے پڑھی۔ کیرانہ میں آپ قدوری پڑھ ہی رہے تھے کہ اسی دوران حیدر آباد سے آپ کی والدہ کے چچا زاد بھائی حافظ واجد علی جو متشرع ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم یافتہ بھی تھے کیرانہ تشریف لائے انگریزی زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ حیدر آباد کے جس محلے میں ان کا قیام تھا اسی محلہ کی مسجد میں ایک شامی عالم ”علامہ مامون الدمشقی“ جو سات زبانوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے اور مختلف ممالک میں رہ چکے تھے وہ مسجد کے ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ ان دنوں دکن حیدر آباد علم و فن اور ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ سیکڑوں علماء مفکر، ادباء شعراء ملک و بیرون ملک سے دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، جامعہ عثمانیہ، جامعہ نظامیہ کے علاوہ دولت آصفیہ کے مختلف شعبوں کی خدمت انجام دے رہے تھے ان میں علامہ مامون الدمشقی ایک معتبر نام تھا وہ مسجد میں ایک گھنٹہ عربی درس دیا کرتے تھے۔ خود حافظ واجد علی نے ان سے عربی پڑھ کر عربی بولنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے مولانا کے والد محترم پر زور دیا کہ وہ آپ کو حیدر آباد برائے تعلیم لے جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ کے والد صاحب نے اجازت دے دی تو ایک ماہ بعد ان کے ساتھ حیدر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک قیام حیدر آباد کا زمانہ آپ کی زندگی میں ایک خاصہ اہمیت رکھتا ہے آپ کے علمی و دینی سفر میں حیدر آباد کو ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں وہ نہ صرف عربی زبان سے واقف ہوئے بلکہ جدید عربی ادب کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ جس عظیم الشان علمی فکری اور اصلاحی تحریک کو برپا کرنے کی سعادت ان کے لئے

۱- تفصیل کیلئے دیکھئے خودنوشت سوانح مولانا وحید الزماں کیرانوی ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۳۲۔

۲- ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دیوبند خصوصی نمبر ۱۹۹۵ء ص ۴۰۔

مقدر ہو چکی تھی اس کے لئے ضروری ساز و سامان کی فراہمی کے سلسلے میں حیدر آباد کا جو کلیدی کردار رہا ہے وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ بہر حال وہ موقع آپ کو نصیب ہوا اور اس علم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے دامن سے ساری عمر وابستہ رہنے اور اسی کی خدمت کے لئے ہو جانے کا فیصلہ قضا و قدر میں آپ کے لئے مقدر ہو چکا تھا اور جس کی نسبت پیدائشی نام پر اس طرح غالب ہو کر رہنے والی تھی کہ ”وحید زماں“ کی اصلی تعبیر مل گئی۔ چنانچہ علامہ دمشقی سے شرف تلمذ حاصل ہو گیا جس نے آپ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے بھی پوری توجہ اس پر صرف کر دی (۱)

### علامہ مامون الدمشقی

ایک معمر بزرگ اور سات زبانوں سے واقف تھے مگر ان کی زندگی ایک معمہ تھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی اولاد و اہل خانہ سے الگ ہو کر مختلف ملکوں میں زندگی کیوں گزار رہے تھے۔ بڑے زیرک قیافہ شناس تھے ان کا قیام مسجد نام پکی کے ایک کوارٹر میں تھا۔ بہت بااخلاق بہترین ادیب شاعر غیر مسلموں میں کامیاب مبلغ اور انتہائی ملنسار و خوش گفتار تھے۔ زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ گزارتے تھے۔ تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ قریب کی مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دیتے تھے۔ مولانا وحید الزماں بھی ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔ نہ درس کا باضابطہ کوئی نظام تھا اور نہ ہی کوئی کتاب مقرر تھی۔ تختہ سیاہ پر کچھ جملے وغیرہ لکھ کر اس کی مشق کراتے تھے۔ مولانا روزانہ ناشتہ کے وقت ان کے مکان پر جاتے اور ان سے مختلف سوال کرتے، ناشتہ سے فراغت کے بعد وہ گھر سے نکلتے اور مختلف اداروں اور دفاتروں میں جا کر لوگوں سے ملاقاتیں کیا کرتے، ہمیشہ فصیح و بلیغ عربی بولتے اور دوسروں کو حتیٰ کہ بڑے بڑے عرب اور اہل علم کو لغت فصیحی بولنے کی تاکید کرتے۔ مولانا ایک ماہ تک صبح شام ان کے ساتھ رہے اور ان کی گفتگو سنتے اور ان جملوں کے محل استعمال کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھی اپنے طور پر جملہ بنا کر تصحیح و تصویب کراتے کبھی تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے ”انت فقط العرب“ اور کبھی ہنستے ہوئے کہتے ”انت لا تعرف العربیة“۔

حیدر آباد کی نشر گاہ (ریڈیو اسٹیشن) پر کچھ عرصہ کے لئے وہ مترجم و اناؤنسر مقرر ہوئے تو اصل خبریں تو اردو میں ہوتی تھیں اور ان کا عربی میں ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ انھیں اردو کے بعض محاورات سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی اس لئے وہ آپ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ آپ کا اس طرح استفادہ کا سلسلہ چل رہا تھا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور ریاست حیدر آباد نا عاقبت اندیشی کی وجہ سے ہندوستان میں شامل ہو گئی۔ چونکہ حیدر آباد ایک الگ ریاست تھی آزادی کے بعد جواہر لال نہرو نے فوج کشی کر کے اس کو ہندوستان میں مدغم کر دیا اور ریاست کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قدیم حیثیت ختم کر دی گئی۔ لہذا آزادی کی شورش، پولیس ایکشن اور سقوط حیدر آباد کا اثر وہاں کی ہر چیز پر پڑا۔ اس سے آپ کی تعلیم بھی متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ علامہ مامون دمشقی سے بھی استفادہ کی صورت ختم ہو گئی۔ کیونکہ وہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔<sup>۲</sup> لیکن علامہ مامون دمشقی سے استفادہ کی صورت ختم ہونے کے بعد بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اور حوصلہ کے

۱- تفصیل کیلئے دیکھئے ”ماہنامہ دینی مدارس“ دہلی اپریل ۱۹۹۵ء مولانا غیاث الحسن سہارنپوری ص ۴۲-۶۲۔

۲- تفصیل کیلئے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دہلی“ خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۴۲-۵۷۔

ساتھ اس کام کو آگے بڑھایا آپ روزانہ کتب خانہ آصفیہ جانے لگے وہاں روزانہ ۵-۶ گھنٹہ مطالعہ کرتے۔ مطالعہ میں عربی اخبارات و رسائل خصوصیات سے دیکھتے۔ اس طرح آپ کو عربی کی شد بد ہو گئی اور عربی زبان ایک سہل اور آسان زبان معلوم ہونے لگی عربی زبان کے بارے میں آپ کا جو خیال تھا کہ صرف و نحو ہی عربی زبان ہے وہ بھی آپ کے ذہن سے نکل گیا۔ اب عربی زبان آپ کو سہل اور ایک زندہ زبان معلوم ہونے لگی جو اردو کی طرح بولی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ جیسے جیسے آپ عربی سے واقف ہوتے گئے آپ کے شوق اور لگن میں اضافہ ہوتا گیا، شوق و لگن کا یہ حال تھا کہ ایک ایک خبر کو دس دس بار پڑھتے پھر بھی بات پوری سمجھ میں نہیں آتی پڑھنے میں اس چیز کا لحاظ نہیں کرتے کہ اس میں کیا خبر ہے بلکہ اس اعتبار سے دیکھتے تھے کہ کس مفہوم کو عربی میں ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اس کو اردو میں کیسے بیان کیا جاتا ہے۔ آپ خصوصیت سے اس بات کو نوٹ کرتے کہ کس موقع پر کیا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کا صلہ کیا ہے۔ آپ کا ذہن اخذِ تعبیرات پر مرکوز رہتا یہ آپ کی ذاتی مشق کا طریقہ کار تھا اس دور کے بارے میں مولانا خود فرمایا کرتے تھے :

”میں نے علامہ مامون دمشقی سے باقاعدہ کوئی اسباق یا مختلف کتابیں نہیں پڑھیں بلکہ علامہ نے میری ذہانت کا اندازہ لگا کر مجھے کسی عرب مصنف کی ادبی کتاب دے دی اور پڑھانا شروع کر دیا اور یہی کتاب میں نے دو سال میں ختم کی مگر اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھی ایک صفحہ کے سبق پر کام کرتے کرتے کئی دن گزر جاتے۔ حالانکہ اس کا مطلب اور مشکل لغات میں پہلے دن ہی حل کر لیتا، اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ مرحوم ایک سبق میں بہت کچھ سکھاتے۔ جیسے قواعد، ترکیب نحوی و صرفی جملوں سے نئی تعبیرات اخذ کر کے اپنے جملوں میں استعمال کرنا، بعض محاوروں کو گفتگو میں استعمال کرنا، حالانکہ اس عمل میں کافی وقت صرف ہوتا مگر کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت ان کی خدمت میں گزارنے کی کوشش کرتا۔ اس لئے کہ وہ کسی وقت بھی اپنی معمولی سے معمولی ضرورت کے لئے اردو میں بات نہ کرتے بلکہ خالص فصیح عربی میں گفتگو فرماتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی اردو جانتے تھے اس طرح میں نے دو سال محنت کی جس نے نہ صرف میری صلاحیت کو مانجھ دیا بلکہ آئندہ کے لئے بھی تشویق پیدا کر دی۔“ (۱)

اس طرح مولانا نے حیدر آباد میں دو سال گزارے۔ ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان کو آزادی کا تحفہ ملا اسی کے ساتھ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا اثر ریاست حیدر آباد پر بھی ہونا یقینی تھا۔ پھر اس سے تمام لوگوں کے معمولات بھی متاثر ہوئے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔ لہذا مولانا جو اس وقت حیدر آباد میں مقیم تھے اور عربی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آپ کی تعلیم بھی اس سے متاثر ہوئی، ان حالات کے پیش نظر آپ نے حیدر آباد کو خیر باد کہنے میں ہی مصلحت سمجھی اور وطن عزیز واپس آگئے۔ غرض قیام حیدر آباد کے دو برس کا زمانہ

۱- ”مولانا وحید الزماں کی یاد میں“ (مقالہ مولانا وحید الدین خاں صاحب) ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۵۷۔

مولانا وحید الزماں کی زندگی کا وہ دور ہے جس کو آپ کی علمی زندگی کا عطر کہنا چاہیے۔ انھیں دو برسوں نے آپ کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور آپ کی صلاحیت کو اجاگر کر دیا۔

بہر حال یہاں پہنچ کر بھی آپ نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کا ارادہ کیا اور تشنگی علم کو بھانے کے لئے دارالعلوم کی طرف کوچ کیا اور ۱۹۴۸ء میں باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ یہاں پہنچ کر پھر آپ کو وہی ماحول ملا جس میں اکتادینے والی بحث سے طلبہ اُوب جاتے ہیں اور ان کے خواب و خیالات کو کوئی تعبیر نہیں ملتی لیکن آپ اس ماحول سے بالکل متاثر نہیں ہوئے بلکہ ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ حیدر آباد میں رہ کر عربی کی سوجھ ہو گئی تھی اگرچہ ابھی تک عربی انشاء وغیرہ پر عبور حاصل نہیں ہوا تھا کچھ رسائل و اخبارات ضرور پڑھنے لگے تھے۔ یہاں پہنچ کر ذاتی طور سے محنت شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد دارالعلوم کے ممتاز طلبہ میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ چونکہ دارالعلوم میں اس وقت عربی میں گفتگو کرنا ایک عجیب بات تھی طلبہ میں تو یہ چیز تقریباً معدوم ہی تھی البتہ اساتذہ میں بھی صرف چند ہی لوگ تھے جن کو عربی زبان پر کامل قدرت حاصل تھی۔ دارالعلوم میں عربی اس وقت بحیثیت زبان نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ فقہ، حدیث اور تفسیر ہی پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ پروفیسر بدر الدین الحافظ اس وقت کے دارالعلوم کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں:

”چونکہ میں نے مولانا مرحوم کی بنیادی خدمات کے آغاز کو بچشم خود دیکھا اور اس زمانہ کے ماحول کے تناظر میں سمجھا اور پرکھا ہے اس لئے نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا وحید الزماں کیرانوی سے قبل دارالعلوم میں عربی تقریر و تحریر اور انشاء پردازی کا ماحول تھا ہی نہیں۔ وہاں جو کچھ بھی علمی یا دینی و ادبی کام ہو اس کا تعلق انشاء پردازی یا عربی صحافت وغیرہ کی ذہن سازی سے نہ تھا اور اس چھٹی دہائی میں حضرت مولانا مدنیؒ وہ واحد شخص تھے جو بلا تکلف عربی بول لیا کرتے تھے۔ آپ کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص بلا تکلف عربی بول سکتا ہو۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ تونس کے ایک مہمان دارالعلوم تشریف لائے تو اہتمام کے اہل کاروں نے انہیں مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور ذمہ دار حضرات کو اطلاع دی مگر کوئی صاحب بہ نفس نفیس تشریف نہ لائے بلکہ مولانا وحید الزماں کی تلاش میں اہلکار دوڑتے رہے جب وہ آگئے اور مہمان خانہ میں جا کر گفتگو شروع کر دی تب دوسرے حضرات وارد ہوئے۔“ (۱)

طالب علمی کے زمانے میں آپ کی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم کی عربی خط و کتابت کا کام آپ کے سپرد تھا یہاں تک کہ عربی و فود کی آمد کے موقع پر ترجمانی کے فرائض آپ ہی انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ اس خدمت کے لئے دارالعلوم کی طرف سے ایک مخصوص وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ آپ اس وقت جس بے تکلفی، روانی اور ادبی زبان کے ساتھ گفتگو کرتے تھے دوسروں کو یہ کمال حاصل نہیں تھا۔ سید رشید رضا مصری جب دارالعلوم

۱- ”ان کی یادوں کے سفینے“ (مقالہ پروفیسر بدر الدین الحافظ) ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ص ۹۱

تشریف لائے اور مولانا وحید الزماں سے گفتگو ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور جب حضرت مہتمم صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ دارالعلوم کا ایک طالب علم ہے اور ہندوستان ہی کا رہنے والا ہے تو سید رشید رضا حیران رہ گئے وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی عرب بچہ ہے اس لئے کہ آپ کے تلفظ اور لب و لہجہ میں وہی صفائی تھی جو عرب ادیبوں اور عرب علماء کی خصوصیت ہے۔

ایک مرتبہ سعودی عرب، مصر، اور بعض دوسرے ممالک کے سفراء دارالعلوم آئے۔ اہتمام کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ حضرت مہتمم صاحب نے ان کی آمد پر پُر تپاک انداز میں اظہار مسرت کرتے ہوئے دارالعلوم کے مقاصد اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مدرسہ کے میں بنیاد کردار پر اردو میں روشنی ڈالی، بعد میں مولانا وحید الزماں صاحب کو ترجمانی کے لئے بلایا گیا آپ نے نہ صرف حضرت مہتمم صاحب کی مختصر تقریر کی ترجمانی کی بلکہ بڑی روانی کے ساتھ اکابر دارالعلوم کی ہمہ جہتی خدمات کا تفصیلی تعارف اور دارالعلوم کے مسلک اور بلند عزائم پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ آپ کی یہ عربی تقریر کوئی ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ مجمع میں ہر طرف سے دادِ تحسین بلند ہو رہی تھی۔ عرب مہمانوں نے بھی بڑی تعریف کی۔ (۱)

آپ نے طالب علمی کے دوران اس کمی کو محسوس کیا اور پہلے ہی سال ایک جلسہ میں عربی میں تقریر کی جس کی اہل دارالعلوم نے خوب پذیرائی کی۔ اس کے بعد طلباء میں عربی زبان کو عام کرنے کیلئے ”سلسلۃ الدروس العربیۃ“ کے نام سے جدید اور رائج الوقت عربی زبان کی مشق کے علاوہ مروج و مستعمل الفاظ و معانی کی ڈکشنری نما ایک دیواری پرچہ نکالا اور دوسرے طلباء کو بھی اس طرف توجہ دلائی اور ان کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ جن طلبہ نے اس طرف توجہ کی ان طلباء کو آپ نے خالی وقت میں بڑی دل سوزی اور لگن کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا اگرچہ دارالعلوم دیوبند میں جدید عربی کی کمی کا احساس تو اصغر و اکابر سبھی کو تھا۔ مگر عملاً مولانا نے ہی اس طرف پیش قدمی کی۔ مولانا باقر حسین بستوی فرماتے ہیں:

”بلاشبہ دور حاضر میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس جہت سے اور اس طرح پر دارالعلوم

کے طلبہ کو عربی زبان کی ناواقفیت کے تسلط سے نجات دلانے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس

سمت میں اساسی اہمیت کا بہت کچھ کام کیا۔ یان کی بصیرت اور بالغ نظری کی واضح دلیل ہے“ (۲)

چنانچہ دورانِ طالب علمی آپ نے جن طلبہ کو پڑھایا ان کی تعداد تقریباً ۸۰ تک پہنچتی ہے بعض ان میں سے آج بھی دارالعلوم اور وقف دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاد خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو دارالعلوم میں عربی انشاء پر دازی کی شروعات یہیں سے ہوئی اور عربی زبان کی انشاء کی یہی داغ بیل تھی جو بعد میں چل کر شعبہ کی صورت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ دارالعلوم کے انشاء پر داز بر صغیر کے طول و عرض میں پھیل گئے اور آج

۱- ”آئینہ دارالعلوم دیوبند“ اپریل ۱۹۹۵ء ص ۶ کفیل احمد قاسمی

۲- ”ماہی“ فکر اسلامی“ ہستی دسمبر ۱۹۹۷ء ص ۸۔

اس شعبہ کے ہزاروں فارغ التحصیل دنیا کے مختلف حصوں میں عربی کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔  
عربی زبان کا بہترین ذوق، اسباق میں پابندی، اساتذہ کرام کے ساتھ ادب و احترام کا سلوک اور امتحانات میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی کے سبب تمام ہی اساتذہ آپ کی قدر کرتے اور خصوصی توجہ فرماتے۔

ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن فرماتے اور اپنی نشست و برخاست اور گفتار و رفتار میں عام طلبہ سے الگ نظر آتے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ اور گفتگو میں سنجیدگی رہتی کم آمیز اور یکسوئی پسند طبیعت کے مالک تھے مگر دوستوں سے ملتے تو پوری بشاشت سے پیش آتے۔ بلکہ اپنے دوستوں میں بڑے ظریف، سبک روح، خوش مذاق تھے لیکن بایں ہمہ ان کے مزاج میں بھی ایک علمی شان ہوتی تھی۔ متانت و ظرافت کا اتنا حسین و معتدل امتزاج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ کی متین ظرافت اور لطیف مزاحی کا ایک واقعہ درج ذیل ہے: (۱)

”ایک مرتبہ آپ نے ایک طالب علم ساتھی مولانا روح اللہ کو عربی لباس پہنایا اور اس کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے ساتھی کے پاس لے گئے۔ مولانا روح اللہ کا تعارف بحیثیت عرب مہمان کرایا اس نے بھی اسے عرب مہمان سمجھ لیا اور ان کی خاصی میزبانی کی جس پر کافی پیسے خرچ کر ڈالے، ضیافت کے بعد جب یہ راز کھلا تو محفل میں ایک زوردار قہقہہ لگا اور یہ واقعہ کئی دنوں تک سامانِ فرحت و انبساط بنا رہا“ (۲)

مولانا کی زندگی کا ایک مشغلہ دارالعلوم کی طالب علمانہ سیاست میں حصہ لینا بھی تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں یوپی کے طلباء کا ایک کتب خانہ دارالمطالعہ کے نام سے قائم تھا جس کے عہدیداران کا سالانہ انتخاب ہوتا تھا اور طلباء اس میں حصہ لیتے، مولانا کے بخاری شریف کے سال کے دوران انتخاب کے موقع پر مشرقی اور مغربی یوپی کے طلباء میں اہم مناصب حاصل کرنے پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر مولانا وحید الزماں صاحب اور ان کے دست راست اور مشیر کار مولانا حکیم حفیظ الرحمن دھام پوری اپنے ہم مزاج طلباء کے ساتھ میدان میں آگئے انتخابی سرگرمی شروع ہوئی اور مولانا کیرانوی صدارت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

دوسری طرف آپ کی معاشی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس کے لئے آپ ہمیشہ فکر مند رہتے اور اس گتھی کو سلجھانے کی فکر میں لگے رہتے۔ مولانا ریاست علی بجنوری آپ کی اس حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”دارالعلوم میں آپ کی طالب علمی کا زمانہ مالی اعتبار سے بڑی عسرت کے گزرا، گھر کے حالات کمزور تھے زمینیں اور باغات سب ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ذریعہ معاش تقریباً ختم ہو گیا تھا مولانا کو اکثر اس کی فکر لاحق رہتی۔ آپ اردو عربی کے اچھے کاتب تھے اسی فن سے اپنی ضروریات پوری کرتے۔ کچھ بچا کر گھر کے اخراجات میں تعاون بھی کرتے، درس میں پابندی کرنا اور پھر

۱- ماہنامہ ”دینی مدارس“ دہلی اپریل ۱۹۹۵ء ص ۸-۱۰۔

۲- ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص



کتابت سے روزی پیدا کرنا دراصل یہ مولانا ہی کی ہمت کا کام تھا ورنہ اتنی جفاکشی ایک نحیف الجشہ طالب علم کے لیے بہت مشکل بات تھی مگر وحید الزماں واقعی وحید زماں تھے وہ نامساعد حالات سے کبھی نہیں گھبرائے۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنا جانتے تھے مشکلات سے لڑنا جانتے تھے ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بیحد ذہین اور جری تھے ان کی ذہانت انھیں نئی راہ دکھلاتی تھی اور مسلسل حرکت میں رکھتی تھی“ (۱)

بہر حال دورہ حدیث کا سال اپنی تمام تعلیمی و غیر تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ختم ہوا اور مولانا کیرانوی نے دورہ حدیث سے فارغ ہو کر کچھ فنون وغیرہ کی کتابیں لے کر طالب علمی کی زندگی کو باقی رکھنے کا ارادہ کیا مگر معاشی پریشانیوں کے باعث ممکن نہ ہو سکا اور آپ دارالعلوم میں مستقل قیام نہ کر سکے کبھی دہلی کبھی دیوبند بالآخر طالب علمی کی زندگی کو خیر باد کہنا ہی بہتر سمجھا۔ (۲)

## دارالعلوم دیوبند سے وابستگی سے قبل

دارالعلوم سے فارغ ہوئے تو آپ کے لئے مزید الجھنیں پیدا ہو گئیں کیونکہ ایک طرف تو معاشی پریشانی دوسری طرف بیکاری۔ لہذا آپ نے دہلی کا رخ کیا اور ہاں پر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہو گئے اور ان کے ساتھ بڑی کافر نسوں وغیرہ میں جانے کا موقع ملا اور بہت سے بڑے لوگوں سے متعارف بھی ہوئے چنانچہ مولانا خود بیان کرتے ہیں:

”وہاں مولانا کی معرفت سے حکومت ہند کے دفتر خارجہ میں آنا جانا ہوا، مصر کی انقلابی کونسل کے رکن اور موجودہ قومی اسمبلی کے اسپیکر انور السادات ۱۹۵۳ء میں سرکاری دورہ پر آئے تو ڈاکٹر سید محمود نے مجھ ہی کو ان کا ترجمان مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت ہندوستان کی وزارت خارجہ میں ریاستی وزیر تھے اس ملاقات کے دوران میں نے انور السادات سے عرض کیا کہ ہندوستان اور مصر میں کلچرل تبادلہ ہونا چاہیے۔ اس سے انھوں نے اتفاق کیا، چنانچہ اس کے بعد انھوں نے شیخ عبدالمنعم النمر کو ہندوستان بھیجا۔ شیخ سے ابتدائی خط و کتابت کا کام میں نے ہی انجام دیا تھا، اس کے بعد میری ملاقات ڈاکٹر مصطفیٰ کامل قدوائی سے ہوئی انھوں نے ہندوستان میں سعودی عرب کے سفارتخانہ میں ایک بہت اچھی جگہ کے لئے از خود میرا تقرر کر دیا مگر مجھے اس قسم کی ملازمتوں کا کبھی شوق نہیں تھا اس لئے میں نے اسے قبول نہیں کیا“ (۳)

۱- مولانا ریاست علی بجنوری (استاد حدیث دارالعلوم دیوبند) بالشانہ۔

۲- تفصیل کیلئے دیکھئے ”میرا یاد مجھ سے بچھڑ گیا“ (مقالہ قاضی مجاہد الاسلام) ترجمان دارالعلوم خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۵۱-۵۲

۳- ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۶۰۔

۱۹۵۶ء میں ۹ افراد پر مشتمل ایک سرکاری خیر سگاری وفد (گڈویل مشن) سعودی عرب گیا جس میں آپ کو بحیثیت ترجمان شامل کیا گیا اور وہاں پر بھی سعودیہ کے بڑے بڑے عہدیداران سے ملاقات ہوئی اور یہ وفد کامیابی کے ساتھ ہندوستان واپس آیا۔ سعودیہ سے واپسی کے بعد محمد احمد کاظمی (مرحوم) ایم پی کی کتاب ”تقسیم ہند اور مسلمان“ کا عربی ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود آپ کی معاشی حالت میں کوئی خاص سدھار نہیں ہوا اور آپ کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ آپ نے ان حالات کے باوجود کسی پر اپنے احوال کو ظاہر نہیں ہونے دیا بقول مولانا ابوالحسن بارہ بنگوی:

”مولانا کا دور ابتلاء یا عملی زندگی کا ابتدائی دور نہایت پریشان کن تھا اس کے باوجود مولانا

انتہائی خندہ پیشانی سے ان کو سلجھانے کی کوشش میں لگے رہے اور اپنی خودداری اور غیرت نفسی پر کبھی آنچ تک نہیں آنے دی، ان کی زندگی میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ اضطراری حالت کے وقت بھی ان کے قدم کبھی لرزہ بر اندام نہیں ہوئے۔ جسمانی تکلیف اور بیماری میں بھی یہی شان تمکین ان کی اس درجہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی تکلیف کو کبھی زبان سے بیان کرنا پسند نہیں فرماتے تھے“ (۱)

حالات کی ناسازگاری کے باوجود آپ نے کبھی نہ تو اپنی معیار زندگی میں کوئی تبدیلی گوارہ کی اور نہ ہی مادی منفعت کے لئے کسی کے سامنے جھکے آپ کی خودداری کا ایک واقعہ پروفیسر بدرالدین الحافظ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”جامعہ ملیہ کی یوم تاسیس کے موقع پر مولانا محمد علی جوہر ہال کی آرائش کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں نے اس کی آرائش کے لئے چند اخلاقی آیات اور احادیث کے تراجم کے بڑے بڑے چارٹس لکھوانے کا ارادہ کیا تو کتابت کے لئے مولانا کیرانوی سے درخواست کی اور انھوں نے چند شرائط کے ساتھ منظور کر لیا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں جامعہ آؤں گا تو تمہارے کمرے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر کام کروں گا مجھے کام دینے اور لینے کا اختیار صرف تمہیں ہی ہوگا۔ کسی استاد یا افسر کو مجھ سے باز پرس کرنے کا حق نہ ہوگا۔ کام کا معاوضہ لینے کے لئے کسی مدرس یا افسر کے پاس نہ جاؤں گا کام ختم ہونے پر آپ فوراً ادائیگی کر دیں گے اور میں حسب قاعدہ رسید لکھ دوں گا۔ لہذا آپ نے بہت ہی عمدہ اور خوبصورت کتابت کی جس کی تقریباً بیس پچیس سال تک نمائش ہوتی رہی“ (۲)

اسی دوران آپ نے چھوٹی چھوٹی تقریباً سات کتابیں تصنیف کی، جن میں آخرت کا سفر نامہ، شرعی نماز، انسانیت کا پیغام اچھا خاوند، اچھی بیوی، خدا کا انعام، اسلامی آداب۔ ان کتابوں کے حقوق اشاعت فروخت کر کے کافی حد تک حالات کو سدھارنے کی کوشش کی لیکن ان سب کے باوجود دہلی میں معاشی گتھی سلجھتی نظر نہ آئی تو آپ نے پھر دیوبند کی طرف کوچ کیا یہاں پہنچ کر اپنے چند رفقاء کے ساتھ مل کر دارالفکر نامی ادارہ کی بنیاد ڈالی جس کے تحت عربی انگریزی زبان کی کلاسیں جاری کیں اسی کے ساتھ لغت کے ادھورے کام کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور ”القاموس الجدید“

۱- ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۶۷۔

۲- ”ان کی یادوں کے سفینے“ مقالہ پروفیسر بدرالدین الحافظ - ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۹۵۔

کے کاموں کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا اور پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گئے اور کافی جدوجہد کے بعد اس کام کی تکمیل کر ڈالی اور اسی ادارہ کے تحت اس کی اشاعت بھی ہوئی۔ دارالفکر کے قیام کے بعد آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایک معیاری دارالکتب قائم کیا جائے اور اس کے ذریعہ سے ایسی کتابوں کی اشاعت ہو جن کے مضامین کتابت، طباعت اور ڈیزائن کے زیور حسن سے آراستہ ہوں۔ اس کام کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ دیوبند کے ایک متمول عالم مولانا شوکت علی خاں مرحوم بھٹے والے اس مکتبہ کے قیام کے لئے راضی ہو گئے، سب سے پہلے مولانا چھوٹی چھوٹی کتابیں منظر عام پر لائے۔ یہ کتب بے حد مقبول ہوئیں مکتبہ نظامیہ کے قیام اور اس کی معیاری کتب کو دیکھ کر دوسرے تاجران کتب کے سر پر خطرہ منڈلانے لگا کہ اس جدید مکتبہ کی تاسیس سے ان کے چراغ مدھم نہ پڑ جائیں۔ پُراسرار طریقہ پر مولانا کے خلاف سازشیں شروع کر دیں، مولانا شوکت علی خاں کے دل میں شکوک و شبہات کے بیج بو کر اس شجر ممنوعہ کو جڑ سے قطع کر دیا۔ مولانا اس مکتبہ کے بند ہونے سے سخت غمگین ہوئے کیونکہ اس مکتبہ کی محنت کے لئے دن رات محنت کی تھی۔ (۱)

عربی زبان و ادب کے شائق طلبہ کو دن کے دوسرے پہر میں مفت تعلیم دیتے تھے۔ تعلیم دینے کا انداز نہایت دلکش ہوتا تھا۔ ہر مبتدی طالب علم سے مسکرا کر فرماتے کہ مولانا آپ بتائیے اس جملہ کے معنی کیا ہوں گے، مولانا کی تعلیم کے انداز اور جدید عربی کے لہجہ سے متاثر ہو کر یہ بات طلباء میں عام طور پر گشت کرنے لگی کہ عربی زبان کی مہارت میں مولانا وحید الزماں صاحب کا دارالعلوم میں کوئی ہمسر نہیں ہے۔

مولانا کی روز افزوں ترقی سے کچھ اہل علم حسد کی بیماری کا شکار ہو گئے اور مولانا کو تقریر و تحریر کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے باد مخالف کے جھونکوں کی کبھی پرواہ نہیں کی اور ناگفتہ بہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ دارالفکر میں کھڑکی کے راستے دھمکی آمیز خطوط لکھ کر ڈالے گئے۔ دشمن عناصر کی یہ پوری کوشش تھی کہ مولانا دیوبند سے چلے جائیں۔ انھیں پورا یقین تھا کہ مولانا کا علمی آفتاب ضرور نصف النہار پر تاباں ہوگا اور ہمارے چراغ اس کی روشنی میں معدوم ہو جائیں گے۔ ان کی بھرپور کوشش تھی کہ اس آفتاب نو کو گہن لگ جائے۔<sup>۲</sup> سید احمد راپوری دارالفکر کے سلسلے میں مولانا کی قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”راقم السطور نے مولانا سے بہت کچھ سیکھا۔ ۱۹۶۲ء کے اوائل میں میری رہائش گاہ دہلی میں تشریف لائے، میرے خط نسخ کے نمونے کو دیکھ کر بہت پسند فرمایا اور خواہش ظاہر کی کہ ایک مصری قرآن کریم کی کتابت لیتھو میں کر دوں اور یہ کام دیوبند میں رہ کر کرنا ہے۔ مولانا سے میں نے عرض کیا کہ خطوط عربیہ پر ریسرچ کر رہا ہوں اور آثار قدیمہ جا کر خطوط کی تحقیقات کر رہا ہوں کیونکہ دہلی کے دور اسلامی کے کھنڈرات بکثرت ہیں، مولانا نے فرمایا کہ دیوبند میں رہ کر بھی یہ کام

۱- مولوی عبدالرؤف عالی (پیشکار وقف دارالعلوم دیوبند) بالمشافہ

۲- تفصیل کیلئے دیکھئے ”ندائے دارالعلوم دیوبند“ مئی ۱۹۹۵ء ص ۴۷

ہو سکتا ہے آپ دارالفکر میں قیام کریں۔ کتابت کے علاوہ اپنی تحقیقات کا سلسلہ بدستور جاری رکھیں۔ میں مختلف خطوط کے نمونہ اور ان سے متعلق مضامین مہیا کرنے کی پوری کوشش کروں گا مولانا نے دارالفکر میں موجود عربی اخبارات و رسائل کے بارے میں اجازت دے دی کہ جس مضمون اور عربی خط کے نمونہ کی ضرورت ہو فوراً تراش لوں۔ میں نے دارالفکر میں آٹھ ماہ قیام کیا اور مولانا سے اس دوران بہت کچھ سیکھا، مثلاً انتہائی غیر ضروری گفتگو سے احتراز ہر وقت کام، کام کے علاوہ فرصت کے اوقات میں مطالعہ اور اس کا ماحصل لکھنا، میں دارالفکر کے قیام سے قبل خطِ نستعلیق، خطِ نسخ اور کچھ ثلث لکھ لیتا تھا۔ مولانا کے فیضان سے خطِ رقعہ، خطِ دیوانی اور خطِ کوفی میں طاق ہو گیا۔“ (۱)

دارالفکر کی معلّیٰ مولانا کا اول و آخر ہی ثابت نہیں ہوئی بلکہ عربی زبان کے مطالعہ میں مزید اضافہ کا موجب بنی عربی ادب کے ساتھ اس کی لغت اور محاوروں سے شغف مولانا کی غیر معمولی خود اعتمادی کا سبب بنا۔ مولانا طالب علمی کے زمانے میں عربی اخبارات سے نئے اور اہم الفاظ چن لیا کرتے تھے اور انھیں تحریری طور پر محفوظ بھی کر لیا کرتے تھے۔ دارالفکر میں عربی زبان و ادب کی کلاسوں نے عربی زبان و ادب سے عام طلبہ کی دلچسپی میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر جدید عربی اردو اور اردو عربی لغت کی ضرورت محسوس کی گئی تو مولانا نے اپنی سابقہ استعداد اور ذخیرہ کو سامنے رکھ کر یہ لغتیں مرتب کر دیں۔

آزادی کے بعد تقسیم ملک کے باعث مسلمان بہت ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ اپنے حقوق کے لئے آواز تک نہیں اٹھا سکتے تھے۔ علاوہ ازیں فرقہ وارانہ فسادات نے رہی سہی کسر بھی ختم کر دی تھی اور ان کو بالکل ناکارہ اور مفلوج بنا کر رکھ دیا تھا۔ حکومتِ وقت بھی ان کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ پھر مسلمانوں میں دین سے بے رغبتی بھی عام ہوتی جا رہی تھی کابلی اور ناامیدی کا دامن مسلمانوں نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر مولانا بہت پریشان رہتے تھے۔ گھر گھر جا کر تبلیغ کرنا مولانا کے بس کی بات نہیں تھی ان حالات میں مولانا کے ذہن میں وہ منصوبہ آگیا جس کو سرسید نے اپنایا تھا اور انھوں نے ”تہذیب الاخلاق“ کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی منصوبہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ نے قلم کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی اور حکومت کی کوتاہیوں کو بار بار عوام تک پہنچانے کی ذمہ داری لی جس سے لوگوں کو احساس ہوا کہ حکومت کی پالیسی مسلمانوں کے سلسلے میں کیا ہے۔ مسلمانوں پر کیا کیا ظلم ہو رہے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کے دینی جذبہ کو ابھارنے کے لئے آپ نے ادارہ ”دارالفکر“ کے تحت ہی ایک ماہنامہ ”القاسم جدید“ کا اجراء کیا یہ رسالہ تقریباً دو سال تک برابر جاری رہا اور اس نے اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کی لیکن اسے بد قسمتی کہیں یا فیصلہ خداندی

کہ حالات سے مجبور ہو کر اس رسالہ کو بند کرنا پڑا۔ (۱)  
لیکن مولانا وحید الزماں وہ شخص تھے جنہوں نے حالات سے سمجھو تا کرنا نہیں سیکھا تھا اور مایوسی نام کا لفظ ان کی  
ڈکشنری میں نہیں تھا وہ ہمیشہ متحرک نظر آتے تھے۔

## ملی واجتماعی سرگرمیاں

ہر انسان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ معاشرہ میں مصروف اور نمایاں ہوتا ہے کوئی  
بھی انسان شہرت و عبقریت کا تاج پہن کر اس دنیا میں نہیں آتا۔ وہاں اس کے اندر اعلیٰ وارفع بننے کی صلاحیت و  
قابلیت موجود ہوتی ہے، پھر جو شخص ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے، عزم و استقلال اور ہمت حوصلے سے کار نمایاں  
انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے، سماج میں اس کو بلند و اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کی  
شخصیت مشہور ہوتی ہے لیکن دنیا میں کچھ شخصیات مختلف ادوار میں ایسی بھی پیدا ہوتی رہی ہیں جن کی گونا گوں صلاحیتوں  
نے ان کو متعدد خصوصیات کا حامل بنا کر بہ یک وقت کئی کئی میدانوں کے شہسوار ہونے کا شرف بخشا ہے۔ ایسی شخصیات  
کو عموماً عبقری شخصیت کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ مولانا وحید الزماں کیرانوی ان ہی شخصیات میں سے  
ایک تھے۔

مولانا کیرانوی نے جن حالات میں ہوش سنبھالا اور پرورش پائی وہ غلام ہندوستان میں آزادی کے لئے اٹھنے  
والے طوفان کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں نے چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی طرف  
متوجہ کر لیا تھا۔ مولانا نے انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ کر بھاگنے کے حالات اپنی جوانی میں دیکھے، آپ کا تعلیمی دور  
بھی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے متاثر ہوا۔ کیرانہ سے حصول تعلیم کے لئے حیدر آباد جانا اور پھر وہاں سے واپسی میں  
بھی غالباً انہیں حالات کا دخل رہا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا نے دہلی میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی  
(حریت آزادی کے لیڈر) کی معیت اختیار کی۔ چند ہی برسوں کے ساتھ سے مولانا وحید الزماں نے اپنی اعلیٰ ذہانت و  
فطانت کی وجہ سے سیاسی باریکیوں کو دیکھا اور سمجھ لیا۔ اسی زمانہ میں محمد احمد کاظمی ممبر پارلیمنٹ کی کتاب ”تقسیم ہند اور  
مسلمان“ کا عربی میں ترجمہ کیا۔ مختلف مواقع پر مولانا لدھیانوی کے ترجمان کی حیثیت سے عرب سفراء اور مختلف  
سیاستدانوں سے گفتگو کا موقع حاصل ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نو جوانی ہی میں سیاست کے نشیب و فراز اور  
رموز و اسرار سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ اس کے علاوہ اپنے استاد مرحوم مولانا حسین احمد مدنی کی صحبت سے کافی  
مستفید ہوئے اور ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ تقریباً اسی طرز پر زندگی گزارنے کی کامیاب کوشش کی۔  
مولانا جب سن شعور کو پہنچے اس وقت تقسیم ہند کی وجہ سے ہر چہار طرف اضطراب و کشیدگی کا ماحول تھا،

مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی منظم سازش کی جارہی تھی۔ فرقہ واریت کا زہر عوام کے دماغوں میں گھول دیا گیا تھا۔ چونکہ شروع سے ہی آپ مسلمانوں کے ملکی و بین الاقوامی احوال و معاملات میں خاص دلچسپی کا اظہار فرماتے۔ اس لئے مسلمانوں کے خلاف کوئی بھی کام ہوتا آپ اس کے خلاف آواز اٹھاتے اور حکومت کی پالیسیوں کو اپنے مضامین میں تنقید کا نشانہ بناتے اگرچہ مولانا نے زندگی بھر کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی لیکن کبھی بھی آپ سیاسی احوال سے غافل نہیں رہے۔ ملی سرگرمیوں میں نہ صرف حصہ لیتے رہے بلکہ اکثر و بیشتر قائدانہ رول ادا کیا۔ آپ کی سیاسی بصیرت شروع سے ہی بہت وسیع تھی۔ پھر چونکہ آپ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھے اور صحافت کے لئے سیاسی معرفت ضروری ہے۔ ہمیشہ آپ کی صحافت کا محور قومی و ملی مسائل اور مسلمانوں کی اصلاح کے ارد گرد گھومتا رہا۔ آپ نے قوم کو بیدار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تعلیمی میدان میں آپ نے درجنوں کتابیں مرتب کر ڈالی۔ اس کے علاوہ دارالعلوم میں تدریسی مقام پر فائز ہوئے تو وہاں پر عربی کا غلغلہ بلند کر دیا اور طلبہ کے اندر تہذیبی اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کر دی، دارالفکر نامی ادارہ قائم کر کے عربی زبان و ادب کا رجحان طلبہ کے اندر پیدا کر دیا۔ دارالفکر نامی ادارہ قائم کر کے عربی زبان و ادب کا رجحان طلبہ کے اندر پیدا کر دیا اور ساتھ ہی عوام کی اصلاح کے لئے ”ماہنامہ القاسم جدید“ جیسا رسالہ جاری کیا۔ دارالعلوم سے وابستہ ہوئے تو وہاں پر عربی رسالہ ”دعوة الحق“ جو دارالعلوم کا ترجمان اور اس کے موقف کا پاسبان اور نقیب ثابت ہوا اس کے ذریعہ عربوں کو بیدار کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور مسئلہ فلسطین کو عالمی مسئلہ بنانے میں مدد فرمائی۔ دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر نئی تعمیرات اور قدیم عمارتوں کی مرمت کر کے دارالعلوم کو ایک قلعہ بنادیا۔ دوران انقلاب ایک قائدانہ رول ادا کر کے اس مہم کو بڑی عمدگی کے ساتھ فتح کیا۔

غرض یہ کہ کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی حیثیت متنازعہ نہ رہی ہو اور ہر موقع پر کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو۔ جس طرف بھی قدم رکھ دیا اس کی نوعیت ہی بدل ڈالی۔ اس لئے اکثر مدارس کے منتظمین کی یہ خواہش رہتی کہ مولانا کم از کم ایک بار وہاں کا معائنہ ضرور کریں تاکہ وہاں کی تعلیمی پالیسی آپ کی نوعیت کے اعتبار سے مرتب کی جاسکے۔ (۱)

### جمعیت علماء ہند اور مولانا کی اس سے وابستگی

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان میں آزادی کی تیز سے تیز سرگرمیاں لے کر نمودار ہوئی۔ شیخ الہند کی تحریک جسے تاریخ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں تشدد اور طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی آخری تحریک تھی اس وقت تک اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ کار دریافت نہیں ہوا تھا۔

۱- تفصیل کیلئے دیکھئے ”مولانا وحید الزماں کی سیاسی بصیرت“ مقالہ عبدالرحمان عابد ترجمان دارالعلوم دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۵۱۷-۵۲۲

لیکن جب شیخ الہند طویل اسارت کے بعد مالٹا سے ہندوستان واپس تشریف لائے اس وقت ملک میں سیاسی بیداری کی ایک تیز لہر چل پڑی تھی اور تشدد کا راستہ بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔ سب لوگ اس بات سے وقف ہو چکے تھے کہ طاقت کے بل پر انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد نہیں کرایا جاسکتا۔ لہذا یہ طے کیا گیا کہ انگریزی حکومت کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے اس پر احتجاج اور تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ اس طریقہ جنگ میں کامیابی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اسی راہ پر چل کر ہندوستانی بھی اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو حاصل کر سکتے ہیں اسی طریقہ جنگ اور عدم تشدد کے ہتھیار سے ظلم و جبر کی طاقت اور برطانوی حکومت کو وطن کے سر زمین میں شکست دی جاسکتی ہے۔

چنانچہ تمام جماعتوں کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہو گیا اور علماء ہند نے بھی اسی طریقہ کو مناسب سمجھا اور نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی کانفرنس کی کارروائیوں سے فراغت کے بعد کانفرنس میں شریک علماء کی ایک علیحدہ مجلس مشاورت مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ علماء کی ایک مستقل تنظیم ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کی رہنمائی اور جنگ آزادی جاری رکھنے کے لئے ایک مستقل لائحہ عمل کی تشکیل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انجام پاسکے۔ اس مجلس مشاورت میں دو درجن کے قریب علماء شریک ہوئے اس تنظیم کا نام ”جمعیت علماء ہند“ طے کیا گیا اور اس کے عارضی صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور ناظم حبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی منتخب کئے گئے۔ اس تنظیم کے پیش نظر چند مقاصد تھے۔ خاص مقصد انگریزی حکومت کے خلاف پورے ملک میں ذہنی و فکری انقلاب پیدا کر دینا جمعیت علماء ہند کا نقطہ نظر تھا۔ اس لئے وہ اپنے ہر اجلاس میں یہ سبق دہراتی تھی جس کو اس نے روزِ اول سے ہی یاد کیا تھا۔ (۱)

مولانا وحید الزماں کا جمعیت علماء ہند سے تعلق اور وابستگی تو پیشینی تھی۔ ان کے والد محترم مولانا مسیح الزماں صاحب کانگریس اور جمعیت کے فعال رکن تھے۔ انھوں نے تحریک آزادی کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ جیل بھی گئے ان کی فکری و ذہنی پختگی اور صلابت رائے کا ثبوت یہ ہے کہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ”مسلم لیگ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے اہم ترین رکن و روح رواں بھی تھے۔ نظریات کے اختلاف کے باوجود ان کا ذاتی اور شخصی تعلق مولانا مسیح الزماں صاحب سے اس درجہ کا تھا کہ جب بھی آپ کیرانہ تشریف لاتے تو قیام مولانا مسیح الزماں صاحب ہی کے گھر پر ہوتا۔ اس دور کی سیاست آج کی ”مفاد پرستی“ اور ”مصلحت بینی“ کے جراثیم سے پاک تھی۔ ان کی خلوت و جلوت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ اسٹیج پر جو کہتے وہ عملاً کر دکھاتے۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”جمعیت“ سے وابستگی و ذہنی تعلق مولانا وحید الزماں کو اپنے والد محترم سے ورثہ میں ملا تھا۔

باوجود یہ کہ دارالعلوم کی انتظامیہ اور جمعیت علماء ہند کے اعلیٰ عہدیداروں کے درمیان ذہنی اور فکری اختلاف تھا۔ لیکن مولانا وحید الزماں نے جمعیت کی رکنیت قبول کر کے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا حالانکہ دارالعلوم کے مدرسین

و ملازمین جمعیت کی رکینٹ قبول کرنے سے گریز کرتے تھے تاکہ وہ لوگ آپسی اختلاف کا شکار نہ بن جائیں۔ مولانا کی جمعیت کی رکینٹ بھی خطرات سے خالی نہ تھی لیکن آپ نے ان چیزوں کی پرواہ نہ کی کیونکہ آپ جو بھی کام کرتے عزم و استقلال کے ساتھ کرتے۔ بڑی حد تک یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی جگہ کسی اور مدرسین یا دارالعلوم سے وابستہ کسی عہدیدار کو یہ پیش کش کی جاتی تو وہ قبول نہ کرتا۔ لیکن مولانا دونوں جماعتوں کے ساتھ وابستہ رہ کر دونوں جگہ اپنی ذمہ داریاں اس خوبی سے انجام دیں کہ خراج تحسین وصول کیا اور اپنی وہ حیثیت و مقام بنایا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی انگشت نمائی کی جرأت نہ ہو سکی۔

آپ ہمیشہ متحدہ قومیت اور اتحاد و یکجہتی کے علمبردار رہے۔ اپنے موقف میں پختگی قول و عمل میں یکسانیت اور صداقت کا بے ٹوک برملا اظہار ان کی طبیعت ثانیہ رہی۔ جمعیت کے جلسوں میں بے باکی اور حق گوئی کی زریں مثال مولانا کی ذات عالی تھی۔ کسی لیڈر کسی امیر اور صاحب اقتدار کی کبھی پرواہ نہ کی۔ جمعیت سے وابستگی کے بعد آپ کی سرکردگی میں وہاں ”مرکز دعوت الاسلام“ کا قیام ہوا آپ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ عہدہ قبول کرتے ہی آپ نے اپنی ذمہ داریوں کا دائرہ کار متعین کر لیا اور کام کا خاکہ بنالیا انھوں نے اس شعبہ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا پلان بنایا۔ اس دور ان کسی ضروری کام سے بنارس گئے وہاں مولانا اسیر اور وی سے ملاقات ہوئی۔ اس سے قبل مولانا اسیر اور وی نے ایک کتاب ”جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار“ کے نام سے لکھی تھی جس کی اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا۔ مولانا کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو آپ نے فوراً مسودہ طلب کیا۔ مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا کہ میں اس کو ”مرکز دعوت الاسلام“ کی طرف سے شائع کرانا چاہتا ہوں وہ مسودہ لے کر واپس آگئے تقریباً چار مہینہ کے اندر ہی اس کو شائع کرادیا۔ حالانکہ اتنے کم وقت میں کتابت وغیرہ بڑی مشکل چیز ہے اسی سال جمعیت علماء ہند کی تاریخ مرتب کرنے کی تجویز رکھی اور یہ کام بھی مولانا اسیر اور وی کے سپرد کر دیا۔ آپ نے ایک سال بعد ہی تاریخ جمعیت علماء ہند“ کو شائع کرادیا اسی طرح مولانا عبد الحفیظ رحمانی کی کتاب ”توریت اور یہود اپنے آئینہ میں“ کو بھی ”مرکز دعوت الاسلام“ کی طرف سے شائع کرایا۔ اس طرح سے آپ کی سرپرستی و نگرانی میں متعدد کتابیں ”مرکز دعوت الاسلام“ سے شائع ہوئیں۔ (۱)

جمعیت علماء ہند نے اندرون ملک اپنی ترجمانی کے لئے ”الجمعیت“ کے علاوہ جب عرب دنیا میں اپنے تعارف اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو عرب دنیا کے سامنے پیش کرنے کا قصد کیا تو مولانا مرحوم سے عربی جریدہ نکالنے کی درخواست کی گئی۔ جمعیت سے فکری، عملی اور موردی و ابستگی کے سبب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود یہ بارگراں بھی اپنے کندھوں پر اٹھایا اور ”الکفاح“ نامی پندرہ روزہ عربی اخبار کا اجراء کیا جو نہایت پابندی کے ساتھ ایک عرصہ تک نکلتا رہا اور عرب دنیا میں جمعیت کی ترجمانی کرتا رہا تا آنکہ جمعیت نے خود ہی اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ (۲)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان اسلام“ بنارس اپریل ۱۹۹۵ء مولانا اسیر اور وی ص ۷-۹۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم دہلی“ خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء مقالہ مولانا فصیح الدین دہلوی ص ۳۹۳۔



## جمعیت سے علیحدگی

مولانا وحید الزماں کا مزاج کبھی سیاسی نہیں رہا ہے اور نہ ہی وہ کسی سیاسی جماعت میں شریک ہوئے اس لئے موقع پرستی ان کے مزاج میں نہیں تھی سیاست سے ان کا تعلق صرف مسلمانوں کی ہمدردی کے لئے تھا۔ لہذا جب کسی بھی جماعت کی طرف سے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کوئی بات سامنے آئی تو اس پر نقد و تبصرہ ضرور کرتے۔ پھر چونکہ جمعیت علماء ہند آزادی کے بعد کانگریس کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ کانگریس کا نظریہ جمعیت کا نظریہ بن گیا اگرچہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور کانگریس کے خلاف کسی ممبر کو آواز اٹھانے کے اجازت دی گئی۔ حالانکہ آزادی سے قبل جمعیت کا جو موقف ہوتا تھا کانگریس میں اس کی مخالفت کی ہمت نہیں تھی۔ کیونکہ جمعیت میں اس وقت ہر ممبر کو مکمل حق رائے دہی کی آزادی تھی۔ جمعیت کا ہر شخص کسی بات پر بھی نقد و تبصرہ کر سکتا تھا۔ جب کہ آج جمعیت کے احوال اس کے برعکس ہو گئے۔ جمعیت کا کوئی ممبر بھی جمعیت کے موقف کے خلاف کوئی آواز نہیں نکال سکتا۔ ایک طرح سے جاگیر دارانہ نظام جمعیت پر نافذ ہو گیا ہے۔ صدر جمعیت کی رائے سب ممبران کی رائے ہوتی ہے۔ خواہ کوئی اس سے متفق ہو یا مخالف۔

بہر حال مولانا وحید الزماں ہمیشہ آزادانہ طور پر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کے ہمیشہ مخالف رہے۔ ان کے نزدیک قومی مفاد ذاتی مفاد سے بڑھ کر تھے۔ جمعیت کے ممبر ہوتے ہوئے بھی وہ مکمل آزادانہ کام کرتے تھے اور اپنی رائے کا اظہار کھل کر کرتے تھے۔ اس میں وہ جمعیت کے پابند نہیں تھے جب کہ یہ چیز صدر محترم کے لئے ناقابل برداشت تھی اس سے ان کی کانگریس میں پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ دونوں حضرات اسی متضاد مزاج کے ساتھ ایک عرصہ سے کام کر رہے تھے۔ اس لئے کہ مولانا کے مزاج کو برداشت کرنا صدر محترم کی مجبوری تھی کیونکہ اگر شروع سے ہی اختلاف رونما ہو جاتے تو دارالعلوم کے محاذ پر مولانا کے بغیر فتیابی ناممکن تھی۔ لہذا ایک عرصہ تک مولانا کے مزاج کو برداشت کرتے رہے۔ خود مولانا کی اس وقت حیثیت بھی ایسی نہیں تھی جس کو عالمی شہرت حاصل ہو۔ لہذا وہ بھی بسا اوقات مصلحت اندیشی سے کام لیتے رہے لیکن جب دارالعلوم کی فتح یابی کا سہرا مولانا کے سر پر بندھا اور آپ کی حیثیت صدر جمعیت کے برابر تک پہنچ گئی تو آپ نے مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر ہر موضوع پر کھل کر بولنا شروع کر دیا اولاً تو آپ کی شخصیت کا قد اونچا ہونا ہی صدر محترم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ پھر جمعیت کے حالیہ موقف سے روگردانی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

پھر چونکہ جمعیت میں مولانا کے مزاج کے دوسرے لوگ بھی تھے۔ جن کو اندر ہی اندر یہ فکر دامن گیر رہتی کہ جمعیت کی بنیاد جن اصولوں پر تھی آج ان میں سے کسی کا نام و نشان تک جمعیت میں باقی نہیں ہے۔ پہلے جمعیت مسلمانوں کی قائد جماعت تھی ہر محاذ پر سب سے آگے دکھائی دیتی تھی، لیکن آج سوائے کانگریس حکومت کی غلط پالیسیوں کی پردہ پوشی اور اس کے لئے مسلم ووٹ تیار کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہا اس لئے آج جمعیت عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔

بہر حال یہ تمام مسائل ممبران کے زیر بحث رہتے اور کچھ ممبران جمعیت میں سدھار کے خواہش مند بھی نظر آتے تھے۔ لیکن جب بابر مسجد اجماع کا مسئلہ سامنے آیا اور کانگریس نے بابر مسجد کا تالا کھول دیا تو اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک لہر دوڑ گئی چاروں طرف جلسے جلوس اور اجتماع کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ایسے وقت میں بھی جمعیت نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا اور نہ ہی کانگریس حکومت کی مذمت کرتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان حالات کے پیش نظر چند ممبران جمعیت نے خود ہی ان شہروں کا دورہ کیا جہاں فسادات کی آگ نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ عوام سے چندہ کر کے ان شہریوں تک پہنچانے کی کوشش کی جن کا فسادات نے سب کچھ برباد کر دیا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں کو دلاسا دیا اور حکومت کی برسر عام مذمت کی۔ اس کے بعد چند ممبران نے غازی پور میں ۲۷ دسمبر ۱۹۸۷ء کو جمعیت میں پھیلی کوتاہیوں کو دور کرنے اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو کرنے کے لئے ایک جلسہ بلایا جس میں علماء اور دانشور ان قوم سبھی جمع ہوئے۔ اس اجتماع کو خطاب کرنے والوں میں مولانا ہاشمی، مولانا افضال الحق جوہر قاسمی، مولانا صادق علی قاسمی، مولانا باقر حسین بستوی اور مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے کھل کر بیان کی مختلف لائحہ عمل پیش کئے گئے، علاقہ کے علماء کو ذمہ داری سونپی گئی کہ عوام کے اندر اعتماد پیدا کریں اور ان کے اندر بیداری لانے کی کوشش کریں۔ لیکن اس اجتماع میں سب سے اہم تقریر مولانا وحید الزماں صاحب کی تھی جس کا کافی دیر سے لوگ انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے بولنا شروع کر دیا اور جمعیت کی ایک ایک خامی کو سب کے سامنے بیان کر دیا۔ پھر حکومت کی تمام خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ خلاصہ تقریر یہ تھا:

”ہمیں یقین ہے کہ آنے والی نسلیں ہمیں یاد کریں گی اور ہمارے فیصلوں کی داد دیں گی۔ ہم جب کہتے ہیں کہ ”ملک و ملت بچاؤ تحریک“ کانگریس کی اسپانسر کی ہوئی تحریک تھی تو کچھ لوگوں کی پیشانیوں پر شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو تحریک مرا جی دیسائی کے زمانہ میں چلی تھی۔ اندراجی کے زمانہ میں کیوں نہیں چلی۔ مسائل تو اس وقت بھی وہی تھے اور آج بھی وہی ہیں۔ تحریک کا دوسرا دور چرن سنگھ کی وزارت کے زمانے میں چلا اور جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ چرن سنگھ سوائے ایک مطالبہ کے یعنی فسادات میں ہلاک ہونے والے لوگوں کی جانوں کے معاوضہ کی ادائیگی کے باقی مطالبات مان لئے تھے اور اس کے لئے کابینہ کے اجلاس تک کی مہلت مانگی تھی مگر اس وقت تحریک کے ذمہ داروں نے مہلت نہیں دی اور کہا کہ آپ کابینہ کی منظوری حاصل کرتے رہیے ہم تو تحریک چلائیں گے لیکن پھر جب اندراجی تخت نشین ہو گئیں تو تمام تحریکیں ختم ہو گئیں اور کچھ بھی اس کا حاصل نہیں نکلا“ (۱)

اس طرح مولانا نے تفصیل کے ساتھ جمعیت کی تمام خامیوں کی نشاندہی کی اور تمام شریک لوگوں سے اپیل کی

کہ جمعیت کے کردار کو بحال کرنے کی ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے تاکہ جمعیت اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کر سکیں اور عوام میں دوبارہ اعتماد پیدا کر سکیں۔

لہذا اس اجلاس کے بعد ان ممبران کے خلاف مہم شروع ہو گئی، ضابطہ خلاف ورزی کا الزام عائد کر کے اجلاس میں شریک تمام ممبران کو جمعیت کی ورکنگ کمیٹی سے نکال دیا گیا۔

۹

اس جماعت سے علیحدگی کے بعد کچھ ممبران نے ”ملی جمعیت“ کی بنیاد ڈالی جس کا مولانا وحید الزماں صاحب کو باقاری رائے سے صدر منتخب کیا گیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد آپ نے ذاتی مشغولیات کی بناء پر ملی جمعیت کی صدارت کو چھوڑ دیا لیکن ۱۹۹۱ء میں جب جمعیت علماء ہند میں شدید اختلاف رونما ہوا اور بہت سے ممبران نے صدر جمعیت علماء ہند کی بے راہ روی سے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی جماعت مرکزی جمعیت علماء ہند کے نام سے بنائی تو اس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مولانا وحید الزماں کے سپرد کی گئی۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ مولانا کے سیاسی نظریات کی بنیاد اکابر دیوبند کی اساس پر تھی آپ عوام سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے اور ان کے مسائل و پریشانیوں کو سمجھتے اور دیکھتے تھے۔ اسی لئے ان کی خواہش تھی کہ مسلم رہنماؤں اور اداروں کا تعلق عوام الناس سے براہ راست ہونا چاہیے تاکہ وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں پر بروقت توجہ دی جاسکے۔

مولانا نے کئی جماعتوں سے وابستہ رہنے کے باوجود اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان جماعتوں سے ان کی وابستگی کی بنیاد پر لوگ یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ مولانا کو سیاست میں آنے یا سیاسی سطح پر نمایاں ہونے سے کوئی دلچسپی تھی لیکن یہ قیاس غلط ہے کیونکہ کئی مواقع پر انہیں مختلف کنونشنوں اور جلسوں کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا لیکن انہوں نے اس سے ہر ممکن گریز کیا اور وہ اپنی پوری عمر میں کبھی وزیراعظم کسی وزیر یا سیاست داں سے ذاتی مفاد کے لئے نہیں ملے ان میں سیاسی طور پر خود کو نمایاں کرنے یا اس سے کچھ حاصل کرنے کی قطعی طلب نہیں تھی اگر کبھی سیاسی لوگوں سے ملاقات کرتے تو اس میں عوام اور خاص طور سے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی پیش نظر رہتی۔ (۲)

## وفات

کچھ زندگیاں تو ہوتی ہیں کہ نہ ان کے باقی رہنے کی خوشی ہوتی ہے نہ کسی کو ان کے جانے کا غم وہ باقی رہیں تو کیا اور چلے جائیں تو کیا ان سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے نہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی توقع اور ان کے چلے جانے سے کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسان ان سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ بے شمار لوگوں کو ان سے راحت ملتی ہے وہ اس دنیا میں لوگوں کو بہت کچھ دے رہے ہوتے ہیں۔ اس باغ ہستی کے وہ سینچنے والے اور اس کی خوبیوں و رعنائیوں میں چار چاند لگانے والے ہوتے ہیں اور ان سے آئندہ بھی کچھ امیدیں اور توقعات

۱- مولانا باقر حسین (مہتمم مدرسہ دارالعلوم لہستانی) بالمشافہ۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”پندرہ روزہ خبر دار“ مئی ۱۹۹۵ء معصوم مراد آبادی ص ۳۔

ہوتی ہیں ان کے جانے سے بے شمار امیدوں اور آرزوؤں کا خون ہوتا ہے اور سینکڑوں منصوبے ناتمام رہ جاتے ہیں انھیں دنیا والے روتے ہی ہیں تاریخ شاہد ہے کہ ان پر آسمان وزمین بھی آنسو بہاتے ہیں۔  
ظاہر بینوں کی نگاہ میں وہ ایک فرد کی موت ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک قوم، ایک گروہ، ایک جماعت، اور بہت سے منصوبوں کی موت ہوتی ہے۔ مشہور عرب شاعر عبده بن الطیب نے قیس بن عاصم المنقری انصاری صحابی کا مرثیہ کہتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد..... ولكن بنیان قوم تہدما

ایسی ہی شخصیت مولانا وحید الزماں کی تھی جن کے وصال سے بہت سے کام ادھورے رہ گئے آپ نے جو کام اپنے ذمہ لئے تھے اور انہیں جس محنت و مستعدی سے انجام دیئے تھے اور جس طرح کام کی دھن ان پر سوار رہتی ہر کام کو جلدی سے کرنا چاہتے تھے اس میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے چنانچہ اس کا نزہ ان کے جسم ضعیف پر گرا اور وہ ذیابیطیس میں مبتلا ہو گئے۔ جس نے ان کے کمزور جسم کو اور بھی نحیف و ناتواں کر دیا اور بالاخر آہنی عزم و ارادہ کا وہ آسمان جس نے دارالعلوم میں انقلابی نمایاں کارنامے انجام دیئے جہد مسلسل کے باعث معذور و مجبور ہو گیا۔

ادھر دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد اگرچہ بظاہر آپ صحیح سلامت اور خوش نظر آتے لیکن اندر ہی اندر کافی دکھی بھی رہتے اپنا غم کسی پر ظاہر بھی نہیں کرتے یہ غم آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے ذیابیطیس مرض جس کی شروعات دارالعلوم میں صد سالہ کے موقع پر تعمیر کاموں میں مشغولیت کے باعث ہوئی تھی۔ بسا اوقات اس مرض کا حملہ ہو جاتا تھا بعد افاقہ ہو جاتا تھا جب تک بدن میں جان رہی اس مرض کا مقابلہ کرتے رہے مرض و صحت کا سلسلہ یوں جاری رہا لیکن وفات سے قبل مرض کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ جس سے غذا تو بالکل ہی ختم ہو گئی۔ آپ کو دہلی کے پنت ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا جہاں پر ڈاکٹر خلیل اللہ ماہر امراض قلب نے مکمل معائنہ کیا اور یہ معلوم ہوا کہ گردے تقریباً فیل ہو گئے ہیں وہاں پر علاج ہوا اس سے کچھ افاقہ ہوا تو دیوبند آگئے لیکن دیوبند آتے ہی پھر پہلے جیسی حالت واپس آگئی۔ چنانچہ آپ کو پھر جیون ہسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں پر طبیب، حکیم اور مختلف ماہر ڈاکٹروں نے علاج میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن تدبیر پر ہمیشہ تقدیر غالب رہتی ہے، تمام تدبیریں ناکام ہو گئی اور آپ اپنے تمام شیدائیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

جس طرح دارالعلوم دیوبند کے فرزندِ اولیں اور جہادِ حریت کے سالارِ قافلہ حضرت شیخ الہندؒ کے جنازہ نے دہلی سے دیوبند تک شیدائیوں اور عقیدتمندوں کے درمیان سفرِ آخرت طے فرمایا تھا اسی طرح مولانا وحید الزماں صاحب نے اپنے اسیر کارواں کی یاد تازہ کر دی۔ مولانا کا جنازہ اسی طرح دہلی سے دیوبند لایا گیا اور ہزاروں شیدائیوں، شاگردوں، عقیدتمندوں، محبین اور مخلصین نے احاطہ مولسری میں نودہ کے سامنے آپ کی نماز جنازہ ادا کی آپ کی نماز جنازہ مولانا نعمت اللہ صاحب استادِ دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی اور قبرستانِ قاسمی میں آپ کی تدفین ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ (۱)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم دہلی“ خصوصی شمارہ ۹۹۹۵ء ص ۵۲۳۔

قومی آواز، نئی دہلی ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ء۔

## باب سوم

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم میں تدریس

دارالعلوم کے انتظامی امور میں آپ کا حصہ

دارالعلوم کا سانحہ

دارالعلوم سے مولانا کی علیحدگی

## دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی ناکامی جنگ کے بعد مسلمانوں کی برائے نام حکومت بھی ختم ہو چکی تھی لال قلعہ پر یونین جیک لہر رہا تھا مسلمانوں پر ہر طرح کے ظلم و ستم ہو رہے تھے۔ انکے اوقاف اور مدارس ختم ہو چکے تھے عیسائیت کی تبلیغ کھلے عام ہونے لگی تھی ہر طرف ظلمت ہی ظلمت تھی اس تاریک دور میں ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کا دن تاریخ اسلام اور ہندوستان کی تاریخ میں روشنی کی ایک کرن لیکر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ معمولی سی کرن نور کا چشمہ بن گئی۔ چنانچہ دانشوران قوم اور اکابر علماء امت نے حضرت مولانا محمد قاسم نانویؒ کی رہنمائی میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۶ء کا وہ مختصر سا مدرسہ آج تمام عالم اسلام میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہے اور ایک باوقار اسلامی یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ ایک خالص دینی و مذہبی ادارہ ہے اس کو قائم کئے ہوئے تقریباً ۱۳۵ سال ہو گئے اس مدت طویل میں اس نے دین و مذہب کی ہر طرح کی خدمت کی اور ابلاغ و تبلیغ، احقاق و تحقیق کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں اسکی رزم آرائیاں نہ ہوں تعلیمات اسلامی کو اپنی فطری شکل و صورت میں پیش کرنے اور اسکو عملی زندگی میں دائر و سائر کرنے کی جتنی محنتیں آج سرزمین ہند پر نظر آرہی ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کی رہنمائی ہے، ہند و پاک کے مسلمان اپنی دینی زندگی میں دیوبند کے فضلاء کے احسان مند ہیں انکی تبلیغی و اصلاحی جدوجہد سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بدعات و غلط رسم و رواج کا جنازہ نکلا، عقائد کی درستگی، تبلیغین فرق ضالہ سے مناظرہ ان حضرات کے نمایاں کارنامے ہیں متعدد فضلاء نے میدان سیاست میں قدم رکھا انگریزوں سے مقابلہ کیا اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے قربانیاں پیش کیں سیاسی میدان میں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کیں فضلاء دارالعلوم دیوبند مختلف تحریکوں کا سرچشمہ رہے اور ان تحریکیوں میں ان کی قائدانہ حیثیت رہی۔

علمی و تصنیفی اعتبار سے بھی یہاں کے فضلاء نے عظیم کارنامے انجام دیئے جن میں مفید کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ قدیم علمی ذخیروں کی دریافت مفید اور پر معنی شرح و حواشی اور بے شمار کتابوں کے تراجم شامل ہیں دارالعلوم دیوبند سے اب تک ہزاروں طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں جنہوں نے ملک و بیرون ملک میں نمایاں خدمت انجام دیکر نہ صرف ملت اسلامیہ بلکہ پورے ملک کا نام روشن کیا ہے اور جنگی علمی و تصنیفی خدمت نے عالم اسلام تک سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ان میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں۔  
شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی،

مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا یوسف بنوری، پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی، اور مولانا وحید الزماں کیرانوی وغیرہ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے مادر علمی کا نام روشن کیا اور جن کی خدمات رہتی دنیا تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔ ان میں سے بعض تودارالعلوم دیوبند میں مسند تدریس پر فائز ہوئے اور بعض نے دوسرے مقامات پر اپنی وسعت کے مطابق اسلام کی خدمات انجام دیں (۱)۔

دارالعلوم کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر طویل تحریک اپنے محرک کے ساتھ ادوار میں بنی ہوئی ہوتی ہے۔ تحریک دارالعلوم کے بھی مختلف ادوار ہیں، ایک دور اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا دور ہے دوسرا دور مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب کا دور ہے تیسرا دور قاری محمد طیب صاحب کا دور تھا۔ اور موجودہ دور مولانا مرغوب الرحمن صاحب کا دور ہے۔ ان مختلف ادوار میں متفرق رنگ نظر آتے ہیں لیکن ایک رنگ جس کو قدامت پسندی کا رنگ کہا جاتا ہے ہر دور میں یکساں طور پر دکھائی دیتا ہے اس کو ہر دور کی قدر مشترک کہا جاسکتا ہے لیکن موجودہ دور میں مولانا وحید الزماں کا کارنامہ ان سب سے جدا دکھائی دیتا ہے جس میں ہر نوخیز ذہن سے اٹھنے والے سوالوں کا جواب بھی ہے اور اسلام کی سنہری اقدار کے لئے محفوظ حصار بھی اس دور میں نئے زاویوں سے شخصیت تراشی بھی ہے اور عصری تقاضوں کے لحاظ سے ذہن سازی بھی۔ مولانا انظر شاہ کشمیری مولانا کی دارالعلوم میں خدمات اور جدید عربی ادب کا ماحول پیدا کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مدارس عربیہ سے وابستہ دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ مولانا کیرانوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی تحریک میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جدید عربی زبان و ادب کی داغ بیل ڈالی اور اس کو پروان چڑھایا۔ یہ بات کہنے کی نہیں ہے مگر اس حقیقت سے منہ بھی نہیں موڑا جاسکتا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا وحید الزماں سے قبل یہاں کے طلبہ کے لئے عربی زبان کو بحیثیت زبان لکھنے اور بولنے کی مشق کا کوئی انتظام نہیں تھا اسی وجہ سے طلبہ تمام علوم حدیث و فقہ اور تفسیر میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بھی عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے۔ لیکن مولانا وحید الزماں نے دارالعلوم کی مسند تدریس پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے اسی سمت میں کوشش کی یہاں تک کہ پورے دارالعلوم میں ایک انقلاب آگیا“ (۲)۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”تاریخ دارالعلوم دیوبند“ محبوب رضوی ص ۱۳۶-۲۳۹-۵۰۶-۵۱۸۔

۲- مولانا انظر شاہ کشمیری (شیخ الحدیث وقف دارالعلوم دیوبند) بالمشافہ۔

## دارالعلوم میں تدریس

دارالعلوم کی تاریخ میں مولانا وحید الزماں کی خدمات کا دور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۹۰ء ہے۔ ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذ عربی آپ کا تقرر ہوا اور اپنی حسن کارکردگی کی بنیاد پر ایک سال کے اندر ترقی کر کے درجہ وسطی (ب) میں پہنچ گئے۔ پھر چند سال میں ترقی کر کے درجہ وسطی (الف) پھر ۱۹۷۰ء میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی اور عربی زبان و ادب کے ساتھ طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی آپ سے متعلق ہو گیا۔

۱۹۶۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے عربی زبان میں ایک سہ ماہی مجلہ ”دعوة الحق“ کے نام سے آپ کی ادارت میں جاری ہوا جو ایک عرصہ تک پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا جس نے اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کی بنا پر علمی حلقوں میں ایک مقام بنالیا تھا۔ ”دعوة الحق“ کے بند ہو جانے کے بعد اسکی جگہ پر ”الدااعی“ کا اجرا عمل میں آیا تو اسکی سرپرستی بھی ایک عرصہ تک آپ ہی نے کی۔

طلبہ دارالعلوم کی موقر عربی انجمن ”النادی الادبی“ بھی آپ ہی کی یادگار ہے جس سے وابستہ ہو کر سیکڑوں طلبہ عربی تقریر و تحریر کی مشق کرتے جب تک مولانا مرحوم دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے ”النادی الادبی“ کی سرپرستی اور نگرانی آپ ہی سے متعلق رہی اور آپ کی توجہ اور محنت سے عربی تقریر و تحریر پر قادر طلبہ کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی جس سے دارالعلوم دیوبند کی نیک نامی میں مزید اضافہ ہوا اور خود مولانا کی صلاحیتوں کا زمانہ معترف ہو گیا۔ درحقیقت مولانا کا یہ ایسا کارنامہ ہے جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا (۱)۔

خدا عزوجل نے مولانا کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا انہیں خوبیوں میں سے آپ کا نمایاں اور اتر انگیز طریقہ تدریس تھا اس بات میں وہ اپنے ماحول اور مروجہ طریقوں سے بیزار اور ایک نئے اور زیادہ مفید طریقہ تدریس پر زندگی بھر سختی سے کاربند رہے اس کی افادیت کا لوہا ہی نہیں منوایا بلکہ سکھ جمدیا۔

صغیر کے دینی مدارس میں مروجہ درس نظامی میں مختلف عقلی و نقلی علوم کی طرح عربی ادب کی تعلیم کا طریقہ کاریہ تھا کہ ایک لفظ پر اکتادینے والی اور ناقابل ہضم بحثیں ہوتیں کسی لفظ کے تحت ڈکشنری میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے جتنے معانی درجہ ہوتے وہ سب یا ان کا بیشتر حصہ نقل کیا جاتا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی ادب جیسی دلچسپ چیز فلسفہ اور یونانی علوم کی کوئی چیتاں معلوم ہونے لگتی اور عربی نہیں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت بالکل پیدا نہ ہو پاتی تھی لیکن مولانا کا انداز فکر یہ تھا کہ اس طریقہ تعلیم میں مشقت زیادہ اور منفعت

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند “ (وفیات نمبر) اپریل ۱۹۹۶ء مولوی حبیب الرحمان ص ۲۶۵-۲۶۷۔



بہت کم ہے اس کے برخلاف اگر ایک موقع پر کسی لفظ کے معنی صرف وہ بیان کئے جائے جس میں وہ لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے تو اسے سمجھنا یاد رکھنا اور لکھنے اور بولنے میں اسکی مشق کرنا آسان ہوگا پھر جہاں کہیں وہی لفظ دوسرے معنی میں مستعمل ہو وہاں دوسرے معنی بیان کئے جائیں ان کی تدریس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ نصاب میں شامل کتابوں کے حل مطالب پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نصابی کتابیں صرف علامتی طور پر پڑھایا کرتے تھے اصل نگاہ اس پر ہوتی کہ طلباء کے اندر عبارت فہمی کے ساتھ ساتھ عربی زبان لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہو نیز یہ کہ اسباق میں اردو زبان ذریعہ تعلیم نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ سبق میں زیادہ سے زیادہ عربی کا استعمال کرتے الفاظ و معانی کی وضاحت عربی میں کرتے کلمات کے معانی عربی میں لکھواتے انکے استعمال کی مشق کراتے۔ انتہا یہ تھی کہ دورانِ درس اگر کسی طالب علم کی کسی حرکت بجا پر ناراض ہوتے تو ناراضگی کا اظہار بھی عربی میں کرتے اور کہتے ”انت تجادل دائما“۔

درس گاہ میں مختلف موضوعات پر اپنے سامنے ایک ایک طالب علم کو مکلف کرتے کہ وہ کھڑا ہو کر حتی الوسع جملہ آداب خطابت کو محفوظ رکھتے ہوئے تقریر کرے دوسرے شرکاء درس پر یہ فرض عین تھا کہ درس گاہ میں سراپا گوش بن کر تقریر سنیں ”اس کے مفہوم کی وضاحت کریں“ اور غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ کبھی وہ طالب علموں کو بھری درس گاہ میں کھڑا کرتے کہ وہ کسی موضوع پر گفتگو کریں جملہ شرکاء کے لئے ضروری تھا کہ انہیں جو کچھ بھی کہنا ہو عربی میں کہیں اردو قطعاً ممنوع تھی اسی کے ساتھ کسی شریک درس کو اسکی اجازت نہ تھی کہ وہ شرافت کے پس پر وہ غفلت کیش خاموشی اختیار کئے بیٹھا رہے ہر طالب علم پر عبارت پڑھنا سوالات کرنا اور جملہ حواس کو حرکت میں رکھنا ضروری ہوتا انکے کسی حکم کی تعمیل میں ازاراہ معذرت ”لا استطیع“ کا استعمال ”اکبر الکبائر“ تھا ہر طالب علم کو چاق و چوبند دیکھنا چاہتے تھے رائج الوقت عربی لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے داخل نصاب کتابوں کے علاوہ عربی عبارت کے اقتباسات اور تراشے بھی اسباق کی طرح باقاعدہ پڑھاتے، طلبہ کو اس طرح مکلف کرتے کہ وہ حتی الامکان سبق بغیر پڑھے ہی خود سمجھنے کی کوشش کرتے (۱)۔

صحافت کار: حجان پیدا کرنے کے لئے ایک قلمی اخبار بھی شروع کیا جس طالب علم میں جتنی صلاحیت ہوتی اس کے مطابق اسکو مضمون دیا جاتا وہ اس مضمون کو لکھتا، اسکی تصحیح فرما کر اسکو قلمی اخبار میں شائع کرتے اس سے طالب علم کے اندر مضمون نویسی کار حجان پیدا ہوتا اور وہ مزید محنت کرتا اس سے ان کے اندر صحافت کا شوق پیدا ہوتا جن طلبہ کی صلاحیت پختہ ہو جاتی انکے مضامین دارالعلوم کے سہ ماہی مجلہ، ”دعوة الحق“ اور جمعیت کے عربی ترجمان ”الکفاح“ میں شائع کئے جاتے۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم نئی دہلی“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء مولوی رفیق احمد بستوی ص ۲۰۳-۲۰۸۔

عبارت خوانی میں قواعدِ نحو و صرف پر غیر معمولی زور دیتے صرف اتنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ الفاظ کی خارج سے ادائیگی کے ساتھ حتی المقدور عربی لہجہ کی نقالی بھی ضروری ہوتی اور ”النادی الادبی“ کی تحریری سرگرمیوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر آئے دن درسگاہ میں اپنے سامنے مضامین لکھواتے درسگاہ میں طلبہ کو عربی خطوط میں ”خط نسخ“ اور ”خط دفاع“ کی مشق کراتے یہ انکے درس اور درسگاہ کے واجبی اور اجباری اجزاء تھے جس سے انحراف کی گنجائش نہیں تھی۔ آپ کے سبق کے بعد ہر طالب علم کی طبیعت تنگفتہ ہوتی اور اسے محسوس ہوتا کہ آج بہت کچھ حاصل ہوا ہے چنانچہ ایک تعلیمی سال جسکی مدت تقریباً سات آٹھ ماہ ہوتی ہے کسی زبان و ادب کو سیکھنے کے لئے یہ مدت مضحکہ خیز ہے لیکن مولانا اپنی خداداد صلاحیت اور جگر سوزی سے اس مختصر سی مدت میں طلبہ کے اندر عموماً اتنی صلاحیت پیدا کر دیتے کہ انہیں اخذ و تعبیر کا سلیقہ آجاتا اور آئندہ محنت و لگن سے جتنی مہارت حاصل کرنا چاہتا کر لیتا (۱)۔

آپ اپنے طلبہ کے لئے کچھ اصول بنائے تھے جن پر پختگی سے عمل کراتے تھے مثلاً ادب کی تمام کتابیں چاہے مقامات ہو یا متنہی، حماسہ ہو یا سبع مملکت سب عربی میں پڑھائی جاتی تھی مشکل الفاظ کی تشریحات و اشعار کے مقہوم کی وضاحت سب عربی میں کرتے تھے صرف اپنی درسی وضاحت پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ طلباء سے بھی اشعار کی تشریح عربی میں کراتے، عربی ادب کا جو سبق جس دن پڑھایا جائے اسکی تعبیرات اور اصطلاحات کو لکھ کر ذہن نشین کرنے کا حکم دیا جاتا پھر ان اصلاحات کو گفتگو میں استعمال کراتے جب ایک سبق پر اتنا کام ہو جایگا تو یقیناً وہ محفوظ ہو جایگا۔ مولانا خضر محمد صاحب استاد دارالعلوم دیوبند مولانا کے طریقہ تدریس کے بارے میں بیان کرتے ہیں :

”مولانا نے تدریس کے پرانے طریقہ کو بدل دیا جس میں سارا بار استاد پر ہوتا ہے انھوں نے طلبہ کی اصولی رہنمائی کرنے کے بعد سارا بار طلبہ پر ڈال دیا کہ وہ اپنے ذہن سے سوچیں، غور و فکر کی عادت ڈالیں۔ اپنی فطری صلاحیت سے پورا پورا کام لیں اور قدرتی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ الفاظ کو ذہن نشین کریں عربی تعبیرات کو حافظہ میں محفوظ کریں عربی ادب کے ابتدائی سال میں ایک کو سائل دوسرے کو مجیب مقرر کر کے درس میں کھڑا کر دیتے کہ وہ سبق کے سارے الفاظ اور ساری تعبیرات کو بر جستہ زبان سوال و جواب میں ظاہر کریں منتہی طلبہ کو عنوان دے دیا کہ اس عنوان پر لکھ کر لائیں ان کا وقت مقرر کر دیا، جوں ہی وقت مقررہ ختم ہو گیا، کاپیاں انکے ہاتھوں سے لے لی گئی اگر کسی نے صرف ایک سطر لکھ کر چھوڑ دیا ہے یعنی لا پرواہی کا ثبوت دیا ہے تو ان کا چہرہ افرط غضب

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ماہنامہ ”الداعی“ جون ۱۹۹۵ء مولانا نور عالم خلیل الامینی ص ۸-۹۔

سے سرخ ہو جاتا اور اسی برہمی کی حالت میں جب اسکو عربی ادب و لہجہ میں لتاڑتے تو یہ منظر قابل دید ہوتا ایک تند و تیز آتش کی طرح الفاظ انکی زبان سے نکلتے اور اتنی روانی سے جیسے سیلاب رواں دواں ہے اس وقت جدید عربی میں انکی مہارت اور عربی تعبیر پر انکی وسعت نظر اور مکمل واقفیت کا پتہ چلتا تھا یہ ان طلبہ کے ساتھ رویہ تھا جو اپنے ذہن پر زور نہیں ڈالتے تھے اور جن طلبہ نے پورا مضمون لکھا انکی کاپیاں جانچتے ہوئے تو صنفی کلمات سے انکی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے جاتے۔ اچھا لکھا ہے لیکن یہ جملہ بدل دو تو عبارت خوبصورت ہو جائیگی تعریف کرتے جاتے الفاظ جملے اور سطر کی سطر کثرت جاتی کوئی سطر ایسی نہیں پختی جو نوک قلم سے محفوظ ہوتی لیکن ساتھ ساتھ طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے وہ جانتے تھے کہ بیجا سختی اور حوصلہ شکنی انسانی صلاحیتوں کے ابھرنے کی راہ میں کبھی کبھی سنگ گراں بن جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی ہاں اگر کچھ حوصلہ افزائی اور تعریفی کلمات سے نواز دیا جائے تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، دوبارہ اور زیادہ انہماک سے کام کرتے ہیں، غور و فکر میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔“ (۱)

مولانا کے طرزِ تدریس میں بلا کی جاذبیت، اثر آفرینی بلکہ ایک طرح کا سحر تھا، طلبہ بہت جلد ان کے گرویدہ ہو جایا کرتے تھے اور صرف ان کے بولنے کے انداز ہی نہیں ان کی چال اور وضع قطع سب میں ان کی تقلید شروع کر دیتے تھے۔ آپ کا کمال علمی دقاقت یا ادبی نکات کے بیان میں نہیں بلکہ طلبہ کی مسلسل حوصلہ افزائی اور ان میں خود اعتمادی کی روح پھونکنے میں تھا مردہ سے مردہ طالب علم میں بھی زندگی اور نشاط کا پیدا کر دینا ان کی تقریر اور تدریس کا عام اثر تھا۔

مولانا نور عالم آپ کی تدریس و تربیت کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :

”دارالعلوم دیوبند میں بہت سارے اساتذہ و دیگر مدارس کے اساتذہ سے ہم نے تعلیم حاصل کی ہر ایک کا احسان ہماری گردن پر ہے ہر ایک کا احترام کرتے ہیں، ان کے تئیں قدر افزائی و اعتقاد کا جذبہ رکھتے ہیں جس کے بیان پر قلم قادر نہیں ہے لیکن میں یہ کہنے میں ذرا بھی حقارتِ شان نہیں سمجھتا کہ وہ سب کے سب تقریباً ایک دوسرے کی نظیر تھے وہ علم و فضل و تقویٰ میں ایک دوسرے سے بڑھکر ضرور تھے لیکن درس کی وضاحت طریقہ تدریس، مضمون کی تفہیم اور زندگی کے بہت سارے گوشوں میں اور بہت سارے

افکار و خیالات میں وہ بڑی حد تک ایک دوسرے کے مشابہ اور ہم پلہ تھے لیکن مولانا سارے میدانوں (جن میں ان کی صلاحیت کے جوہر گراں ہمارے سامنے آسکے اپنی نظیر آپ تھے وہ بلاشبہ ان ممتاز اور ذہین لوگوں میں تھے جو اپنے ماحول سے اپنا امتیاز اور تفرد منوا لیتے ہیں اور اس کو اپنے پیچھے چلنے اور اپنی تقلید کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

تری الناس ان سرنا یسیرون خلفنا و ان تحن او ما نا الی الناس و قفو  
مولانا کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بڑے مربی تھے یا بڑے مدرس ان کا درس ہمیشہ تعلیم و تربیت دونوں کا حسین مجموعہ ہوا کرتا۔ ہم لوگ اپنے ناقص تجربہ کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان کی تدریس کا جو سلیقہ اور طریقہ خزانہ قدرت سے ان کو ودیعت ہوا تھا۔ برصغیر بلکہ بیرون ملک میں بھی عربی زبان کے بہت کم مدرسین کے حصہ میں آیا ہو گا ہم ہر گز یہ نہیں کہتے کہ مولانا علم و فضل میں یا ادب و زبان کے گہرے مطالعہ میں سب ہی سے بڑھ کر تھے، کیونکہ خود اندرون ملک بہت سے فاضل گرامی اپنی وسعت مطالعہ اور ذوق زبان و ادب میں ان سے بدرجہا فائق ہیں، لیکن جو چیز مولانا کو دوسروں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے وہ ان کا پیارا، خوبصورت، آسان ترین اور مفید ترین طریقہ تدریس تھا، نیز اپنے شاگردوں تک کامیابی سے زیر تدریس مضمون کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات اور جذبات کو منتقل کر دینے کی برق رفتار اور حیرت انگیز صلاحیت اور افہام و تفہیم، مرتب گفتگو اور مخاطب کو مطمئن کر دینے کی بھرپور قدرت ان سب سے بڑھ کر ”بہت دور تک جا پہنچنے کے لیے بہت مختصر راستہ“ کی شریفانہ اور ہوش مندانہ راہ نمائی کا راز سکھلاتے تھے چنانچہ ہم لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ مولانا اپنے شاگردوں کو اپنے علم و معلومات سے زیادہ بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔“ (۱)

آپ کے یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی کی جاتی ان کی ذات سے وابستہ جس تاریخ سازی، ذہن سازی افراد سازی اور مردم سازی کا غلغلہ ہے اس کی تدریس کے لیے درس گاہ سے علیحدہ کوئی تربیت گاہ نہ تھی، درس گاہ ہی تربیت گاہ تھی اور تدریس ہی تربیت اور لوگوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اچھے مدرس تھے یا مربی مولانا کی تربیت عملاً جامع اور ہمہ گیر ہوتی تھی وہ اپنے شاگردوں کی علمی، فکری اور نفسیاتی تربیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی کے عام معمولات پر بھی نظر رکھتے تھے، اپنے طلبہ کی ذہنی و فکری تربیت کا جو انداز اپنایا تھا اور اس کے لیے جو خطوط متعین کئے تھے، وہ بھی اپنی ندرت، اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بے مثال تھے یعنی مدارس و مراکز میں عام طور پر بیجا عقیدت و احترام کو طلبہ پر اس طرح مسلط کر دیا

جاتا ہے کہ بسا اوقات ان کی خودداری اور صاف گوئی کی عادت بھی منفی طور پر متاثر ہو جاتی ہے، مولانا اس صورت حال کو ناپسند فرماتے تھے اور اپنی طرح طلبہ و شاگردوں سے بھی صاف گوئی اور احترام آمیز بے تکلفی کی توقعات رکھتے تھے اور فرماتے کہ ”غیر ضروری عقیدت و احترام اور ڈر کو اس طرح مسلط کر دینا کہ طلبہ اپنے دل کی بات بے خوف و خطر نہ کہہ سکیں۔ دراصل نفاق، دروغ گوئی اور تصنع آمیز جیسی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔

مولانا کو جو چیز دیگر روایتی علماء سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی حقیقت پسندی، نئے حالات اور ان کے تقاضوں کا بصیرت مندانہ شعور اور طلباء کی ایسی تعلیم و تربیت ہے کہ ان کی خودی و خودداری کسی طرح کمزور نہ ہو اور اسلاف کی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے دور جدید کے تقاضوں کا بھی انھیں پورا ادراک ہو تاکہ ان میں احساس کمتری پیدا نہ ہو اور آج کی تیز رفتار اور نئی ایجادات سے بھری دنیا میں خود کو اجنبی محسوس نہ کریں، ان کا خیال تھا کہ دینی مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم اور بالخصوص طریقہ تعلیم امت کو باشعور دینی اور اجتماعی قیادت فراہم کرنے کے لیے کافی نہیں، دور جدید کے تقاضوں اور جدید علوم سے علماء دین کی بے خبری مولانا کو ہمیشہ فکر مند رکھتی کیونکہ انھیں احساس تھا کہ ”آئین نو سے ڈرنا“ اور ”طرز کہن پر اڑنا“ قوموں کی زندگی میں کتنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔

تربیت کا جو انداز سب سے نرالا تھا اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ امتحانات سہاہی اور ششماہی کے موقعوں پر دیکھنے میں آتا جو عموماً در سگاہوں میں ہوتے، آپ سوالات کا پرچہ طلبہ کے حوالے کرنے کے بعد کہتے کہ ”ہر طالب علم نہایت امانت و دیانت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنا پرچہ حل کریں۔ کسی قسم کی کوئی خیانت، بددیانتی اور بدعنوانی پر گرفت کے لیے کوئی استاد یا نگران نظر جمائے بیٹھا رہے یہ ایک طالب علم کے وقار کے منافی ہے، عین امتحان کی ساعت میں یہ درس دے کر چلے جاتے، عجیب بات تھی کہ وہی طلبہ جن میں بہت سے لوگ امتحان گاہوں میں اپنے قریبی ہمسایوں سے سرگوشیوں اور پرچی بازیوں سے امداد فراہم کرتے تھے ان کے ذہنی اور اخلاقی حالات اس قدر بلند ہو جاتے کہ وہ یہاں اس طرح کے عمل کو گناہ تصور کرنے لگتے (۱)۔

طلباء کی اصلاح اور ان کی تربیت میں آپ کو اس قدر مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور ہٹ دھرم قسم کے طلبہ کو بھی اپنے مخصوص انداز اور شیریں بیانی سے بہت جلد فریفتہ کر لیتے تھے، مطالعہ کی سچی لگن، کتاب سے تعلق، زبان و قلم کی صلاحیت پیدا کر دینے میں یدِ طولی رکھتے تھے، معمولی استعداد والے طالب علم کی اتنی حوصلہ افزائی کرتے کہ اس کے اندر بھی خود اعتمادی کا جذبہ ابھر جاتا، طلبہ کو ایک حد تک

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان اسلام“ بنارس مئی ۱۹۹۵ء - مولانا اسیر اوروی ص ۸-۱۵۔

تقریر و تحریر کی آزادی دے کر ان کنٹرول رکھنا مولانا کا ممتاز وصف تھا۔ بہت زیادہ دبا کر جذبات کو کچل کر زبان بندی کے فارمولے پر عمل کر کے یہ سمجھنا کہ مکمل کنٹرول ہے آپ کے نزدیک یہ محض خام خیالی اور بیجا تشدد تھا آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”غربت و امارت سے وضع داری میں فرق نہیں آنا چاہیے، دونوں صورتوں میں انسان کو اپنی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا چاہئے احساس خودی انسان کی بہت بڑی دولت ہے، آئینہ کی چمک نہ ہو تو اس کی کو بیقیمت نہیں ہے، تواضع انکساری یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا کر دو۔ جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے، اس کی امنگیں دم توڑ دیں گی ایسا آدمی کبھی بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا، اس کا عزم کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کریگا اس لیے طلبہ علوم اسلامی کو خود دار انسان بننا چاہئے۔

آپ کے شاگردوں میں عام طلبہ سے ایک نمایاں فرق ہوتا ان کا رہن سہن دوسروں سے الگ تھلک ہوتا، کمرہ، بستر ہمیشہ صاف دکھائی دیتا کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی ہوتیں، ہر کام سلیقے سے کرتے وعدے کے پکے، خود دار گویا کہ مزلا نا کی جھلک ان میں صاف نظر آتی، آپ قدم قدم پر طلبہ کی ہدایت اور رہنمائی کرتے اور ان کی غلطیوں پر باز پرس بھی کرتے، غرض کہ دن رات کی انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ طلبہ ان کی سخت و سست باتوں کو سر جھکا کر سنتے اور دم نہ مارتے کیونکہ ان کی اس ڈانٹ ڈپٹ میں خلوص ہوتا اسی کا اثر تھا کہ بڑے سے بڑا مجمع ان کی للکار پر سہم جاتا اور اشاروں پر چلتا تھا۔

مولانا اپنے شاگردوں کے ساتھ فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے، مشفقانہ انداز، دوستوں کی سی بے تکلفی روارکھتے، تاکہ کسی صحیح یا غلط کام پر جرح کر سکیں اس سے انہیں حق گوئی اور حق فہمی کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے، شاگرد یا غیر کوئی کیسی ہی نادانی کر جائے اگر ان کے سامنے اپنے کئے پر پشیمان ہو جاتا تو اس کو نہ صرف معاف کر دیتے بلکہ پہلے سے زیادہ قریب کر لیتے یہ تربیت کا وہ گرہ ہے جس سے عادی مجرم کو بھی پار سبانا یا جاسکتا ہے۔ آپ کی اس طرح کی تربیت کا اس وقت اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب آپ کے تربیت یافتہ شاگردوں کا موازنہ عام فضلاء مدارس سے کیا جائے۔ چنانچہ ایک طرف جہاں مولانا سے فیض یافتہ افراد ملک و بیرون ملک میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت سرگرم عمل ہیں، نئے ماحول میں وہ خود کو قطعاً اجنبی محسوس نہیں کرتے تو دوسری طرف عام طور سے روایتی فضلاء مدارس دینیہ کی جو خستہ حالی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں: (۱)

”آپ کی تربیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار ”جامعہ ازھر

قاہرہ“ مصر کی طرف سے عربی بیان و ادب کی تدریس کے لیے مبعوث مصری عالم شیخ

عبداللہ نے اس وقت فرمایا تھا، جب آپ کی مخالفت کا زور دار العلوم کی انتظامیہ پر بڑھ رہا

تھا ”اگر دارالعلوم کے لیے شیخ وحید الزماں کی ہمہ جہت قربانیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ان کا یہ کارنامہ کافی ہے کہ انھوں نے اپنی تربیت کے نتیجہ میں ایک باشعور نسل تیار کر دی، کیونکہ یہ بات ان کے علاوہ کسی اور شخص کے یہاں نہیں پائی جاتی۔“ (۱)

دارالعلوم کے ماحول میں مولانا کو ایک مسیحا گردانا جائے تو غلط نہ ہوگا، طلبہ میں احساس و شعور اجاگر کرنا جذبہ خودداری زندہ کرنا، علم و ادب کا ذوق پیدا کرنا اس سے بڑھ کر مدارس عربیہ کے طلبہ سے احساس کمتری و محرومی کا احساس ختم کرنا اور جمود و خمود کی لعنت کو نابود کرنا ایسا کارنامہ ہے کہ قاسمی برادری کی آنے والی نسلیں مولانا کے اس انقلابی عمل کو خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔

آپنے طلبہ کو ہر میدان میں خواہ وہ ملی ہو یا قومی، عالمی مسائل سے واقف کار اور مدبر کار بنانا چاہتے تھے، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، سائنس اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے معلومات عامہ کو طالب علم کی بنیادی ضرورت قرار دیتے تھے، مختلف علوم و فنون کے طلبہ سے اہم مسائل پر گفتگو کرتے اور ان کے اندر بحث و مباحثہ کی قوت پیدا کرتے دوسری طرف طلبہ بھی ہر چیز کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس لیے سیکھ جاتے کہ مولانا کی ہمت افزائی کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ ان کی خوابیدہ صلاحیتیں آنا نانا بیدار ہو جاتیں انھیں محسوس ہوتا کہ وہ بڑے لائق و فائق آدمی ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو ماضی میں بڑے بڑے لوگ نہ کر سکے مولانا کے الفاظ ایسے مواقع پر سدھائے ہوئے تیر کی مانند ہوا کرتے تھے جو سیدھے دل میں پیوست ہو جاتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مولانا نے اپنے طلبہ کی تربیت میں خود کو فنا کر دیا تھا اور ہر وقت اسی کام سے لگے رہتے اپنی ذات سے زیادہ اپنے طلبہ کا خیال رکھتے تھے طلبہ کے لیے آپ کے کمرہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا کوئی پریشانی کسی بھی وقت پیش آئے فوراً مولانا کا تعاون حاصل ہو جاتا تھا آپ نے کبھی خود کو دارالعلوم کا ملازم نہیں سمجھا بلکہ تمام کاموں کو اپنے ذاتی کاموں کی طرح انجام دینے چنانچہ اگر آپ بھی عام اساتذہ کی طرح صرف درسگاہوں میں جا کر خانہ پُری کر دینے کے بعد واپس آکر سارا وقت علمی و تصنیفی کاموں میں یکسوئی کے ساتھ صرف کرتے، جیسا کہ عموماً بڑے اداروں اور گورنمنٹ کالجوں وغیرہ میں ہوتا ہے، آپ نہ صرف برصغیر بلکہ ایشیا کے عظیم مفکر و مصنف ہوتے کیونکہ آپ کا ذہن جتنا زرخیز اور دور رس تھا آپ کی قوت فیصلہ و عمل جس قدر مضبوط اور بے پناہ تھی اس سے کون واقف نہیں ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑا مصنف بننے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے جو کبھی آپ کو میسر نہیں ہوئی آپ نے اپنی تعمیر کے بجائے اپنے شاگردوں کی تعمیر میں سارا وقت اور توانائی صرف کر دی۔ (۲)

۱- ”آئینہ دارالعلوم دیوبند“ ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء ص ۳-۳۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ریاض الجنۃ“ جنوری اپریل ۱۹۹۵ء ص ۳-۵۔

## دارالعلوم کے انتظامی امور میں آپ کا حصہ

مولانا وحید الزماںؒ کو خدائے عزوجل نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا آپ ہمہ گیر اور گونا گوں صلاحیتوں کے مالک تھے، ایک طرف تجربہ کار کہنہ مشق اور قابل استاد و مربی بھی تھے تو دوسری طرف خدانے آپ کو دور اندیشی، معاملہ فہمی، اور نظم و ضبط کی قابل رشک صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔

آپ کی خداداد صلاحیتوں کا ظہور تو طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوتا رہا ہے، کیونکہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے بہت سے پروگراموں کی نظامت کی ذمہ داری خود ہی سنبھالتے تھے، خواہ وہ ادبی درس سے متعلق ہوں یا ”سلسلۃ الدروس العربیۃ“ کے اجراء سے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد خواہ دارالفکر کے نظم و نسق کا معاملہ ہو یا ماہنامہ ”القاسم“ کی اجراء و ادارت کی ذمہ داری سے متعلق ہو، آپ تمام امور میں ہمیشہ کھرے اترے اور ایسا انتظام و انصرام کیا کہ کسی کو کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا، لیکن اصل انتظامی صلاحیتوں کا عملی ظہور اس وقت ہوا جب آپ کو ایشیا کی عظیم علمی و دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ عربی ادب کا صدر مقرر کیا گیا آپ نے اس شعبہ کو اپنی صلاحیتوں اور محنتوں کے ذریعہ ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ دارالعلوم میں اس شعبہ کا شمار تمام شعبوں سے نمایاں ہونے لگا کیونکہ اس شعبہ سے متعلق طلبہ اپنے تمام دوسرے ساتھیوں سے ممتاز نظر آتے، ان کے اخلاق و عادات اور ان کا رہن سہن سب سے نمایاں ہوتا تھا، ان کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کی جاتی تھیں کہ زندگی کے تمام میدانوں میں ہر کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔

آپ ہر کام کو خود عملی طور پر کر کے دکھاتے، پھر دوسروں کو اس کا مکلف بناتے۔

چنانچہ آپ کی اسی انتظامی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور ارکان شوریٰ نے صد سالہ اجلاس کے موقع تمام تعمیرات کی درنگی اور نئی تعمیرات کی بناء کا پورا انتظام آپ کے سپرد کر دیا آپ نے اس میدان میں اپنی فنی صلاحیت کا جو مظاہرہ کیا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید آپ کوئی پیشہ ور اور سند یافتہ انجینئر تھے۔ (۱)

آپ کے سامنے وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ تھا اسی وجہ سے آپ نے مشینی انداز میں کام کی شروعات کی سب سے پہلے آپ نے دائرہ جدید کے کمروں کے درمیانی خلا کو پُر کیا اور تمام کمروں کو ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دیا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ درمیان کے کمرے بعد کی تعمیر ہیں، جب یہ کام پورا ہو گیا تو حضرت مہتمم صاحب نے ان الفاظ میں تعریف کی :

”بھائی ماشاء اللہ مولانا معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دو کمروں کے درمیان کوئی خلا تھی اور بھائی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ندائے شاہی“ مراد آباد مئی ۱۹۹۵ء ص ۳-۴۔



مولانا آپ نے تو اس نئی تعمیر کو پرانی تعمیر سے اس طرح ہم اہنگ کر دیا، جیسے یہ پہلے ہی سے تعمیر شدہ ہے، بھائی ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزاء عظیم عطا فرمائیں۔“ (۱)

آپ نے مہتمم کو پورے دارالعلوم میں جہاں عمارتوں میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، دکھایا اور ان جگہوں کا نقشہ مع تحسین و تزئین کے سمجھایا، حضرت مہتمم صاحب نے تمام کاموں کی اجازت مرحمت فرمادی اور اسی کے ساتھ آگے کام کے لیے حوصلہ افزائی بھی فرمائی، پھر اگلے ہی روز خاکہ کے مطابق کام شروع کر دیا۔ مزدوروں نے درسگاہ پر بنے چبوترہ کو توڑنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی توڑ پھوڑ شروع ہوئی بعض لوگوں نے نکتہ چینی کیں لیکن آپ نے ان لوگوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو ہال تعمیر ہو گئے تو سبھی لوگوں نے ان کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ چونکہ دارالعلوم میں اس وقت کام بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا، دوسری طرف دارالعلوم کا خزانہ بھی خالی ہو رہا تھا تو آپ کو مزید الجھن پیدا ہو گئی اسی دوران کا واقعہ ہے کہ راج مستری کی ٹیم بغرض ملاقات آئی، رسمی بات چیت کے بعد دارالعلوم کی تعمیرات سے متعلق گفتگو کا سلسلہ چل نکلا، مولانا فرمانے لگے ”بھائی مستری حضرات کام تو اس قدر لمبا چھڑ گیا ہے اور دارالعلوم کا خزانہ خالی ہو چکا ہے، اب کیا کیا جائے، مستری حضرات کہنے لگے کہ حضرت ہم تو اسی وجہ سے پریشان ہیں کہ کام بہت زیادہ ہے اور وقت بہت کم ہے، پھر ایسے وقت اگر کام ایک دو روز کے لیے رُک گیا تو کام کی رفتار سست پڑ جائیگی اور پوری ٹیم بکھر جائیگی اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انشاء اللہ کام اسی رفتار سے ہوتا رہے گا، خواہ مزدوری ملے یا نہ ملے آپ کو اُن لوگوں کے اس طرح کے تعاون سے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے بھی کام جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا، ان دنوں مولانا کی حالت یہ ہو گئی کہ رات رات بھر کام کرتے رہتے اس سے قبل مولانا ہمیشہ خوش لباس تھے، کرتے پاجامے اور ٹوپی میں ایک خاص تراش اور وضع تھی، جس کے نوک و پلک، وہ خود درست کرتے تھے، کپڑوں میں نہ کبھی شکن نظر آتی اور نہ میل پچیل، جو تا ہمیشہ چمکتا رہتا، مگر صد سالہ کے موقع پر تعمیرات کا انتظام سنبھالنے کے بعد آپ کا حال یہ ہوا کہ کپڑے میلے ہو رہے ہیں، کچھ التفات نہیں، بدن دھول اور غبار سے اٹ رہا ہے، نہانے کی فرصت نہیں، ایک ہی کپڑا کئی دن تک بدن پر رہتا، پورا لباس شکن آلود ہے لیکن تبدیل کرنے کا خیال نہیں، دل میں ایک جوش تھا جو انھیں مسلسل حرکت میں رکھتا تھا، کھانے تک کی فرصت نہیں تھی، مسلسل چائے سے کام چلاتے رہتے تعمیر میں اس قدر مصروف ہوئے کہ خود کو ایک بہترین انجینئر ثابت کر دیا۔ تعمیر کے ایسے ایسے نقشہ نکالتے کہ تجربہ کار ماہرین فن حیران رہ جاتے، وہ اپنے ذہنی نقشہ کے مطابق عمارت بنواتے اور ہر وقت کاریگروں پر سوار

رہتے۔ تھوڑے وقت اور کم پیسوں میں انھیں بہترین عمارت بنوانے کا سلیقہ آگیا تھا۔ اسی دوران ایک روز صبح ہی صبح حضرت مہتمم آپ کے کمرہ پر تشریف لائے۔ رسمی گفتگو کے بعد مولانا نے کہا کہ حضرت آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔ حضرت نے فرمایا :

”یقیناً مولانا سچ پوچھے تو میری طبیعت پر جتنا زور پڑ رہا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے اب تو راتوں کی نیند بھی غائب ہو گئی آج پوری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکا، اب تو کیفیت یہ ہو گئی! سفر ہو یا حضر، جلوت ہو یا خلوت غرض کہ ہر وقت آپ ہی کا تصور دل و دماغ پر رہتا ہے، اور سچ پوچھے تو مولانا پہلے تو آپ سے صرف تعلق تھا اب محبت ہو گئی ہے“ (۱)

یہ کہہ کر مہتمم صاحب کی آنکھیں اشکبار ہو گئی، اس کا اثر مولانا کی طبیعت پر کیا ہوا ہو گا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے آگے پھر حضرت قاری صاحب نے کہنا شروع کیا:

”مولانا میرے علم میں تو یہ بھی ہے کہ تعمیرات کی مصروفیات میں نہ تو آپ وقت پر کھانا کھاتے ہیں اور نہ سوتے ہیں، مولانا آپ نے تو اپنے آپ کو بالکل فنا کر رکھا ہے دارالعلوم کے تئیں آپ کی محنت و لگن مجھے ہمیشہ یاد رہے گی آپ کا احسان دارالعلوم پر بھی ہے اور مجھ پر بھی میں آپ کا بہت مشکور ہوں اور احسان مند بھی، اللہ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔“ (۲)

اس پر مولانا نے کہا کہ حضرت میں آپ کا خادم ہوں میرے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے اتنی بڑی تعداد میں سے میرا انتخاب فرمایا اور کسی لائق سمجھا۔ اسی دوران آپ نے دارالعلوم کے خزانہ کا تذکرہ بھی کیا کہ خزانہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اتنا بڑا کام جاری رکھا جاسکے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ سرکردہ مدرسین کی ایک جماعت تشکیل دی جائے جو پورے ملک کا دورہ کر کے دارالعلوم کے لیے چندہ فراہم کرے چنانچہ حضرت مہتمم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور چند روز بعد ہی کچھ اساتذہ کو چندہ کی فراہمی کے لئے روانہ کر دیا گیا خود مولانا بھی اپنے چند شاگردوں کو لیکر چندہ کے سفر پر نکل گئے، اس طرح مالی پریشانی کے مسئلہ کو حل کیا گیا۔“ (۳)

اب اجلاس صد سالہ کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی مولانا تعمیرات میں اور زیادہ منہمک ہو گئے یہاں تک کہ کھانا سونا تقریباً بند کر دیا چنانچہ اس محنت شاقہ کا اثر آپ کی طبیعت پر ایسا ہوا کہ آپ کی حالت خستہ ہو گئی مسلسل جاگتے رہنے اور چائے کی زیادتی کی وجہ سے پیٹ میں درد کی شکایت شروع ہو گئی اسی کے ساتھ تلوؤں

۱۔ ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم نئی دہلی“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ڈاکٹر معروف القاسمی ص ۲۱۷۔

۲۔ ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم نئی دہلی“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ڈاکٹر معروف القاسمی ص ۲۱۷۔

۳۔ ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم نئی دہلی“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ڈاکٹر معروف القاسمی ص ۲۱۸-۲۲۰۔

میں گرمی چکر آنا وغیرہ جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے اور زندگی کے آخری لمحات تک اس بیماری نے آپکا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ آپ کو خود اپنے ساتھ لے گئی۔

چنانچہ آٹھ ماہ کی مسلسل محنت اور جدوجہد کے بعد آخر کار وہ گھڑی آہی گئی جسکا سب کو انتظار تھا پوری دنیا کی توجہ صرف اس طرف تھی کہ عالمی پیانہ پرداز العلوم میں جشن صد سالہ کا انعقاد ہونے ہمارا ہے آخر کار وہ وقت مسعود آہی گیا اسٹیج پر نظامت کے فرائض بھی آپ کو انجام دینے تھے جلسہ کا پہلا دن تھا آپ اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک ایک زبردست دورہ پڑا ایک کپکپی جسم پر طاری ہو گئی اور چلتے چلتے گر پڑے اور بیہوش ہو گئے، ڈاکٹروں کے مشورہ سے آپکو بہ عجلت دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل کیا گیا، چیک اپ کے بعد معلوم ہوا کہ مسلسل کم خوابی اور محنت شاقہ کے باعث پیشاب میں شکر کی مقدار بڑھ گئی ہے چنانچہ آپ کئی روز بعد رو بہ صحت ہو پائے لیکن جس جشن صد سالہ کے لئے خود کو اس حالت میں پہنچا دیا تھا آپ اس میں شرکت تک نہ کر سکے جشن کے موقع پر سب نے آپکی کمی کو محسوس کیا۔

اجلاس صد سالہ تو بخیر و خوبی انجام پا گیا لیکن اپنے ساتھ دارالعلوم کی تقسیم کی سیاہ تاریخ لکھ گیا، دارالعلوم میں جب اختلاف کی خلیج برہ گئی اور دارالعلوم کو بند کر کے پولیس کی تحویل میں دیدیا گیا تو مولانا وحید الزماں نے مشورہ کے بعد طلبہ کو روک لیا اور محمود ہال میں کیمپ دارالعلوم کے نام سے تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا کیمپ کا انتظام بھی بے سروسامانی کے عالم میں آپ ہی کے سپرد کیا گیا آپ نے تمام طلبہ کے رہنے ہی کا نہیں بلکہ کھانے تک کا انتظام دارالعلوم ہی کی طرح کر دیا اور چند روز بعد تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا اساتذہ کی کمی کو اس طرح پورا کیا گیا کہ دوسرے مدارس سے کچھ اساتذہ کا تعاون حاصل کیا گیا اور کھانے اور رہائش کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ”جمعیتہ الطالبہ“ کے سپرد کر دی اس طرح چند روز میں کیمپ کا نظام دارالعلوم کی طرح قائم کر دیا۔“ (۱)

بہر حال یہ مولانا ہی کی خصوصیت تھی کہ اتنے مشکل حالات میں اتنی بڑی تعداد میں طلبہ کے رہنے کھانے اور تعلیم تک کا انتظام یہاں تک وظیفہ کا نظام اسی طرح قائم کر دیا جیسا کہ دارالعلوم میں تھا خاص طور سے اتنی سی تنگ جگہ میں یہ سب مولانا کے انتظام و انصرام میں محنت کی دلیل ہے ورنہ تو ایسے حالات لوگوں کے حواس ہی کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔

## ناظم تعلیمات

دارالعلوم کے دوبارہ کھل جانے کے بعد پھر تمام چیزوں کے انتظام و انصرام کو از سر نو اسی خوبی سے آپ نے انجام دیا شوریٰ کو بحال کر دیا گیا جس وقت آپ کو عہدہ کی پیش کش کی گئی تو آپ نے اپنا دامن بچالیا

اور کوئی بھی عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے انتظامیہ کی نااہلی کہنے یا دارالعلوم کی بد قسمتی کہ کچھ دنوں بعد دارالعلوم میں دوبارہ بے چینی کا ماحول پیدا ہو گیا اور طلبہ نے ہنگامہ شروع کر دیا ان حالات کے پیش نظر آپ دارالعلوم سے استعفا دیکر مدرسہ شاہ گنج چلے گئے۔ آپ کے جانے کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے لہذا شوریٰ نے آپ سے استدعا کی کہ دارالعلوم واپس آجائیں اور دارالعلوم کے ماحول کو درست کرنے میں مدد کریں اسی کے ساتھ آپ کو ناظم تعلیمات بھی بنادیا گیا کیونکہ طلبہ کا تعلق زیادہ اسی شعبہ سے رہتا تھا لہذا آپ نے دارالعلوم کے مفاد کی خاطر یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے اپنا استعفا واپس لے لیا اور تعلیمات کا چارج لیکر معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ سے اس بحر ان کو چند روز میں ہی ختم کر کے تمام حالات پر کنٹرول کر لیا اور ان حالات پر از سر نو غور کیا جن خرابیوں کی وجہ سے ہنگامے شروع ہوئے تھے ان خرابیوں کو دور کیا ہر شخص کو اسکی ڈیوٹی پر مستعد کر دیا گیا طلباء اساتذہ اور ملازمین کی نگرانی سخت کر دی گئی یہاں تک کہ اگر کوئی ملازم یا استاد اپنے وقت میں تاخیر کرتا تو اس وقت کے لئے اس کو غیر حاضمان لیا جاتا اور پندرہ منٹ کی تاخیر کے بعد رجسٹر حاضری اٹھو لیا جاتا دفتر تعلیمات جو اس وقت بد عنوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسکی تمام بد عنوانیاں ختم کر دی گئیں جو کام کئی دنوں تک رکا رہتا اسے فوراً پورا کر نیکی ہدایت کر دی گئی۔ خود بھی تمام نکلوں کو روزانہ چیک کرتے اور ان پر حکم صادر فرماتے اس سے تمام ماحول میں پھر چہل پہل نظر آنے لگی، طلبہ کی کوئی شکایت ہوتی تو اسے فوراً دور کیا جاتا اگر کوئی شکایت یا مطالبہ لایعنی ہوتا تو اسکو رد کر دیتے ایسا نہیں تھا کہ ہر جائز و ناجائز مطالبات کو مان لیا جاتا ہو بلکہ ملازمین کا خیال بھی رکھتے اور جس قدر سہولت ممکن ہوتی انکو بھی مہیا کرنے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ بعد میں کچھ لوگوں نے تعلیمات میں آپکی خامیاں بھی پیش کیں لیکن ہر شخص کا طریقہ کار علیحدہ ہوتا ہے اور جو خامیاں ہیں کی گئیں اور جس انداز سے پیش کی گئیں ان کا مقصد سوائے سازش کے کچھ اور نہیں تھا کیونکہ شواہد و حقائق سے ایسی کوئی بد عنوانی آپکے خلاف ثابت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ بعض مواقع پر غلطیاں ہو گئیں ہوں کیونکہ وہ یا تو نظام میں اصلاح کی غرض سے ہوئی ہوگی یا پھر جلد بازی میں نیز کسی بگڑے نظام کو درست کرنے کے لئے کسی قدر سخت اقدامات ضروری ہوتے ہیں ورنہ انکی اصلاح مشکل کام ہے۔

بہر حال جو صاحب مولانا کے نکتہ چیں تھے بعد میں خود انھوں نے ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جو رپورٹ آپ کے نظام کی خامیوں کو بنیاد بنا کر پیش کرائی گئی تھی وہ ان سے زبردستی پیش کر آئی گئی تھی تاکہ آپ کو نااہل ثابت کیا جاسکے۔ (۱)

## معاون مہتمم

بہر حال ناظم تعلیمات کی حیثیت سے آپ کی اصلاحات اور سورشوں کو ختم کرنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے شوریٰ نے ۱۹۸۵ء میں آپ کو معاون مہتمم بھی بنادیا۔ کیونکہ عرصہ سے کسی متحرک شخص کے معاون مہتمم کے عہدہ پر تقرر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور اس عہدہ کے لیے اس وقت آپ کی شخصیت سے زیادہ کوئی دوسری موزوں شخصیت نہیں تھی۔ اس لیے باتفاق رائے آپ کو معاون مہتمم کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا جس وقت یہ فیصلہ آپ کے پاس پہنچا آپ بستر مرض پر تھے، آپ نے اپنی طبیعت کی وجہ سے کچھ تردد کا اظہار کیا اور فرمایا کہ نہ میں اس عہدہ کے قابل ہوں اور نہ ہی میری خواہش ہے لیکن کچھ لوگوں کے اصرار پر آپ کو یہ عہدہ قبول کرنا پڑا اس منصب کو سنبھالنے کے بعد مولانا دارالعلوم کی اصلاح و تجدید کے لیے کمر بستہ ہو گئے تعلیم میں ضروری اصلاح و ترمیم لائق اساتذہ کا انتخاب، تعمیرات میں اضافہ اور دارالعلوم میں طلبہ کی دشواریوں کو دور کرنا ان کی اہم اور قابل کارنامے ہیں۔ اس عہدہ پر فائز رہنے تک مولانا اسی انہماک اور مستعدی کے ساتھ دارالعلوم کی فلاح و ترقی کے لیے وقف رہے چنانچہ آپ کیمعادنت اہتمام کے دور میں بہت سے نمایاں کام انجام پائے۔ (۱)

ماہنامہ دارالعلوم کے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمن قاسمی نے اس خبر پر اس طرح تبصرہ کیا :  
 ”دارالعلوم کی بد انتظامی، دارالعلوم میں مزید استحکام اور قوت پیدا کرنے کے لیے عرصہ دراز سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب کی مساعادت و اعانت کے لیے کسی فعال، متحرک اور مدبر شخص کو اہتمام میں لایا جائے، حلقہ دارالعلوم میں حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی اور نہیں تھا جو اس اہم ترین ضرورت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں اجلاس صد سالہ، کیمپ دارالعلوم کے موقع پر مولانا موصوف کے جوشِ عمل، اصابتِ فکر اور قوتِ تنفیذ کی تحسین و توصیف اپنوں اور غیروں سب نے کی تھی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان موقعوں پر مولانا کیرانوی نے سخت نامساعد حالات کے باوجود جس حسن انتظام، قوتِ عمل اور ہمہ گیر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا اس کی مثال تلاش کرنے سے اس وقت نہیں ملے گی اس لیے دیانتاً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مجلس شوریٰ کا یہ انتخاب صد فی صد درست اور حق بخندار رسید کا صحیح مصداق ہے۔“ (۲)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”مدلل جواب“ (کتاچہ) مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۴۔

۲- ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند“ دسمبر ۱۹۸۴ء مولانا حبیب الرحمن قاسمی ج ۶۷ شمارہ ۱۲ ص ۴۲۔

معاون مہتمم کے منصب جلیل پر فائز ہونے کے بعد آپ نے دفتری نظام میں بڑی حد تک اصلاحات کیں، تعلیمات اور اہتمام سے متعلقہ کاروائیوں میں تیزی کے ساتھ استحکام پیدا ہوا طلباء و اساتذہ، ملازمین کے علاوہ باہر سے آنیوالے مہمان بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے، ان دنوں آپ کے اندر ایک عجیب قسم کا جوش تھا گویا کہ آپ نے تمام اصلاحات کا بیڑہ اٹھالیا تھا اور بہت جلدی اصلاح چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ اراکین شوریٰ اور دیگر بھی خواہاں دارالعلوم آپ کی حسن کارکردگی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اکثر زبانی و تحریری انداز میں آپ کے حسن انتظام کی تعریف کی گئی چنانچہ ایک مرتبہ جامعہ طبعیہ کا معائنہ کرتے ہوئے جناب حکیم افہام اللہ صاحب نے فرمایا ”ماشاء اللہ حقیقت یہ ہے کہ اتنا بہتر کام ہو جائے گا اس کی توقع نہیں تھی۔“

آپ نے یہ اصول بنایا کہ روز کا کام روزانہ پنپا کر اور ہر کاغذ پر حکم اور جواب لکھ کر دفتر کو متحرک کر دیا کسی کلرک یا انچارج کی یہ مجال نہیں رہ گئی کہ وہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں کوتاہی کرے، آپ نے انتظامیہ کو اتنا منظم مربوط اور فعال بنادیا کہ ہر چھوٹا، بڑا ملازم اپنے کارمفوضہیں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں کر سکتا تھا کسی حکم کی تعمیل میں تاخیر سزا کا موجب قرار پائی۔

معاون مہتمم بننے کے بعد آپ نے تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دفتر اہتمام میں جانے کے لیے بے تکی راستوں سے جانا گراں معلوم ہوتا تھا تو آپ نے سامنے سے سیڑھیاں کھڑی کر کے راستہ بھی خوبصورت بنادیا اور دفتر محاسبین پھاٹک لگا کر صاف ستھرا راستہ مہیا کر دیا، اسی طرح دارالعلوم میں طلبہ کے رہنے کے لیے ”رواق خالد، دارالتر بیت“ جیسی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر دی، ان عمارات کے لیے بذات خود چندہ اکٹھا کیا، حالانکہ اس دوران مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن آپ نے ان کی پرواہ نہیں کی اور مسلسل دارالعلوم کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے مگر جب مخالفتوں کے سلسلے نے شدت اختیار کر لی، تو آپ خاموشی سے اس عہدہ سے دستبردار ہو گئے اور دوبارہ تدریس پر واپس چلے گئے۔ (۱)

## دارالعلوم کا سانحہ

اجلاس صد سالہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء کو سر زمین دیوبند میں منعقد ہوا یہ جلسہ روئے زمین کے اسلامی اجتماعات میں ایک منفرد اجتماع تھا جس میں عالمی پیمانہ کے اہل علم، اہل دل اور اہل قلم سر کے بل آئے تھے مولانا وحید الزماں صاحب اجلاس کی متعدد کمیٹیوں کے کنوینر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی عربی دانہ، خطابت اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اجلاس کی کاروائی چلانے کے ذمہ دار بھی بنائے گئے تھے۔ مگر کاموں کے ہجوم میں اس قدر بیمار ہوئے کہ اجلاس تک پہنچ بھی نہ سکے، پھر بھی بحالت مرض ایک ایک چیز سے واقفیت رکھتے رہے۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ترجمان اسلام“ بنارس مئی ۱۹۹۵ء مولانا اسیر اوروی ص ۳-۷۔

اجلاس کا جو پروگرام پہلے سے بنا تھا اس میں کئی باتوں میں سے ایک بات ”تنظیم انباء قدیم“ کی تجویز بھی تھی مگر کسی نامعلوم وجہ سے نہ مجلس بلائی گئی نہ تجاویز تیار کی گئیں، انتظار کے بعد ۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء میں کچھ لوگوں نے اشتہار چھاپ کر بانٹ دیئے کہ آج شام ۴ بجے معراج گیٹ کے پاس والے خیمہ میں آزادانہ طور سے انباء قدیم کی تنظیم کا خاکہ تیار کیا جائے گا۔

چنانچہ پاکستان، افغانستان، افریقہ اور ہندوستان سے گجرات، اتر پردیش، آسام وغیرہ کے ہزاروں فرزندان دارالعلوم وہاں پہنچ گئے اور مغرب سے پہلے تک ”عالمی مؤتمر انباء قدیم دارالعلوم دیوبند“ کے نام سے فضلاء دارالعلوم کی ایک تنظیم قائم کر دی گئی، پاکستان کے مفتی محمود صاحب اور ہندوستان کے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب سرپرست بنائے گئے، مولانا اسعد مدنی صاحب صدر اور مولانا قاضی زین العابدین ناظم عمومی۔

۲۳ مارچ کی صبح اعلان کے مطابق عالمی مؤتمر کے دفتر کاسنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس میں مولانا علی میاں صاحب نے بھی شرکت کی اسی شام مفتی محمود صاحب کی قیام گاہ پر مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اس میں مولانا وحید الزماں نامزد ممبر منتخب کئے گئے اور وہی ہندوستان کے مختلف صوبوں اور بیرون ملکوں کے لیے کنوینر مقرر کئے گئے۔

اجلاس صد سالہ کے پندرہ دن بعد دہلی میں دارالعلوم دیوبند کے دفتر رابطہ کی جانب سے ۸ اپریل ۱۹۸۰ء کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ اجلاس صد سالہ میں کئی دیگر تجاویز کے ساتھ ساتھ انباء قدیم کی تنظیم بھی پاس ہوئی تھی جس کے صدر حضرت قاری محمد طیب بنائے گئے تھے۔ اس تنظیم کا نام ”تنظیم فضلاء انباء قدیم دارالعلوم دیوبند“ تھا، اس اطلاع سے ان لوگوں کو حیرت ہوئی جو اس جلسہ میں شریک تھے اور جنہوں نے ”عالمی مؤتمر انباء قدیم“ کی بنیاد ڈالی تھی، لہذا یہیں سے واضح اختلاف شروع ہو گیا۔ اگرچہ دارالعلوم میں نظریات کا اختلاف شروع سے ہی رہا ہے اور ہمیشہ یہاں کے لوگ دو نظریات حامل رہے ہیں لیکن وہ نظریات کبھی اختلاف کی شکل میں رونما نہیں ہوئے، یہ پہلا موقع تھا جہاں سے اختلاف کا ظہور شروع ہوا اور باقاعدہ گروپ بندی شروع ہو گئی اور دارالعلوم میں دو تنظیم قائم ہو گئی۔ چنانچہ جب دو تنظیمیں قائم ہیں تو قدرتا پہلے فضلاء تقسیم ہوئے، پھر ایک ایک صوبہ اور پورا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، حتیٰ کہ دارالعلوم کے طالبہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، عالمی مؤتمر نے ماہنامہ ”القاسم“ جاری کر کے نشر و اشاعت اور تنقید و تبصرہ کا کام شروع کر دیا اور ”تنظیم فضلاء“ نے امام انقلاب اور دیوبند ٹائمز جیسے ہفتہ واری اخباروں سے کام لینا شروع کر دیا دونوں طرف سے ایک الزام تراشی اور قلمی جنگ شروع ہو گئی۔ دارالعلوم کی اندرونی خبریں پورے ہندوستان میں پھیلنی شروع ہو گئی اور ہر طرف ہنگامہ شروع ہوتا چلا گیا۔ (۱)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”دارالعلوم کا المیہ واقعات کے آئینہ میں (کتابچہ) مولانا حبیب الرحمن ص ۷-۱۲۔

۲۲ اپریل کو دفتر اہتمام نے اساتذہ کی میٹنگ کر کے فرمائش کی کہ آپ لوگ ”تنظیم فضلاء قدیم“ کو مضبوط کریں، اس پر مولانا معراج الحق اور مولانا وحید الزماں صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ پہلے تنظیم کو مجلس شوریٰ سے پاس کرائیں پھر ہم لوگوں پر نافذ کریں۔ چنانچہ ۲۴ اپریل کو شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی لیکن ممبران اس میں حاضر نہ ہو سکے اور مجلس شوریٰ کا اجلاس نہ ہو سکا ۲۵ اپریل کو دفتر اہتمام سے اعلان کیا گیا کہ تنظیم کے ناظم اعلیٰ مولانا اخلاق حسین قاسمی ہونگے۔

یہ حالات تو خارجی اعتبار سے تھے لیکن اندرونی حالات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ مئی ۱۹۸۰ء میں مولوی عبدالحق پیشکار کی پوتی کی شادی تھی اس شادی کے انتظام و انصرام میں پورے غیر تدریسی عملہ کو لگادیا یہاں تک کہ دارالعلوم کے جزیئر کونکیشن دارالعلوم سے ختم کر کے بارات گاہ میں بجلی کا انتظام کر دیا گیا اسی حال میں سبق کے دوران بجلی چلی گئی جزیئر شادی میں مشغول تھا لہذا جن درسگاہوں میں بذریعہ مائیک سبق ہوتا ہے ان کے اسباق بند کرنے پڑے۔ اس کے خلاف طلباء نے غصہ کا اظہار کیا تو انکی مذمت کی گئی اور ان میں سے بعض کو مجرم قرار دیا گیا۔ (۱)

اس وقت بے حسی اور بدنظمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک چہرہ اسی بھی خود کو مہتمم سے کم نہیں سمجھتا تھا طلبہ کی توقعت کیا عام اساتذہ کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی، صرف چند اساتذہ کو چھوڑ کر جو انتظامیہ کے حلقہ کے شمار ہوتے تھے لہذا ایسے حالات میں انقلاب کا رونما ہونا لازمی تھا کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ حاکم کی بے حسی جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اللہ اس نظام کی اصلاح کے لئے کوئی طاقتور گروہ پیدا کر دیتا ہے چنانچہ یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا۔ طلبہ کو مسلسل نظر انداز کر نیکی وجہ سے طلبہ کے اندر انتظامیہ کے خلاف غم و غصہ کا پایا جانا امر تعدوی تھا، پھر طلبہ کو ان لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی جو اس نظام کو ہی ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے طلبہ کے اندر غم و غصہ پیدا کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا، اگرچہ نظام میں تو واقعی خرابی تھی لیکن اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں ان حضرات کا بھی ہاتھ تھا جن کا مقصد دارالعلوم پر اپنا کنٹرول کرنا تھا اس چیز کو انتظامیہ نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی اور نہ ہی نظام کی خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ زیادہ تر مخالف گروپ سے منسلک ہوتے گئے یہاں تک کہ تقریباً اسی فیصد طلبہ انتظامیہ کے خلاف ہو گئے۔ نوبت بایں جا رسید کہ طلبہ نے ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے اور ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں میں دخل اندازی شروع کر دی، پھر انتظامیہ کی ناسمجھی یہ کہ انہوں نے طلبہ کے خلاف انکوائری کمیٹی مقرر کر دی جب طلبہ نے اس کی بھی مخالفت کی تو ان سے تصادم کی صورت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ ایک طالب علم کو باقاعدہ زرد کو ب کیا گیا اور بعد میں اسے پولیس کے حوالے بھی کر دیا گیا۔ اگلے روز ہنگامہ کے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”دارالعلوم کا المیہ واقعات کے آئینہ میں (کتابچہ) ص ۱۵-۱۷۔



خوف سے چند اساتذہ نے اسے رہا کر ایسا دور ان اہتمام نے مجلس شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ طلب کر لی اس میٹنگ میں جو واقعات پیش آئے اور جیسا کچھ ممبران کے ساتھ سلوک کیا گیا وہ علماء کی شایان شان نہیں تھا اسی مجلس شوریٰ کے دوران مولانا اسعد مدنی صاحب نے حضرت قاری صاحب سے ملاقات کر کے معاملات صاف کرنے کی پیش کش کی۔ لہذا طے پایا کہ اگلے روز کی میٹنگ میں مؤتمر اور تنظیم فضلاء کے جھگڑے کو ختم کر کے تمام معاملات صاف کر لئے جائیں گے، لہذا اگلے روز میٹنگ میں صلح و صفائی ہو گئی اور چند نکات پر اتفاق ہو گیا جو حسب ذیل ہیں:

(۱) عالمی مؤتمر اور تنظیم کو ایک کر دیا گیا اور اسکے صدر حضرت قاری صاحب ہو گئے اور نائب صدر مولانا اسعد مدنی صاحب۔

(۲) مجلس عاملہ کے ۳۱ ارکان ہو گئے اس میں ۱۳-۱۳ افراد دونوں طرف کے ہو گئے باقی ارکان غیر ممالک سے پورے ہو گئے اور ناظم اعلیٰ قاضی زین العابدین ہو گئے۔

(۳) ایک ناظم مولانا حبیب الرحمان اعظمی صاحب ہو گئے اور دو نظماء کا تقرر صدر محترم کریں گے۔

(۴) خازن کا تقرر حضرت مہتمم صاحب (صدر محترم) کریں گے۔

(۵) صدر دفتر دیوبند ہو گا جسکی جگہ منتخب ہونیوالی مجلس میں طے کی جائیگی۔

مغرب کے بعد یہ میٹنگ ہو گئی اور عشاء کے بعد اگلی میٹنگ میں بقیہ چیزیں طے کر لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مصالحت کا جب مولانا انظر شاہ صاحب اور صاحبزادہ مولانا محمد سالم کو علم ہوا تو انہوں نے اس فیصلہ کو کلی طور سے ماننے سے انکار کر دیا اور اسمیں چند شرائط کا اضافہ کر دیا۔ یہ بحث چل رہی تھی کہ ایک صاحب جو تحفظ ختم نبوت کے ممبر بھی تھے انہوں نے اساتذہ پر الزام تراشی شروع کر دی اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا جس سے وہاں موجود ایک طالب علم سے ان کا جھگڑا شروع ہو گیا اور انہوں نے طالب علم پر ہاتھ اٹھا دیا۔ یہ دیکھکر طلبہ نے مہمان خانہ کو گھیر لیا اور ان صاحب کو طلبہ کے حوالے کرنے کی مانگ کرنے لگے اس درمیان بہت سے لوگوں کے لیے طلبہ نے نامناسب الفاظ کا استعمال طلبہ نے کیا حالانکہ یہ چیز غیر مناسب تھی، بقول ایک استاد طلبہ نے انکے گھر میں گھس کر تلاشی تک لی بہر حال یہ معاملہ مولانا وحید الزماں اور مولانا معراج الحق اور دوسرے اساتذہ کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ ان حالات کے پیش نظر تمام ممبران دہلی چلے گئے اور عالمی مؤتمر اور تنظیم فضلاء کا فیصلہ نامکمل رہ گیا۔ (۱)

چنانچہ اس واقعہ کو اخبار اور ریڈیو نے اس طرح پیش کیا کہ دارالعلوم کے طلبہ کے دو گروپ میں آپسی تصادم کی وجہ سے دارالعلوم بند کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”غیر مطبوعہ ریکارڈ“ دفتر محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند۔

تعلق نہیں تھا یہ خبر دارالعلوم کے ناظم نشر و اشاعت اعجاز صاحب کے حوالے سے دی گئی تھی۔ اگلی صبح حضرت مہتمم صاحب نے اساتذہ کی میٹنگ بلوائی جس میں ۱۲ حضرات شریک ہوئے اس میں اس درخواست پر غور کیا گیا جو طلبہ نے امتحان کی منسوخی کے سلسلے میں دی تھی چنانچہ یہ فیصلہ لیا گیا کہ اسال تعلیم کے نقصان کی وجہ سے سالانہ امتحان منسوخ کر دیئے جائیں میٹنگ میں حضرت قاری صاحب نے حمایت کی کہ اس کا اعلان باقاعدہ اہتمام کی طرف سے کیا جائیگا اپنے طور سے اس کا اعلان نہ کیا جائے لیکن بقول حضرت مہتمم صاحب کہ مولانا وحید الزماں اور مولانا معراج الحق نے طلبہ میں اس کا اعلان کر دیا اور طلبہ کو یہ باور کرایا گیا کہ امتحان کی منسوخی انہیں کی محنت کا نتیجہ ہے اس پر دار جدید میں ان لوگوں نے اپنی جیت کا جشن بھی منایا بہر حال سالانہ چھٹی کا اعلان کر دیا گیا طلبہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے لیکن اس خبر کو ریڈیو نے اعجاز صاحب کے حوالے سے اس طرح بیان کیا کہ ”دارالعلوم کو شورش پسندوں کی وجہ سے بند کرنا پڑا اور امتحانات بھی منسوخ کرنے پڑے۔“

سالانہ تعطیل کے بعد دارالعلوم ۲۵ شوال کو کھولا گیا اور سب سے پہلے ۲۸ طلبہ کے اخراج کی فہرست آویزاں کر دی گئی قدیم طلبہ کا اصرار تھا کہ اخراج واپس لیا جائے لیکن انتظامیہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ فضاء دونوں طرف سے گرم تھی اسی دوران مولانا وحید الزماں حضرت قاری صاحب کے گھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت آپ کچھ اس طرح اقدام کریں کہ دارالعلوم کا سکون بحال ہو سکے۔ اس پر حضرت قاری صاحب نے فرمایا ”میرا مزاج سنجیدگی و سکون سے کام کر نیکا ہے اس لئے میں نے مفتی عتیق الرحمان صاحب وغیرہ سے کہہ دیا ہے کہ اگر آپ لوگوں کو لڑنا ہے تو کمانڈر بدل دیجئے اور صلح رکھنی ہے تو مجھے مزید اختیارات دے دیجئے۔ (۱)

اسی طرح مختلف وفود آئے اور با اثر لوگوں نے بھی یہ درخواست کی کہ جمعیتہ الطالبہ نہ سہی لیکن طلبہ کی عام پریشانیوں اور ان سے رابطہ کے لئے ایک کمیٹی بنادی جائے جو انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان رابطہ کا کام کرے اور دونوں طرف کی غلط فہمیاں دور کر سکیں کیونکہ بہت سے جھگڑوں کی بنیاد صرف غلط فہمی ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی دوران مولانا ریاست علی صاحب نے مولانا وحید الزماں اور مولانا نظر شاہ کشمیری صاحبان کو اپنے گھر بلا کر صلح کرنے پر راضی کر لیا اور ایک صلحنامہ تیار کرایا جو دس دفعات پر مشتمل تھا جن میں سے چند یہ ہیں :

(۱) جمعیتہ الطالبہ کی جگہ سات رکنی کمیٹی بنائی جائے۔

(۲) دورہ حدیث کے طلباء کا اخراج نہ کیا جائے بلکہ انہیں سند دیکر رخصت کر دیا جائے باقی طلبہ کی تفتیش کر کے فیصلے کئے جائیں۔

(۳) تنقید و تبصرہ دونوں طرف سے بند کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ چند چیزیں اور بھی طے کی گئی ان تمام چیزوں کے بارے میں مولانا نظر شاہ کشمیری صاحب نے فرمایا کہ اس معاہدہ کو حضرت قاری صاحب کے سامنے پیش کر کے اسکی منظوری لے لوں گا لیکن اسے اتفاق کہئے یا مصلحت خداوندی کہ اسی روز مولانا فخر الحسن صاحب مرآۃ ابادی کا انتقال ہو گیا، چنانچہ کچھ طلبہ نے تعزیتی جلسہ کا پروگرام رکھا لیکن حالات کے پیش نظر مولانا وحید الزماں اور دیگر اساتذہ نے عین وقت پر اس جلسہ کو ختم کر دیا اس جلسہ میں شرکت کے لئے کچھ باہر کے شہری لوگ بھی آئے تھے۔ اس میں سے کچھ لوگوں کو دارالعلوم سے باہر نکال دیا گیا اور دارالعلوم کا دروازہ بند کر کے چند طلبہ پہرہ دینے لگے جنکا مقصد شرپسند عناصر کو دارالعلوم میں آنے سے روکنا تھا کہ دارالعلوم کے کسی شخص کو روکنا، چنانچہ صبح دارالعلوم حسب معمول کھلا اور ماحول پر اس واقعہ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا لیکن اگلے دن ۱۸ دسمبر کے اخبارات میں یہ خبر آئی کہ دارالعلوم پر قبضہ جمانے کے لئے مولانا وحید الزماں اور مولانا معراج الحق نے پھانک بند کر دیئے معزز شہریوں پر حملے کئے گئے اور طلباء کی طرف سے دارالعلوم میں توڑ پھوڑ کی گئی اس پر مزید یہ کہ یہ خبر عوام میں پھیلائی گئی اور بطور ثبوت اخبارات کی کٹنگ پیش کی گئی۔ (۱)

چنانچہ حالات جب مزید خراب ہونے لگے تو مقامی حکام نے بھی صلح صفائی کرانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے، تین روز بعد حضرت قاری صاحب نے مولوی وحید الزماں صاحب کو اپنے گھر بلا کر مصالحت کا فارمولہ پیش کیا لیکن بقول مولانا وحید الزماں اگرچہ وہ فارمولہ میری طبیعت کے بالکل موافق نہ تھا لیکن قاری صاحب نے ایک طرف لیجا کر فرمایا مولوی وحید الزماں آج تو میری لاج رکھ لو معاملات کو اس وقت آگے چلنے دو پھر جیسا کہو گے کر دیا جائیگا۔ اس پر میں نے دستخط کر دیئے تاکہ دارالعلوم بند نہ ہو۔ (۲)

حضرت قاری صاحب نے اسکے بعد فوراً شورلی کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کر لی چنانچہ دفتر اہتمام نے ستر صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کی جو ۱۱-۱۲ اکتوبر کی میٹنگ میں سنائی گئی اس رپورٹ میں دفتر اہتمام نے کچھ اساتذہ پر بغاوت کا الزام لگایا جن میں مولانا معراج الحق، مولانا وحید الزماں، مولانا ریاست علی بجنوری، مفتی سعید احمد پالنپوری، مولانا عبدالخالق مدراسی تھے۔ یہ سب مخالف گروپ سے تعلق رکھتے تھے اور ان تمام کو سخت سے سخت سزا کا مستوجب قرار دیا گیا بلکہ اس کی سفارش بھی کی گئی اسی طرح ان طلبہ کے جو جمعیتہ طلبہ کا پرزور مطالبہ کر رہے تھے اخراج کی بھی سفارش کی گئی، اس رپورٹ میں جو چیزیں پیش کی گئی تھیں ان میں بعض تو واقعہ کے موافق تھیں لیکن بعض چیزیں ذاتی رنجش کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں لہذا جب یہ رپورٹ پیش کی گئی تو شورلی کے ممبران نے بھی اس کو من و عن صحیح نہیں قرار دیا کیونکہ ان لوگوں کے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”حدیثِ دفاع“ (کتابچہ) تحریر کردہ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۱۹-۲۱۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”اظہارِ حقیقت“ خبر نامہ عالمی تنظیم اہلہ قدیم ۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء۔

سامنے ماضی کے واقعات بھی تھے۔ اس لئے انھوں نے صرف رپورٹ کو سامنے رکھ کر فیصلے نہیں کئے بلکہ اپنے اعتبار سے بہتر اور متفق علیہ فیصلے کئے جن سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ تھی جو تجاویز پاس ہوئی وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) عالمی مؤتمر اور فضلاء کے درمیان جون ۱۹۸۰ء میں جو مفاہمت طے ہو گئی تھی اسے آگے بڑھایا جائے اور اس کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا مرغوب الرحمان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔

(۲) جن اساتذہ پر فرد جرم عائد کی گئی ہے ان کو صفائی کا موقع دیا جائے اور ان سے جواب طلب کیا جائے پھر ان جوابات کو مجلس شوریٰ کے سامنے رکھا جائے تاکہ مجلس فیصلہ کر سکے۔

(۳) اجلاس صد سالہ کی پچی رقبہ بینکوں سے نکال کر اس سے یونٹ ٹرسٹ بمبئی کے حصص خرید لئے جائیں۔

(۴) صد سالہ کے حسابات ”مختلف شعبہ جات کی کارکردگی اور کارگزاری کا جائزہ لیکر دو ماہ بعد رپورٹ پیش کی جائے۔ اس کام کے لئے اکابرین ملت کا سہ نفری کمیشن مقرر کر دیا گیا۔

(۵) دارالعلوم کا جو دفتر رابطہ اور نشر و اشاعت کے لئے دہلی میں قائم کیا گیا تھا اسے بند کر دیا جائے

(۶) رپورٹ کے مطابق چند سرغنہ طلبہ کا اخراج کر دیا گیا

(۷) پیشکار عبدالحق کا دوسرے دفتر میں تبادلہ کر دیا گیا۔ (۱)

اس طرح تقریباً چودہ فیصلے کر کے ممبران چلے گئے اور چند روز بعد ہی حضرت قاری صاحب بھی سفر انگلستان پر چلے گئے لیکن شوریٰ کے ان فیصلوں کے تین چار روز بعد اخبارات نے مختلف قسم کی رپورٹیں شائع کیں چنانچہ امام انقلاب نے لکھا ”ہوائی جہازوں کا کرایہ وصول کرنے والے قوت فیصلہ سے محروم، بزدل اور اپانچ ممبران شوریٰ کو کیا دارالعلوم کا محافظ سمجھا جاسکتا ہے“ ایک دوسرے پندرہ روزہ اخبار ”اجتماع دیوبند نے اپنے اکتوبر ۱۹۸۰ء کے ضمیمہ میں حسب ذیل سرخیوں کے تحت رقم طراز ہوا ”آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم یہ فسانہ ہو گیا پھر آگے لکھا ”ہمارے خیال میں دارالعلوم کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ممبران شوریٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور اقدامات بھی ہونے چاہئے اگر صرف ممبران شوریٰ پر تکیہ کر کے بیٹھے رہے تو ممکن ہے کہ دارالعلوم گندی سیاست کا اڈہ بن جائے“ اس نے مشورہ دیا کہ حضرت مہتمم صاحب کو شوریٰ کا اجلاس طلب کرنے کے بجائے خود مسائل حل کرنے چاہئے شوریٰ کے ممبران کو چوں و چرا کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے کہ انہیں دارالعلوم کی طرف سے جو اعزاز ملا ہے وہ فری فنڈ کا ہے اور فری فنڈ کے اعزاز کو باقی رکھنے کے لئے ممبران خود سوچیں گے اس خبر کا تعلق بھی دہلی کے دفتر رابطہ سے ہی تھا۔ (۲)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”دارالعلوم کا المیہ واقعات کے آئینہ میں“ (کتابچہ) مولانا حبیب الرحمن ص ۸۳-۸۴۔

۲- غیر مطبوعہ ریکارڈ دفتر تنظیم ابناء قدیم، نئی دہلی۔

بہر حال جب یہ اخبارات مختلف جگہوں پر پہنچے اور ممبرانِ شوریٰ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک مشترکہ بیان جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا منت اللہ رحمانی نے وضاحت کی جسے روزنامہ ”عزائم“ لکھنؤ نے اپنے ۲۲ نومبر ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں حسب ذیل عبارت کے ساتھ بیان کیا:

”اس موقع پر اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کا ایک دستور ہے جس کے تحت زمانہ قدیم سے دارالعلوم کا پورا انتظام چل رہا ہے شوریٰ اس دستور کی روشنی میں اور تصریحات کی بنیاد پر ہی حاکم ہے اور دارالعلوم کے تمام معاملات میں اسے آخری اختیارات حاصل ہے دارالعلوم کے دستور کا یہی تقاضا ہے اور عرصہ دراز سے اسی پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

۱۱-۱۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو شوریٰ کا اجلاس ہوا اور اس نے پورے متیقظ سے فیصلے

کئے اور اپنا فرض انجام دیا۔“ (۱)

چنانچہ یہ رسہ کشی چل رہی تھی اور اس لڑائی کا رخ دوسری طرف ہو گیا تھا اب شوریٰ پر نکتہ چینی شروع ہو گئی اور اسے ایک طرح سے ناکارہ ثابت کر نیکی مہم چلائی گئی جسکی وجہ صرف یہ تھی کہ شوریٰ نے اہتمام کی رضا کے مطابق آنکھ بند کر کے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا جس سے انتظامیہ کا گروپ اس کا مخالف ہونے لگا تھا لہذا انہوں نے شوریٰ کو ہی ختم کر دینا فیصلہ کر لیا اور عوام کی ذہن سازی کے لئے دیوبند ٹائمز اور انقلاب جیسے اخبارات کا سہارا لیا گیا، یہ سب حضرت قاری صاحب کی عدم موجودگی میں ہوا لیکن جیسے ہی حضرت مہتمم صاحب سفر انگلستان سے واپس آئے تو آپ نے بھی بجائے اس کے کہ ان لوگوں کو تنبیہ کرتے جنہوں نے اس طرح کی خبریں شائع کر کے دارالعلوم کے وقار کو ٹھیس پہنچائی ہے خود حضرت قاری صاحب بھی ان لوگوں کی باتوں میں آگئے اور آپ نے ان اخبارات کی ہمت افزائی اور شکر یہ ان الفاظ میں ادا کیا:

”سفر انگلستان سے واپسی کے بعد چند مضامین نظر سے گزرے جو دارالعلوم کی

ہمدردی پر مشتمل تھے۔ لیکن مقالات میں مجلس شوریٰ کو مستقل ہدف بنایا گیا۔ میرے خیال میں عموم کے ساتھ سب کو ایک ذیل رکھ کر تنقید کرنا موزوں نہیں ہے اس کے علاوہ دارالعلوم کا دستور اساسی زیر بحث لایا گیا وہ اس حد تک صحیح ہے کہ وہ بہت حد تک اصلاح کے قابل ہے کوشش کی جاوے گی کہ وہ از سر نو مرتب کر دیا جائے اور یہ شکایات رفع ہو جائے، بہر حال ان اخبارات اور جرائد کا جنہوں نے دارالعلوم کی حمایت میں مضامین

لکھے ہیں۔ ہم خدام دارالعلوم صمیم قلب سے ان کے شکر گزار ہیں“ (۱)

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اخبارات نے لکھا تھا وہ حضرت قاری صاحب کی رائے کے خلاف نہیں تھا۔ اس وقت حضرت قاری صاحب کی حالت یہ تھی کہ جو کچھ مشیر کار سمجھا دیتے وہ اسی کے قائل ہو جاتے ان تمام معاملات میں آپ کی حیثیت محض آلہ کار کی سی تھی آپ کی قوت فیصلہ اور قوت سماعت دونوں ہی کمزور ہو چکی تھی جس کا فائدہ آپ کے قریبی لوگوں نے خوب اٹھایا آپ کو شورئی سے بد ظن کیا گیا۔ کیونکہ کچھ فیصلے شورئی نے ایسے کئے جن پر حضرت قاری صاحب راضی نہیں تھے۔ اب معاملہ شورئی سے ٹکراؤ کا ہو گیا اور شورئی کی حیثیت قاری صاحب کی نظر میں کچھ نہیں رہی تھی۔ اب دارالعلوم کے مسائل کے سلسلے میں شورئی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور خود ہی تمام فیصلے لینے شروع کر دیئے اور خود ہی دو نہایت اہم فیصلے کر ڈالے (الف) ایک تو مدرسین کی تنخواہ اور طلبہ کے وظیفہ میں دو گنا اضافہ کر دیا (ب) دوسرا اہم ترین فیصلہ یہ کیا کہ مولانا محمد سالم صاحب کو نائب مہتمم اور مولانا انظر شاہ کشمیری صاحب کو قائم مقام صدر مدرس مقرر کر دیا۔ اس فیصلے پر مولانا انظر شاہ صاحب نے بڑی نخوت سے کہا کہ ”کون کہتا ہے کہ اسلام میں وراثت کی بنیاد پر عہدے تقسیم نہیں ہوتے۔ ہم اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مسند خلافت پر دودو<sup>۲</sup> خسر اور دو، دو داماد نظر آتے ہیں اگرچہ ماہ کی خلافت خلافت تھی تو ایک نواسہ بھی تھا۔ (۲) ان فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاری صاحب کو مطلق العنانی کے راستہ پر لگادیا گیا تھا۔

کسی مشورہ میں چند اساتذہ کے علاوہ کسی بڑے استاد کے مشورہ کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے دارالعلوم کا احاطہ میدان جنگ نظر آنے لگا ایک طرف مجلس شورئی اور دارالعلوم کے کچھ بڑے اساتذہ اور دوسری طرف حضرت قاری صاحب اور ان کے ہمنوا آپس میں ایک سرد جنگ چلتی رہی اور اندر ہی اندر کینسر کی طرح ایک لاوا بن گیا جو کسی بھی وقت پھوٹ سکتا تھا۔ اسی دوران مولانا مرغوب الرحمن صاحب کی تحریک پر مجلس شورئی کی میٹنگ طلب کر لی گئی۔ اس میٹنگ میں جب تمام معاملات کی حضرت قاری صاحب سے وضاحت طلب کی گئی اور بہت سی چیزیں نامناسب پائی گئی تو ان تمام چیزوں سے شرمندہ ہو کر حضرت قاری صاحب نے اپنا استعفا پیش کر دیا، مجلس شورئی نے آپ کا استعفا قبول نہیں کیا ہاں البتہ چند ترمیم ضرور کر دی۔ مولانا محمد عثمان صاحب کو نائب مہتمم اور مولانا مرغوب الرحمن صاحب کو معاون مہتمم اور مولانا معراج الحق صاحب کو صدر مدرس بنایا گیا۔ حضرت قاری صاحب اپنے فیصلہ

۱- دارالعلوم کا المیہ واقعات کے آئینہ میں (کتابچہ) مولانا حبیب الرحمن ص ۳۶۔

۱- روزنامہ قومی آواز نئی دہلی ۱۶ دسمبر ۱۹۸۱ء۔

۲- غیر مطبوعہ ریکارڈ دفتر محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند۔

کو (جس میں مولوی محمد سالم صاحب کو نائب مہتمم اور مولوی انظر شاہ صاحب قائم مقام صدر مدرس بنا گیا تھا) واپس لے لیا۔ لیکن مجلس شوریٰ کے سامنے اس کی سفارش ضرور کی کہ مولانا محمد سالم صاحب کو نائب مہتمم مقرر کر دے بقول مولانا محمد منظور نعمانی اس وقت حضرت مہتمم صاحب کو اس کا ایک طرح سے خبط سوار تھا جس میں وہ اپنے مرتبہ تک کو نہیں پہچان رہے تھے حالانکہ اس طرح کی ضد کے بارے میں ان کی ذات سے کبھی کوئی اس طرح کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ (۱)

لیکن مجلس شوریٰ بھی اپنے فیصلے پر قائم رہی اور اس نے اس سفارش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا اس کو حضرت قاری صاحب اور ان کے ہمنواؤں نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور قاری صاحب کے کچھ مشیروں نے مجلس شوریٰ کو ختم کرنے اور دستور اساسی میں ترمیم کرنے کی صلاح دی، جس پر قاری صاحب نے دہلی میں چند ممبران اور وکلاء کی موجودگی میں شوریٰ کو کالعدم قرار دیا اور اس کی جگہ ایک کمیٹی مقرر کر دی اور اس کا پہلا اجلاس بھی دیوبند میں بلایا گیا جس میں باہر کا کوئی بھی ممبر شریک نہ ہو سکا اس لحاظ سے یہ میٹنگ ناکام ہو گئی لیکن اس میں موجود چند مقامی ممبران نے دستور میں ترمیم کی توثیق کر دی۔ (۲)

ان تمام واقعات پر اگر غور کیا جائے کہ حضرت قاری صاحب جو ایک مدت سے دارالعلوم کے مہتمم تھے ان سے اس طرح کی باتیں سرزد ہونا سوائے کبر سنی کے کچھ اور سبب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ کی کمزوری کے ساتھ ساتھ قوت فیصلہ میں بھی کمزوری آ جاتی ہے ورنہ آپ سے اس طرح کی باتیں سرزد ہونا آپ کی شایان شان نہیں تھی کیونکہ حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ جو باتیں آپ کے ذہن میں بٹھادی جاتی تھیں آپ انہیں پر بھند ہو جاتے آپ کی رائے کو اس میں دخل نہ ہوتا۔ بہر حال دارالعلوم نازک دور سے گزر رہا تھا۔ اب دونوں فریق بالکل آمنے سامنے تھے۔ اتحاد و اتفاق کی تمام کوششیں رایگاں ہو گئی تھیں۔ اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور دارالعلوم کب بند ہو جائے لوگوں کے نظریات جدا گانہ تھے۔ اور آئندہ کے فیصلوں پر سب کی نظر تھی، سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اب دارالعلوم بند کر کے اپنے شرائط پر کھولا جائے گا۔ چنانچہ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے مؤتمر عالمی کے لوگوں نے ایک میٹنگ بلائی جس میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث لایا گیا کہ اگر دارالعلوم بند کر دیا گیا تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لوگوں نے مختلف آراء پیش کی، تنہا مولانا وحید الزماں وہ شخص تھے جنہوں نے یہ کہہ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا کہ اگر ”ایسا ہوا تو ہمیں طلبہ کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔“

بہر حال دارالعلوم کے صدر گیٹ پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو کچھ طلبہ میں جھگڑا ہو گیا اور ایک طالب علم کو کچھ دوسرے گروپ کے طلبہ نے اس قدر مارا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا اسے ہسپتال پہنچایا گیا اس سے طلبہ

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ الفرقان“ لکھنؤ اکتوبر ۱۹۸۱ء مولانا محمد منظور نعمانی ص ۵-۲۱

۲- ”تضییہ دارالعلوم دیوبند واقعات و حقائق کی روشنی میں“ (کتابچہ) شعبہ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند ص ۱۷۔

میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو گئی جس کی بناء پر پولیس کا تعاون حاصل کیا گیا اور دارالعلوم کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس نے اعلان کر دیا کہ طلبہ دارالعلوم کو ایک گھنٹہ کے اندر اندر خالی کر دیں۔ اس طرح دارالعلوم کی سوسالہ روایت کو ختم کر دیا گیا۔ اب وہی دارالعلوم جو بزرگان دین کی آماجگاہ تھا پولیس کے جوتوں سے روند گیا۔

### کیمپ دارالعلوم دیوبند

اکتوبر میں چونکہ شوریٰ کا عدم قرار دے دی گئی تھی اور دارالعلوم اندرونی کشمکش کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا تمام معاملات میں حکومت کی دخل اندازی شروع ہو گئی تھی۔ باہر کے معاملات کو مولانا اسعد مدنی اور مولانا منظور نعمانی صاحبان وغیرہ نے سنبھالا اور قدم قدم پر مقدمہ شوریٰ کا انعقاد وغیرہ کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

دوسری طرف جب دارالعلوم خالی کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا اور طلبہ کے لئے مدنی گیٹ پر بس آگئی اس وقت مولانا وحید الزماں نے طلباء کی تعلیمی اور انتظامی خدمات سنبھالی۔ چنانچہ پولیس سے اجازت لے کر اپنے طلباء کو بسوں سے اتار لیا اور مؤتمر کے دفتر میں لے گئے اور ان سے اپنی اپنی کتابیں اور دیگر سامان لانے کے لئے بھی کہا چنانچہ شام تک محمود ہال کی تینوں منزلیں طلباء سے بھر گئی بہت سے طلباء شہر کی مسجدوں میں قیام پذیر ہو گئے محمود ہال میں طلبہ کے قیام کا انتظام کرنے کے بعد مولانا وحید الزماں صاحب کو فوری طور پر طلباء کے شام کے کھانے کی فکر ہوئی۔ آپ نے دیوبند کے مختلف محلوں کا گشت کیا اور لوگوں سے طلباء کے کھانے کی اپیل کی۔ چنانچہ عشاء تک اتنا کھانا ہو گیا کہ تقریباً ایک ہزار طلبہ کے لئے کافی ہو گیا۔

اگلے روز شام کو میٹنگ ہوئی اور اس میں متفقہ طور پر طے ہوا کہ جو طلباء ٹھہر گئے ہیں ان کے قیام و طعام کے ساتھ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے اسی وقت مؤتمر کے دفتر کا نام ”کیمپ دارالعلوم دیوبند“ رکھا گیا اور اس کے ناظم مولانا وحید الزماں صاحب بنائے گئے۔ نظامت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد آپ کو تمام چیزوں کا انتظام از سر نو کرنا تھا۔ چنانچہ آپ نے تمام ضروری چیزوں کا انتظام اپنے رفقاء کے ہمراہ بحسن خوبی انجام دیا اس کے بعد سب سے اہم مسئلہ جو درپیش تھا وہ یہ کہ سردی کے موسم میں بارش اور بے سروسامانی کے عالم میں تمام طلبہ کو مطمئن کرنا تاکہ طلبہ مصائب سے گھبرا کر کیمپ سے بھاگ نہ جائیں اس کے لئے مولانا طلبہ سے بار بار ملتے ان کے جذبات ابھارتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے، ان کو تسلی دیتے دوسری طرف باہر سے آنے والے لوگوں کی تقریر وغیرہ کا بھی انتظام کرتے چنانچہ تیسرے روز ہی طلباء کی تعلیم شروع کر دی گئی اور تمام جماعتوں کے پڑھانے کا انتظام کر دیا گیا۔ لیکن کیمپ میں تمام طلبہ کے قیام اور ان کی تعلیم کے انتظام کو دیکھتے ہوئے دارالعلوم کی انتظامیہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ طلبہ کے رہتے ہوئے وہ اپنی مہم



میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے طلباء کو کیمپ سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی اس کیلئے بارہا حکومت کی طرف سے انتظامیہ کو دھمکی دی گئی لیکن کسی موقع پر بھی مولانا وحید الزماں صاحب کے قدم نہیں ڈمگ گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے یہ کہہ دیا کہ ”طلباء یہاں اپنی جان دے سکتے ہیں لیکن کیمپ خالی نہیں کر سکتے“ طلباء سینہ کھول کر سامنے کھڑے ہو گئے اور پولیس واپس چلی گئی اس طرح مخالفین کی طلبہ کو بھگانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ علاقہ کے لوگوں تک صحیح صورت حال پہنچا دی گئی اور انھوں نے بھی دل کھول کر غلہ، پیسہ وغیرہ سے خوب مدد کی جس کے نتیجے میں کافی سہولیات پیدا ہو گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ طلبہ کو جو وظیفہ دار العلوم میں ملتا تھا اسے کیمپ میں جاری رکھا جائے اسی طرح سے کیمپ کے اساتذہ کو بھی دارالعلوم کی تنخواہ کا نصف حصہ دیا جایا کرے چنانچہ اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ (۱)

ان سب کے باوجود مولانا کے سامنے مختلف مسائل تھے۔ مثلاً کیمپ اور طلبہ کے بیچ در پیچ اندرونی و بیرونی مسائل پولیس اور پریس والوں کو مطمئن کرنا۔ باہر سے آنے والوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا مالیات کی فراہمی کیمپ کی تعلیمی و انتظامی نگرانی۔ بہر حال کیمپ کی کلی طور پر پوری ذمہ داری آپ ہی کے سپرد تھی کیمپ کا انتظام و انصرام مولانا ہی کے دم خم سے تشکیل پایا تھا۔ آپ کیمپ کی تمام تر چیزوں سے واقف رہتے۔ تمام فائلوں اور حساب کتاب کے کاغذات کا خود معائنہ کرتے اور ان پر حکم صادر فرماتے۔ کسی کام میں تاخیر بالکل نہیں کرتے تھے آپ فرمایا کرتے کہ ”جو کام اس قابل ہے کہ اسے کیا جائے وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے سلیقہ سے کیا جائے کسی کام کو کل پر چھوڑنے کی عادت بالکل نہیں تھی۔

کیمپ کے رجسٹر کے مطابق ان طلبہ کی تعداد اٹھارہ سو اٹھاون ۱۸۵۸ تھی جو کیمپ سے متعلق تھے۔ مخالفین حکام پر دباؤ ڈالتے کہ کیمپ میں خاصی تعداد غنڈوں کی ہے جنہیں دارالعلوم پر قبضہ کرنے کے لئے طلبہ یا ملازم کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا ہے۔ (۲)

چنانچہ اس مسئلہ پر حکام بار بار مولانا سے ملاقات کر کے ثبوت طلب کرتے، مولانا نے بہت سے دلائل پیش کئے لیکن حکام مطمئن نہیں ہوئے لہذا بطور احتجاج کیمپ سے تحصیل تک مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی قیادت مولانا کے علاوہ کیمپ کے چند اساتذہ کر رہے تھے حکام کی موجودگی میں مولانا نے ایک نہایت پر جوش تقریر کی دوران تقریر جوش کا یہ عالم تھا کہ بار بار مولانا معراج الحق صاحب کو آپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پانی پلانا پڑتا اس تقریر میں مولانا نے حکام کو مخاطب کر کے کہا:

”ہمیں امن کے لئے خطرہ بتایا جاتا ہے، ہمارا مظاہرہ وہاں سے یہاں تک آیا ہے

حکام بتائیں کہ نقص امن تو درکنار کہیں ہماری صفیں ٹیڑھی ہوئی ہوں، انشاء اللہ یہاں سے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم جدید“ نئی دہلی خصوصی شمارہ ۹۹۵ء مولانا انضال الحق جوہر ص ۳۵۹۔

۲- مولانا منزل الحق الحسینی (آفس سکرٹری تنظیم اہلہ قدیم) نئی دہلی بالمشافہ۔

جائیں گے بھی ایسے ہی ہم امن کے لئے خطرہ نہیں ہیں بلکہ ہم امن کے پیامبر ہیں۔ ہم شہریوں کے دشمن نہیں، ہم شہریوں کے دوست اور وہ ہمارے سرپرست ہیں امن کے لئے خطرہ وہ لوگ ہیں جو ہر روز نئی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ آپ کو ہندوستان میں کوئی مثال نہیں ملے گی کہ ہزاروں طلبہ کو سخت سردی اور بے سرو سامانی کے عالم میں سڑک پر لا کر پھینک دیا گیا اور وہ ہر طرح پر امن رہے لیکن ہماری شرافت کو ہماری کمزوری نہ سمجھا جائے۔ ہم حکام کو ایک ہفتہ کا وقت دیتے ہیں یا تو وہ اس مدت میں طلبہ کے لئے دارالعلوم کھول دیں یا پھر ہم اس کے درو دیوار سے نکل کر جائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں دارالعلوم میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے گی۔“ (۱)

مصائب اور پریشانیوں کے اس عالم میں جب کہ مولانا کیمپ کے انتظام حکام کا دباؤ، مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تنہا لوہالے رہے تھے اور ان تمام مصروفیتوں کی وجہ سے مکان سے چور چور ہو جاتے۔ بہار کے ایک طالب علم کی طبیعت خراب ہو گئی اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کی خدمت حاصل کرنے کے باوجود عشاء تک وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا جب یہ خبر مولانا کے پاس پہنچی تو آپ پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی کے ساتھ مولانا کے معتمد خاص مولانا ارشد عثمانی کی طبیعت بھی خراب ہو گئی علاوہ ازیں سب سے بڑی پریشانی یہ کہ موسم بھی خراب ہو گیا، پھر مولانا کے حکم کے مطابق اس کی وفات کی تشہیر کی ممانعت کی گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساری مصیبتیں اسی دن کے لئے تھیں۔ لہذا تمام ترمذی داری مولانا منزل الحق پر آن پڑی چونکہ یہ طالب علم تیسری منزل پر رہتا تھا اور اس منزل کا نقشہ یہ تھا کہ چاروں طرف دیواریں تھیں لیکن چھت نہیں تھی چھت کیلئے اوپر شامیانہ لگایا گیا تھا اس منزل پر رہنے والے تمام طلبہ موسم کی خرابی کی وجہ سے دوسری منزل پر شفٹ ہو گئے تھے تقریباً رات دو بجے زبردست آندھی آئی جس سے شامیانے کی طنائیں اکھڑنی شروع ہو گئی اور جگہ جگہ سے شامیانہ بھی پھٹ گیا، چنانچہ اس طوفان کے عالم میں رات دو بجے مولانا تشریف لائے۔ مولانا نے وہاں کا منظر دیکھا اور شامیانے کی طنائیں پکڑنے میں ان لوگوں کی مدد کرنے لگے۔ لہذا اسی عالم میں مولانا پر غشی طاری ہو گئی اور آپ صبح میں نماز جنازہ میں بھی شرکت نہ کر سکے۔ (۲)

کیمپ کے دوران اس طرح کے بہت سے واقعات پیش آئے۔ جس میں مولانا ہمیشہ پیش پیش رہتے اس طرح کے واقعات سے مولانا کی کیمپ کے دوران محنت اور جفاکشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ بھی آپ پر جاں نثار کرتے تھے، ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن مولانا کی حکم عدولی کر کے کوئی کیمپ چھوڑ کر نہیں گیا۔ کیونکہ ہر مصیبت میں آپ سب سے آگے رہتے۔ خود جس طرح کے جفاکش تھے ایسی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”کیمپ ڈائری“ (غیر مطبوعہ) دفتر تنظیم اہلہ قدیم نئی دہلی۔

۲- مولانا منزل الحق الحسینی (بالشاذہ)۔

ہی اپنے طلبہ کی بھی تربیت کرتے۔

بہر حال کیمپ تمام پریشانیوں کے باوجود پرسکون چل رہا تھا لیکن اس کی عمارت چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس قدر طلبا کا رہنا مشکل تھا۔ اس لئے چند طلباء نے جامعہ طیبہ کے کمروں کے تالے توڑ دیئے اور ان کو رہائش گاہ بنا لیا اس کے علاوہ ایک کمرہ دفتر کیمپ دارالعلوم بنا دیا گیا۔ یہ دیکھ کر پولیس حرکت میں آگئی اور انھوں نے زبردستی کمرے خالی کر لئے۔ چنانچہ اسی وقت ”جمعية الطلبة“ صدر مولوی محمد عثمان ابھٹوی نے دوبارہ کمروں کا تالا توڑ کر طلبہ کو اس میں داخل کر دیا۔ اس پر پولیس نے کاروائی کی دھمکی دی اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیاری بھی شروع کر دی، جب طلبہ نے پولیس کی تیاری دیکھی تو انہوں نے بھی دفاعی انتظام شروع کر دیا۔<sup>(۱)</sup> چونکہ اس دوران مولانا کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور یہ تمام کاروائی آپ کی عدم موجودگی میں انجام پائی تھی لیکن عین وقت پر مولانا تشریف لے آئے، مولانا کو تمام واقعات سے مطلع کیا گیا۔ مولانا نے طلبہ کو کچھ ہدایتیں کیں اور پھر پولیس کے کیمپ کی طرف رخ کر کے جامعہ طیبہ کی چہار دیواری پر کھڑے ہو کر فرمایا:

”یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ دارالعلوم کے طلبہ تو اس کڑا کے کی سردی میں اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور یہاں بھی ان کو چین نصیب نہیں ہے دوسری طرف دارالعلوم کی مقدس عمارتیں غنڈوں اور شریعوں کے جو توں سے پامال ہیں ہم حکام سے ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ کیمپ سے نکلنا تو درکنار ہم مادر علمی کے چپہ چپہ کو آزاد کرائیں گے۔

آپ لوگوں نے بزدلوں کو دیکھا ہو گا جو سنگینوں سے ڈر کر لڑ کھڑا جاتے ہیں، ہم قاسم و محمود کی اولاد ہیں۔ ہم کیمپ کی سر زمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنادیں گے مگر ایک انچ بھی یہاں سے ہٹا گوارہ نہیں کریں گے میں آپ سے رحم کی اپیل کے لئے کھڑا نہیں ہوا ہوں بلکہ یہ کہنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں کہ اگر آپ کے نزدیک یہی انصاف ہے کہ چند خود غرضوں کے کہنے پر نہتے پردیسی اور مظلوم طلبہ کے خون سے اپنا دامن داغدار کرو تو ضرور کرو لیکن اس سے پہلے آپ کی گولی کسی طلبہ کے ناخن پر خراش لائے وہ میرے سینے سے ہو کر گزرنی چاہیے تاکہ حق و صداقت اور مظلوموں کا خون دیکھنے کیلئے میں اس دنیا میں نہ رہوں“ (۲)

مولانا کی اس پر جوش تقریر کے بعد P.A.C. کی صفوں میں انتشار ہونے لگا اور افسران نے مولانا

۱- ڈاکٹر محمد عثمان قاسمی (سابق صدر جمعیتہ الطلبة دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) بالمشافہ۔

۲- کیمپ ڈائری (غیر مطبوعہ ریکارڈ) دفتر تنظیم اہلہ قدیم، نئی دہلی۔

کو مطلع کیا کہ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر مولانا معراج الحق صاحب بھی وہاں پہنچ گئے، مولانا کے بجائے مولانا معراج الحق P.A.C کے کیمپ پہنچ گئے اور اس پر اتفاق ہوا کہ طلبہ مزید کمرے نہ کھولیں اور P.A.C مزید مخالفت نہ کرے۔ چنانچہ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور حالات سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہو گئے۔ انتظامیہ کی طرف سے فیصلہ کی کوئی رقم نظر نہیں آرہی تھی۔ مختلف قسم کے لوگوں نے صلح و صفائی کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ لہذا جب مصالحت کی کوئی شکل نظر نہیں آئی تو مولانا وحید الزماں نے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا اور ۸ مارچ ۸۲ء کو آپ نے علاقے کے لوگوں کی موجودگی میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا جس میں آپ نے تقریر فرمائی:

”اب ہمارا کیمپ چلتا پھرتا مدرسہ ہو گا ہم لوگوں کو بتادیں گے کہ کیمپ میں کتنے طلبہ ہیں حکومت کو بھی اب ہماری آواز پر کان دھرنے ہونگے۔ ہم انھیں بتائیں گے کہ پر امن رہ کر بھی حق لیا جاسکتا ہے۔ غاصبوں کو ہمارا حق دینا ہو گا ہماری مثال ایسی ہے جیسے قلب کو آپریشن کر کے باہر نکال دیا گیا ہو جب تک اسے اندر نہیں رکھا جائے گا دارالعلوم بے جان ہو گا اگر اس میں جان پیدا کرنی ہے تو ہمیں اندر بلانا ہو گا“

اس کے بعد ۹ مارچ کو جلوس نکالا گیا جو تحصیل تک پہنچا اس میں آپ نے انتظامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے دھمکی دی :

”یاد رکھو پولیس والو! تم نے ہمیں صدر گیٹ سے نہیں گذرنے دیا ہم نے آج مان لیا ہے اب ہم تم سے درخواست نہیں کریں گے، حکم دیں گے، یاد رکھو! اگر دارالعلوم ایک ہفتہ کے اندر نہیں کھولا گیا تو ہم دیوانہ وار دارالعلوم کی دیواروں سے ٹکرا جائیں گے۔ ہماری فوجیں سرنگیں کھود کر دارالعلوم میں داخل ہو جائیں گی اور انکے آگے کنکر پلائی ہوئی دیوار بھی خس و خاشاک ثابت ہوگی اس وقت یہ نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی ہم تمہیں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اب جنگل کا شیر جاگ چکا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اگر ہماری نہ سنی گئی تو ہم لکھنؤ اور دہلی پہنچیں گے۔ ہم نے امن کی مثال قائم کی ہے۔ لیکن ہم کو حالات کا رخ موڑنا بھی آتا ہے۔ اب وہ زمانہ بدل گیا ہے جب ہم گالیاں سن کر چلے جایا کرتے تھے اب ہم اپنے اکابر کو گالیاں دینے والوں کو سزائیں دیں گے اور ان کی زبانیں نکال لیں گے“ (۱)

اس تقریر کے بعد انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی اور پورے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی اور جلسے جلوس پر

پابندی لگادی گئی لیکن حکومت پر دباؤ بڑھانے کی خاطر ۱۳ مارچ کو پھر جلوس کا پروگرام رکھا گیا لیکن ڈی۔ ایم کی یقین دہانی پر کہ مسئلہ اڑتالیس گھنٹہ میں حل ہو جائے گا یہ جلسہ منسوخ کر دیا گیا لیکن اڑتالیس گھنٹہ گزر جانیکے بعد جب کوئی حل نہیں نکلا تو ۱۷ مارچ کو شہریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے فرمایا کہ:

”کیمپ حکومت کے دباؤ سے ختم نہیں ہوگا۔ رمضان میں بھی تعلیم جاری رہے گی ہم پورے ہندوستان کے مشاہیر پر مشتمل ایک ایکشن کمیٹی بنائیں گے مناسب وقت پر جلوس نکالیں گے اور تحریکات میں تیزی لائی جائے گی ایک وقت وہ آئے گا جب ہم اپنی شرائط پر صلح کرنے پر مجبور کر دیں گے ہمارے پاس الحمد للہ کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے آپ کا تعاون ساتھ ہے“ (۱)

چنانچہ ۲۴ مارچ کو دارالعلوم میں داخل ہونے کا پروگرام مرتب کیا گیا اور اس وقت مولانا کی عدم موجودگی میں مولوی عبدالحق مدرسی کیمپ کی ذمہ داری سنبھال رہے تھے بہر حال یہ پروگرام طے پایا کہ کچھ طلبانقب زنی لگائیں گے اور کچھ طلبہ سیڑھیوں سے اندر داخل ہوں گے چنانچہ اسی طرح یہ پروگرام عمل میں آیا اور معمولی مزاحمت کے بعد دارالعلوم پر مکمل قبضہ ہو گیا، دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر سے اذاء جآ نصر اللہ والفتح کی صدائیں گونجنے لگیں اور وللہ الحمد والشکر کا ہر چہار طرف نعرہ بلند ہوا طلبہ کے چہرے شادمانی و کامرانی سے کھل اٹھے، دوبارہ دارالعلوم میں تمام لوگ داخل ہو گئے لیکن اس وقت وہ نہیں تھا جس کا اس کامیابی میں سب سے بڑا رول تھا، نئے سرے سے تعلیمات کا عملہ بحال ہو گیا۔ اسباق شروع ہو گئے مجلس منتظمہ کی کمیٹی میں مولانا ریاست علی اور مفتی سعید احمد پالنپوری تھے انہوں نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔ مولانا معراج الحق نے دعاء سے پہلے فرمایا:

”مولوی وحید الزماں جو ہماری اس تحریک کے روح رواں ہیں عجیب مخلص آدمی ہیں، بیمار ہیں، ہم ان کی عدم موجودگی میں ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے بغیر روح کے جسم۔ جگہ جگہ ان کے مشوروں کی ضرورت ہے دعاء فرمائیے، خدا انہیں جلدی صحت عطاء فرمائے“ (۲)

بہر حال مولانا وحید الزماں صاحب چند روز بعد دہلی سے صحت یاب ہو کر واپس ہوئے تو آپ کا طلبہ نے ایسا استقبال کیا کہ شاید ہی دارالعلوم میں پہلے کسی کا استقبال ہوا ہو شام میں بعد نماز مغرب استقبالیہ جلسہ ہوا جس میں آپ نے مختصر سی تقریر فرمائی:

”طلبہ عزیز! جب ہم لوگ دارالعلوم سے نکالے گئے تھے تو آپ نے کہا تھا

۱- کیمپ ڈائری (غیر مطبوعہ ریکارڈ) تنظیم اہلہ قدیم، نئی دہلی۔

۲- کیمپ ڈائری (غیر مطبوعہ ریکارڈ) تنظیم اہلہ قدیم، نئی دہلی۔

”اِنَّ اللّٰهَ مَعْنَارُبُنَاللّٰه“ پھر اللہ نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا کہ آپ اپنے دعوے میں کتنے سچے ہیں سخت طوفان اور بارش کا آپ کو سامنا کرنا پڑا اور موسم کے سرد گرم تمانچے جھیلنے پڑے۔ آپ خدا کے فضل و کرم سے ثابت قدم رہے اور ”ثم استقاموا“ کی زندہ تصویر بن گئے تو اللہ نے آپ پر رحمت نازل فرمائی۔ آپ کی غیب سے مدد فرمائی، چنانچہ کئی مہینوں کے بعد آپ دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ اب الحمد للہ بے خوف ہے، حزن و رنج کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ خوشی کا موقع ہے اس وقت آپ کو بے قابو نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ الٹ پھیر ہمارے لئے باعث مسرت نہیں۔ لہذا جو ملازمین و مدرسین واپس دارالعلوم میں آئے ان کو بسر و چشم قبول کیجئے کیونکہ دارالعلوم کا مفاد اسی میں ہے اور ہم سب کو دارالعلوم کا مفاد عزیز ہے“ (۱)

## دارالعلوم سے مولانا کی علیحدگی

مولانا مرحوم کی زندگی میں ان گنت نشیب و فراز آئے گردش لیل و نہار نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ حالات کے تلخ و تند جھونکوں نے جی بھر کر بھڑاس نکالی۔ ان کی داستان حیات میں عسرت و تنگدستی کے صفحات کی کمی نہیں بلکہ عمر رواں کی بیشتر دہائیاں نہایت کفایت شعاری میں گزری۔ مصنوعی چہروں کے دیدہ زیب خول اترنے کے بعد ان کی نگاہوں نے ایمان و یقین کو متزلزل کرنے والے فکرو فن کے سر پہ اور گھناؤنے مناظر دیکھے یہ سب ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن عزت نفس کی جس میراث کے وہ وارث تھے اس کی نگہداشت اور پاسبانی سے وہ تمام عمر یک لخت غافل نہیں ہوئے۔ ان کے پایہ استقلال و عزیمت میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی ایک وقت تو ایسا آیا کہ سوائے عداوت و مخالفت کے کچھ نہ رہا لیکن حلم و وقار کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلا۔ استقامت میں کوئی فرق نہ آیا۔ سب سنا اور بہت کچھ سنا حریف دست بہ گریباں ہوئے دوست پرائے ہوئے، چھوٹوں نے بھی ان کی دستار فضیلت سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی، لیکن تلخ سے تلخ بات کا جواب بھی درشتی و تلخی سے نہیں دیا نہ کوئی انتقامی کاروائی کی نہ غیض و غضب کا مظاہرہ کیا بلکہ آپ نے مرض الموت سے قبل یہ بات صاف کر دی کہ میں نے سب کو معاف کر دیا وہ جانیں ان کا ضمیر، اگر مزاج پر سی کے لئے آئے تو روکنا مت۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے حق و صداقت اور وفا کیشی کی اعلیٰ قدروں کی خاطر ہر آزمائش کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ہر موقع پر دنیاوی اور مادی مفادات کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے ان کو ہر طرح کی مادی جسمانی، نفسیاتی اور روحانی اذیتوں سے گزرنا پڑا انھیں اس کے عوض کسی سے کسی قسم کے صلہ

کی نہ تمنا تھی اور نہ ہی احسان فراموشیوں کا گلہ شکوہ کرنا ان کا شیوہ تھا کم ہی افراد کو اخلاص، سچائی، بلند حوصلگی، وفائیت اور کردار کی پختگی جیسی اعلیٰ صفیتیں موهوب ہوتی ہیں جو مصلحتوں اور مفادات کو پس پشت ڈال کر اصول حق پر قربان ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے بارہا ایسے مواقع آئے جن سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ دارالعلوم کی زمام اقتدار ان کے ہاتھوں میں آ جاتی اور جن کے ہاتھوں میں ان کے طفیل سے اقتدار پہنچا وہ خواب و خیال ہی رہ جاتا بقول مولانا انظر شاہ کشمیری:

”اگرچہ مولانا کا اس انقلاب میں شریک ہونا ان کے اعتبار سے حق و صداقت اور خلوص سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی شرکت کے پیچھے کوئی راز مخفی نہ تھا نہ کسی عہدہ کا لالچ تھا نہ ہی اقتدار کی ہوس لیکن کچھ لوگوں کو شاید ان کی طاقت میں اپنی کرسی ہلتی ہوئی نظر آتی ہو اس لئے انھوں نے پہلی فرصت میں اس خطرہ کو بھانپ کر اس کی شاخیں کاٹنا شروع کر دی۔“ (۱)

بقول اشرف عثمانی دیوبندی :

”دارالعلوم کو انقلاب کے دوران آپ نے اپنے خون پسینے سے بچایا تھا اور اس کی پرانی عزت اور وقار بخشے میں مولانا نے اپنی جان تک لگا دی تھی۔ الحمد للہ اسمیں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ جس کا سہرا سر اسر مولانا ہی کے سر تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگوں نے آپ کی نیت پر ہی شک کرنا شروع کر دیا لوگ آپ کے خلوص کو نہ پہچان سکے نہ دارالعلوم سے عقیدت و محبت کو دیکھ سکے۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ کو دارالعلوم کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ آدمی کو اس کی اولاد سے جدا کر دیا جائے یا اس کی کمائی ہوئی دولت کو چھین لیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی۔ مگر مولانا نے غایت خلوص کی بناء پر یہ تکلیف دہ فیصلہ قبول کر لیا اگرچہ آپ کے ہمدرد اور معتقدین نے کارروائی کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن دارالعلوم کی بھلائی کی خاطر آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے دارالعلوم کی تاریخ پر کوئی آنچ آئے۔“ (۲)

بہر حال انقلاب میں شریک ہونا آپ کا صرف دارالعلوم میں اصلاحی اقدام کے پیش نظر تھا لیکن اب نظام کی تبدیلی کے بعد بھی جب کوئی اصلاح نہیں ہوئی تو آپ نے اس نظام پر بھی تنقید شروع کر دی اور اس کے خلاف آواز اٹھائی تو آپ پر عہدہ طلبی کا الزام لگایا جانے لگا جیسا کہ آپ نے اپنی تقریر میں اس کا اظہار کیا، طلباء کی آواز پر ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء کو ”جمعیتہ الطالبہ“ کا انتخاب ہوا اور ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء جمعیتہ الطالبہ کا استقبالیہ جلسہ کیا گیا جس میں مولانا نے شرکت کی اس جلسہ میں مولوی طلحہ فقہوری نے مولانا کی آج تک خدمات کا

۱- ترجمان دارالعلوم جدید خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء مقالہ مولانا انظر شاہ صاحب ص ۳۲۲۔

۲- پندرہ روزہ ”آئینہ دارالعلوم دیوبند“ اپریل و مئی ۱۹۹۵ء ص ۱۷۔

تذکرہ کیا جب یہ سلسلہ دراز ہو گیا تو مولانا نے فرمایا ! بہت ہو گیا۔ اب بس کروسنے کی تاب نہیں ہے پھر خود تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ:

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیمپ میں آپ سے جتنے وعدے کئے تھے وہ پورے نہیں کر سکتا اور نہ مجھے توقع ہے کہ وہ پورے ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا آخر میرا قصور کیا ہے جو مجھے اس طرح مطعون کیا جا رہا ہے سابق انتظامیہ سے میرا ایک عرصہ تک اختلاف رہا ہے انھوں نے مجھ پر کبھی عہدہ طلبی کا الزام نہیں لگایا اور یہ لوگ جن کے لئے میں نے سب کچھ برداشت کیا میرے اہل خانہ پریشان ہوئے میرے گھر پر حملے کئے گئے ۱۸ مفسدین میرے دروازہ پر کھڑے ہو کر نعرہ لگاتے تھے کہ وحید الزماں کو نکالو ہم ان کی تکابوٹی کر دیں گے اتنی تکلیفیں ہم نے جھیلیں ہیں۔ کیمپ کا زمانہ تھا تو سی آئی ڈی والوں سے بات کرنا ہو تو وحید الزماں کرے، پولیس والوں سے ملنا ہو تو وحید الزماں ملے نامہ نگاروں سے بات کرنا ہو تو وحید الزماں کرے، مالی مشکلات کا حل نکالنا ہو تو وحید الزماں نکالے اور آج وحید الزماں عہدہ کا خواہاں ہو گیا ہے کہتے ہیں کہ اہتمام چاہتا ہے۔ یاد رکھو! اگر اہتمام کی خواہش ہوگی اور جس دن ہوگی تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کرسی تک پہنچنے سے روک نہیں سکے گی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ میں مجلس تعلیمی کا محرر بن کر نہیں رہنا چاہتا“ (۱)

انقلاب کی کامیابی کے بعد ان لوگوں نے جنہوں نے انگلی کٹا کر مجاہدین کی صف میں نام لکھایا تھا جب مولانا کی انتظامی امور میں دخل اندازی دیکھی وہ ان کے لئے پریشان کن بنیں تو ”جمعیتہ الطالبہ“ جو مولانا کی طاقت کا سب سے بڑا مخزن تھا پوری سیاسی حداقت سے اس سفینے کے ایک ایک تختے کو مولانا ہی سے اکھڑا دیا گیا اگرچہ مولانا کو بعض لوگوں نے اس چال پر متنبہ بھی کیا مگر وہ جوش اخلاص میں خود اپنی کشتی غرقاب کرنے میں مصروف رہے اور اب ان کا کوئی سہارا نہیں رہا صرف مٹی کی دیوار کے مانند رہ گئے جسے گرانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اگر اس پر غور کیا جائے کہ مولانا کے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا ان لوگوں نے مولانا کے ساتھ ناانصافی کیوں کی تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ مولانا مرحوم کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے والے کون تھے اور ان کو بام عروج تک پہنچانے میں کس کا ہاتھ تھا۔ تو احقر کی رائے یہی ہے کہ حضرت قاری صاحب کے زمانہ اہتمام میں ہی آپ اس مقام پر پہنچے اگرچہ اس میں آپ کی صلاحیت کو بھی دخل تھا لیکن اس صلاحیت کو اجاگر کرنے کے موقع حضرت قاری صاحب نے آپ کو عطا فرمائے تھے لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے آپ نے حضرت قاری صاحب کا ساتھ نہیں دیا اور ان کے تمام اخلاص و محبت کو ٹھکرا دیا اور دوسرے طاقتور گروپ کا ساتھ



دیا، لہذا جب آپ پر یہی وقت آیا اور دارالعلوم کی انتظامیہ سے آپ کو اختلاف ہوا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ وہی معاملہ کیا اور اکثر لوگوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا بہر حال جو کچھ مولانا کے ساتھ ہوا وہ امت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ واقعات شواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں بقول مولانا انظر شاہ کشمیری صاحب :

”کمال اتاترک کے شریک جد و جہد ایک یار غار کی ترک انقلاب کے بعد اس کی فعالیت مصطفیٰ کمال کے اقتدار کے لئے خطرہ بن گئی تو اس پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا عدالتی کارروائی کے تمام مراحل سے گزر کر اس وفادار کی پھانسی پر منج ہوئی آخری دستخط کے لئے دستاویز میرے سامنے آئی تو اتاترک لکھتا ہے ایک سیکنڈ کے لئے میرا قلم جھجکا مگر دوسرے ہی لمحہ نے مجھے سمجھایا کہ اسکی بقاء تیری فنا ہے میں نے اپنی بقاء کے لئے فوراً دستخط کر دیئے“ (۱)

مقصد برآری اور بعد میں تہ تیغ کر دینے کی داستانیں پہلے کم تھی اب روزمرہ کے انقلابات میں عام ہو گئی یہ چیزیں اب مافوق العادۃ نہیں کہلاتی۔

بہر حال طلبہ نے نظامت و تدریس کے امور میں بدعنوانیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو ارباب اقتدار کے مشیر کاروں نے اس کی نسبت مولانا کی طرف کی اور انھیں اس کا محرک بتایا، اگرچہ مولانا کی طلبہ کو حمایت حاصل تھی، لیکن اس سے نظام کو سدھارنا مقصد تھا نہ کہ اسے معطل کرنا چنانچہ کچھ لوگوں نے اس آواز کو دبانے کا حل یہ پیش کیا کہ اس آواز کے روح رواں مولانا وحید الزماں کو دارالعلوم کی خدمت سے برطرف کر دیا جائے یا ان کی طاقت کو عضو معطل بنا کر رکھ دیا جائے لیکن اس وقت مولانا کو برطرف کرنا آسان کام نہ تھا اس لیے کہ یہ وہ وقت تھا جبکہ آتش فشاں جو ان اور آپ کا ستارہ بلندی پر تھا اس طرح کی نادانی اس وقت اقتدار و اہتمام کی کایا پلٹ کا باعث بن جاتی، مولانا کو نہ صرف طلبہ کی حمایت حاصل تھی بلکہ دفتر اہتمام اور شوری کے مؤید و مخالف ممبران سبھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے، جو ممبران آپ کے مخالف تھے وہ بھی ایک حلقہ سے وابستگی کے سبب مخالفت کرتے تھے ورنہ شخصی طور پر سبھی آپ کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔

چنانچہ ارباب حل و عقد نے دوسری حکمت عملی کو اپنایا، چونکہ ”جمعیتہ الطلبہ“ جو آپ کا سب سے بڑا ہتھیار تھا اس کی بیخ کنی آپ کے ہاتھوں سے ہی کرادی گئی اب درس و تدریس کا تعلق بھی صرف ایسے طلبہ ہی سے متعلق کیا گیا تھا جو صرف تعداد میں دو یا تین ہوتے تھے تاکہ کم سے کم طلبہ تک آپ کی رسائی ہو لہذا طلبہ سے براہ راست آپ کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا جن کی مدد سے آپ کسی انقلاب کو جنم دیتے۔

پچھلی انتظامیہ میں جو طلبہ انتظامیہ کے خلاف آواز اٹھاتے تھے، موجودہ انتظامیہ ان کی پشت پناہی

کرتی تھی پھر اگر ان کے خلاف کوئی ایکشن ہوتا تو یہ لوگ اس کی مذمت کرتے اور ان طلبہ کو حتی الامکان بچانے کی بھی بھرپور کوشش کرتے لیکن جن طلبہ نے اس انتظامیہ کی خامیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو ان لوگوں نے ان کو باغی و مجرم قرار دیا ان کے مطالبات پر غور و خوض کرنے کے بجائے ایسے طلبہ کی لمبی فہرست تیار کی گئی جو مولانا کے قریبی شاگرد شمار ہوتے تھے۔ ان پر اس طرح کے الزامات عائد کئے گئے جن کیپاداش میں ان کا اخراج یقینی ہو سکے، لہذا اس وقت میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو دارالعلوم سے رشتہ تعلیم و تعلم منقطع کرنا پڑا حالانکہ اگر طلبہ کی پریشانی دور کرنے اور ان کے مطالبات پر غور و خوض کرنے کے لیے مولانا کو ہی ذمہ داری سونپ دی جاتی تو وہ اس کو بخوبی انجام دے سکتے تھے اس کے برخلاف مولانا کو متہم کیا گیا کہ یہ تمام کاروائی آپ ہی کی شہ پر ہوئی ہے اور باقاعدہ شوریٰ بلا کر باز پرس کی گئی۔ ایسے مواقع پر جہاں آپ کو ملزم ٹھہرایا جاتا آپ کی قوت برداشت جواب دے جاتی، آپ کا جوش اور غصہ کنٹرول سے باہر ہو جاتا، یہ آپ کی ایک طرح سے کمزوری بھی تھی یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا۔ شوریٰ کے ممبران کو بار بار کہنا پڑا، مولانا ہم آپ سے ایک ذمہ دار استاد کی حیثیت سے صرف حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں، ہم آپ پر الزام تراشی نہیں کر رہے، اسی طرح دارالعلوم میں جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا تو آپ کے مخالفین اس کی نسبت آپ ہی کی طرف کرتے، اس کی ذمہ داری آپ کی ہی گردن پر لا دی جاتی (۱)

بہر حال اگر اس پر غور کیا جائے کہ مولانا کی مخالفت کا اصل سبب کیا تھا تو احقر کے ذہن میں اس کی دو وجہ آئی ہے ایک کمزوری آپ کی یہ تھی مزاج کے خلاف کوئی چیز سامنے آتی تو فوراً مشتعل ہو گئے مصلحت اندیشی اور سیاست سے کام لینے کا فن آپ کے اندر نہیں تھا، جس کا فائدہ مخالفین نے اٹھایا، اکثر آپ کے خلاف اس طرح کی باتیں کی جاتی جس سے آپ فوراً مشتعل ہو جاتے یہی مخالفین کا مقصد تھا تاکہ شوریٰ کے سامنے اس کمزوری کو ظاہر کر کے آپ کو تدریس سے علیحدہ کر سکے اور اس میں وہ لوگ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ دوسری چیز کا تعلق جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی اور علیحدگی سے ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کا مزاج شروع سے ہی یہ تھا کہ ان کی نظر میں جو کام غلط ہوتا تو اس پر بر ملا تنقید کر دیتے، خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو اپنا ہوا یا غیر ضرور تنبیہ فرماتے۔ چنانچہ جب جمعیۃ علماء ہند میں بہت سی چیزیں آپ کے مزاج کے خلاف ظاہر ہونے لگی تو آپ نے ان کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن یہ تنقید مولانا اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کی طبیعت و مزاج کے خلاف بھی تھی اس طرح تناؤ شروع ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا آپ کو جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونا پڑا بعد ازاں کچھ ممبران نے جمعیۃ سے علیحدہ ہو کر ”ملی جمعیۃ“ کا سنگ بنیاد رکھا جس کی صدارت کی ذمہ داری مولانا ہی کے سپرد کی گئی، چنانچہ اس کے بعد تو ایک سرد جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا اثر دارالعلوم کی آپ کی زندگی پر بھی پڑنا یقینی تھا کیونکہ مولانا وحید الزماں دارالعلوم کے مدرس

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دانشور“ گورکھپور افصال الحق جوہر ج ۱ شمارہ ۷-۸ ۱۹۹۵ء ص ۲

تھے اور مولانا اسعد مدنی صاحب دارالعلوم کی شوریٰ کے ممبر پھر چونکہ مولانا اپنے مزاج کے اعتبار سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنقید کے عادی تھے۔ اس لحاظ سے مولانا اسعد صاحب کی باتوں میں رخنہ اندازی کرنے والے صرف مولانا وحید الزماں ہی تھے لہذا ایسے حالات میں دارالعلوم سے وابستگی کا سلسلہ غیر یقینی امر تھا (۱)

چنانچہ آپ پر الزام تراشی کی گئی کہ دارالعلوم میں طلبہ کو انقلابی بنانا اور بقول ایک استاد کہ آپ اہتمام کے خواہش مند بھی تھے (۲)۔ اس طرح کے الزامات لگا کر دارالعلوم سے سبکدوش کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا جا رہا تھا کیونکہ انگریزی کا ایک مقولہ ہے ”اگر کسی جانور کو مارنا ہو تو اس کو کوئی برنامہ دید اور مار ڈالنے کا جواز پیدا کر لو“ چنانچہ یہ سر دجنگ چل ہی رہی تھی کہ ایک روز تبلیغی جماعت کے کچھ طلباء نے اپنے ہفتہ واری تبلیغی جلسہ میں شرکت کی آپ کو دعوت دی پہلے تو آپ نے انکار کر دیا لیکن ان کے اصرار پر آپ اس وعدہ کے ساتھ کہ آپ کی تقریر سنوں گا میں تقریر نہیں کروں گا طلبہ اس کے لیے تیار ہو گئے لیکن آپ جیسے ہی مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں طلبہ کا ہجوم موجود تھا۔ پروگرام شروع ہو گیا طلبہ نے مولانا کی تقریر کے لیے اصرار شروع کر دیا کہ ہم تو صرف حضرت مولانا ہی کی تقریر سنیں گے۔ اس پر مولانا کو غصہ آنا لازمی تھا کیونکہ پہلے سے یہ بات آپ کے وعدے میں شامل نہ تھی، آپ اسی حالت میں کھڑے ہو گئے اور آپ نے بولنا شروع کر دیا تقریر کی شروعات ہی اس بات سے کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

”آپ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں یہ قول و فعل کا تضاد ہمارے علماء کے معاشرہ میں عام ہوتا جا رہا ہے بزدلی بھی پھیلتی جا رہی ہے، نقاق کے ہم لوگ عادی ہوتے جا رہے ہیں آج ہمارا محبوب مشغلہ کمروں میں بیٹھ کر اساتذہ و منتظمین پر تنقید کرنا ہے، لیکن ہمارے اندر وہ جرأت باقی نہیں رہی جو ایک مسلمان بالخصوص ایک عالم کے اندر ہونی چاہئے کہ ہم غیبت کے بجائے اپنے استاد یا منتظم کے سامنے ادب کے ساتھ اپنی بات پیش کر سکے، چاہے وہ انہیں ناگوار ہی کیوں نہ ہو باعث اجر ہوگی اگر ہم اسی بات کو پس پشت کہیں گے تو غیبت ہوگی جو حرام ہے، پھر آپ نے کہا! ہر جگہ آج کے دور میں سیاست آتی جا رہی ہے، دارالعلوم میں بھی سیاسی اثرات رونما ہونے لگے ہیں مثلاً دکھانے کے لیے منصب پر کسی کو رکھا جاتا ہے اور کام کرنے کے لیے کوئی صاحب ہوتے ہیں، مولانا ریاست علی صاحب ناظم تعلیمات ہیں اور مولانا ارشد صاحب نائب ہیں لیکن مولانا ارشد سزائیں دینے میں مختار کل بنے ہوئے ہیں وہ سزائیں دینے میں تو آزاد ہیں نہ مجلس تعلیمی کے پابند

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دانشور“ گورکھپور افضال الحق جوہر ج ۱ شمارہ ۷-۸ ۱۹۹۵ء ص ۳۔

۲- مولوی عبدالحق مدراسہ (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) بالمشافہ۔

ہیں نہ ناظم تعلیمات کے لیکن کسی کام کو ٹالنا ہوتا تو کہہ دیتے ہیں کہ میں تو نائب ہوں لیکن مولانا ریاست علی صاحب کے پاس کوئی کام لے کر جاؤ تو وہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ میں ناظم تو ضرور ہوں لیکن عملاً مولانا ارشد مدنی کام کرتے ہیں اس لیے انھیں کے پاس جاؤ، اس سیاسی صورت حال کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اپنا کام کرانے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا یہ صرف سیاسی تکلفات ہیں۔

آگے پھر فرمایا! کہ حضرت قاری صاحب کے زمانہ میں میرا ذہن یہ رہا ہے کہ طلباء کی شخصیت کی نشوونما میں ایک حد تک آزادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں دبا کر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ آزادی دینی چاہیے اور پھر کنٹرول کرنا چاہیے یہ تربیت کا اہم جز ہے، دبا کر، جذبات کو کچل کر اور زبان بندی کر کے یہ سمجھنا کنٹرول ہو رہا ہے، محض خام خیالی ہے، حضرت قاری صاحب کے زمانہ میں ”جمعیۃ الطلبة“ مجلس شوریٰ کے قانون کی رو سے ممنوع تھی لیکن اس وقت مولانا اسعد صاحب یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ممنوع ہے زور دیکر ”جمعیۃ الطلبة“ بنوائی اور اس کو حضرت قاری صاحب مرحوم اور شوریٰ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ حالانکہ یہ کھلی بغاوت تھی۔ میں فکری طور پر ”جمعیۃ الطلبة“ کے قیام کا مؤید تھا۔ اس لیے میں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور وہ سرگرم عمل ہو گئی۔ اس وقت میں نے حضرت قاری صاحب کے نظام کے خلاف جو تقریریں کیں اس پر مولانا اسعد صاحب نے شاباشی دی۔ اس وقت بھی دارالعلوم میں امن و سکون تھا۔ لیکن مولانا اسعد صاحب حضرت قاری صاحب کے نظام کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دوہری فوج تیار کی، باہر عالمی مؤتمر کے نام سے فضلاء دارالعلوم کی تنظیم اور اندرون دارالعلوم ”جمعیۃ الطلبة“ کا قیام میری اس بغاوت کے باوجود حضرت قاری صاحب نے میرے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اس وقت لڑائی کا سب سے بڑا عنوان ”جمعیۃ الطلبة“ کا مطالبہ تھا۔ آج جبکہ مجلس شوریٰ کے قانون کی رد سے ”جمعیۃ الطلبة“ منظور شدہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے تو مولانا اسعد صاحب کی نظر میں اس سے بڑا مفسد کوئی نہ ہو گا اسی کو سیاست کہتے ہیں۔“ (۱)

علاوہ ازیں آپ نے طلبہ کو کچھ نصیحتیں کیں اور دارالعلوم میں اپنے کاموں اور اپنی قربانیوں کی تفصیلات بتائی۔ یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک چلی اس کے بعد تمام طلبہ اپنے کمروں میں چلے گئے اور کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

۱- ”دارالعلوم سے میری سبکدوشی“ (کتابچہ) مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۶۔

اس تقریر کا رد عمل حزب مخالف کی طرف سے یہ ہوا کہ انھوں نے آپ کے خلاف باقاعدہ ایک سازش کے تحت بدنام کرنے کی اسکیم تیار کی اور اس تقریر کو کھلی بغاوت قرار دیا گیا، مولوی عبدالحق بدر اسی صاحب جو آپ کے بہت قریبی شاگرد بھی رہ چکے تھے اور اس وقت آپ سے اختلاف کی وجہ سے مخالفین کے زبردست معتقدین میں سے تھے۔ آپ کے خلاف درس گاہ میں طلبہ کے سامنے اس طرح کے الزامات لگائے جو کم از کم علماء کی شایان شان نہیں ہو سکتے اور اس طرح کی عیب جوئی کی جو بہتان کا درجہ رکھتی ہے، اس تقریر کی خبر مولانا تک پہنچنی لازمی تھی۔ جس کے نتیجے میں آپ کو غصہ آنا لازمی تھا اور یہی حزب اختلاف کا مقصد تھا وہ چاہتے کہ آپ کو ناکارہ، باغی اور مشتعل مزاج ثابت کر دیا جائے اور دارالعلوم سے سبکدوش کرنے کا جواز پیدا کر لیا جائے۔ آپ ان کی چالوں کو سمجھتے ہوئے بھی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے تھے یہی آپ کی کمزوری تھی۔ آپ اس طرح کی حرکت پر جوابی کارروائی ضرور کرتے۔ سیاست آپ کے مزاج کے خلاف تھی کہ ایسے وقت میں خاموش رہ کر کسی دوسرے وقت پر اس کا جواب دیتے۔ بہر حال الزام تراشیوں کا یہ دور چل ہی رہا تھا کہ حزب مخالف نے اپنے ترکش سے ایک تیر چھوڑا اور طلبہ میں یہ افواہ پھیلانی لگی کہ رات میں صدر دروازہ پر مولانا کی تقریر کا پروگرام ہے اگرچہ آپ کی طرف سے ایسی کوئی پیش کش نہیں ہوئی تھی اور آپ اس چال کو سمجھ بھی گئے تھے کہ یہ ایک سازش ہے۔ لیکن پھر بھی آپ وہاں پہنچ گئے آپ کا مقصد طلبہ کو صدر گیٹ سے ہٹا کر دارالعلوم واپس بھیجنا اور طلبہ میں پھیلائی جانے والی افواہ کو دور کرنا تھا۔ لیکن آپ پہنچے تو طلبہ کا بہت بڑا مجمع آپ کا منتظر تھا آپ کو طوعاً و کرہاً تقریر کرنی پڑی اور اس میں دارالعلوم کے موجودہ حالات پر بھی روشنی ڈالی<sup>(۱)</sup> جس کا خلاصہ یہ ہے:

”دارالعلوم کی جہاں بہت سی خصوصیات ہیں۔ وہیں ایک بڑی اور اعلیٰ روایت احترام اساتذہ بھی ہے یہ ہماری تعلیم کا جوہر بھی ہے اگر یہ جوہر پیدا نہ ہو تو ہماری تعلیم ناقص ہے۔ میں عاصی و گنہگار، بے عمل اور تہی دامن ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے لیکن مجھے اپنے اساتذہ کی دعائیں ملی ہیں۔ کبھی اپنے اساتذہ کے خلاف زبان سے ایک لفظ بولنا تو کیا سننا بھی گوارہ نہیں کیا۔ آج انھیں کی عاؤ کی وجہ سے اس مقام پر پہنچا ہوں نیز آپ نے کہا! دارالعلوم کے بعض اساتذہ جو میرے شاگرد بھی ہیں کہتے ہیں کہ وحید الزماں سے کوئی شخص ملنا پسند نہیں کرتا، بد اخلاق ہوں وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ یہ ہزاروں کا مجمع جو اس وقت اپنی محبت کی بناء پر میرے ارد گرد جمع ہیں آخر کیوں جمع ہیں؟ یہ صرف اس لیے کہ میں نے اپنے اساتذہ کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں

۱- مولوی عبدالقدوس (سابق انچارج دارالمؤلفین دیوبند) بالمشافہ۔

کی، ان سے ہمیشہ دعائیں لی ہیں اس کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“ (۱)

اس تقریر کا اثر دارالعلوم کی انتظامیہ پر یہ ہوا کہ ایک کھل بھلی سی مچ گئی، سینئر اساتذہ دارالعلوم میں جمع ہو گئے اور مشورہ کیا جانے لگا، اسی وقت مولانا مرغوب الرحمان صاحب کو بذریعہ فون اطلاع کی گئی جو اس وقت دیوبند سے باہر گئے ہوئے تھے، اس تقریر کی شہرت اس طرح کی گئی آپ کچھ غنڈوں اور وقف دارالعلوم کے لوگوں کو لے کر دارالعلوم پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے تھے خود میں نے ایک استاد سے اس واقعہ کی تفصیل معلوم کی اور دارالعلوم کے اس وقت کے حالات کے سلسلے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے صاف لفظوں میں یہی کہا کہ مولانا وحید الزماں صاحب دارالعلوم پر اپنا کنٹرول چاہتے تھے اور دارالعلوم میں اہتمام کی کرسی پر اپنا قبضہ چاہتے تھے، لیکن اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو یہ بات قابل غور ہے کہ اگر مولانا کو اس چیز کا لالچ تھا تو آپ نے انقلاب کی کامیابی کے بعد اس طرح کی خواہش کا اظہار کیوں نہیں کیا جب کہ اس وقت اس خواہش کا پورا ہونا یقینی امر تھا، کیونکہ اس وقت تمام حالات آپ کے موافق تھے، طلبہ و اساتذہ سب کا تعاون حاصل تھا اور دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کا پورا سہرا آپ ہی کے سر تھا، آپ اکیلے ہی اس کے ہیر و تھے، لیکن اس وقت آپ سے اس طرح کی خواہش کا صدور نہیں ہوا تو اب جبکہ تمام حالات آپ کے مخالف تھے، اہتمام کی کرسی کا قصد کرنا سوائے پاگل پن کے کچھ اور نہیں ہو سکتا جو آپ کی ذات سے ممکن نہیں تھا۔

لہذا ان واقعات پر غور کیا جائے تو سوائے سازش کے کچھ اور محسوس نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے جنہیں اپنی کرسیاں ہلتی ہوئی نظر آرہی تھی، جو کسی دخل اندازی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے اس طرح کی افواہیں پھیلائی، اگر اسی وقت دور ان تقریر ہی حالات کا جائزہ لیا جاتا اور وہاں طلبہ کے احوال کا جائزہ لیتے تو حقیقت سے آگاہی بھی ہو جاتی، چنانچہ جب کئی روز بعد حضرت مہتمم صاحب نے اس واقعہ پر گفتگو کی تو ساری حقیقت واضح ہو گئی اور بات صاف ہو گئی۔

یہ واقعہ ماہ ربیع الاول کا ہے اس کے بعد پورا سال صحیح سلامت گزرا اور کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا حتیٰ کہ شعبان کا مہینہ آگیا اور ۲۱-۲۲ شعبان ۱۴۱۰ھ میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں دارالعلوم کے سلسلے میں کچھ فیصلے لئے گئے۔ آپ کا مسئلہ بھی پیش کیا گیا، مولانا ریاست علی بجنوری نے بہ حیثیت ناظم تعلیمات آپ کے خلاف ایک رپورٹ پیش کی جس میں آپ پر کچھ الزام تراشی کی گئی تھی، بہر حال وہ الزام غلط یا صحیح جو کچھ بھی تھے وہ آپ نے ہی تحریر کئے تھے یا آپ سے تحریر کرائے گئے تھے اس سے بحث نہیں مجلس شوریٰ میں آپ کی تقریروں کا حوالہ بھی دیا گیا، آپ کی طرف سے کچھ خدشات بھی بیان کئے گئے، ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر آپ کی دارالعلوم سے سبکدوشی کا فیصلہ لیا گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا

۱- ”دارالعلوم سے میری سبکدوشی (کتابچہ) مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۷۔

دارالعلوم سے تعلق ختم کر دیا گیا اور آپ کو ۱۴/۱۲ رمضان المبارک کو بذریعہ ایک تحریر اس فیصلے سے مطلع کر دیا گیا جس کا متن حسب ذیل تھا ”مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ نے آپ کے بارے میں جو تجویز منظور کی ہے وہ اس سال خدمت ہے تجویز ۳ کے ضمن میں ہے :

”حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی جانب سے بار بار پیش آنے والی صورت حال زیر بحث آئی مجلس شوریٰ ان کی بیماری اور اس کی بنا پر مشتعل اور بے قابو ہو جانے کی معذوری کے پیش نظر ان کو تدریسی ذمہ داری سے سبکدوش کر کے مبلغ سات سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جانا منظور کرتی ہے۔“ (۱)

اس فیصلہ کی بہت سے علماء نے مخالفت کی اور دنیا بھر کے بہت سے علماء نے دارالعلوم کی انتظامیہ سے اپیل کی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے کیونکہ جس شخص نے دارالعلوم کی خدمت میں اپنے آپ کو جسمانی طور پر ختم کر دیا ہو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنا، اس کی وفاداریوں کو نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی ہے جس کی علماء کی ذات سے امید نہیں کی جاسکتی یہ رد عمل تو ان علماء کا تھا جن کا دارالعلوم سے ذرہ برابر بھی تعلق رہ چکا ہے، لیکن آپ نے رد عمل کے طور پر کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ آپ نے کوئی انتقامی کارروائی کی ہو اگر آپ چاہتے تو عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتے تھے لیکن دارالعلوم کے مفاد کی خاطر آپ بالکل خاموش رہے اور اپنے چند قریبی لوگوں کے علاوہ کسی کو اس فیصلے سے مطلع نہیں کیا کیونکہ ہو سکتا ہے اس فیصلے کی خبر سے دارالعلوم کو کوئی نقصان پہنچے حالانکہ اس فیصلے کا اثر آپ کی ذات پر اس قدر پڑا کہ آپ کچھ دنوں کے لیے ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے، آپ کی حالت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہوں گے جو اس طرح کے حادثات سے دوچار ہو چکے ہوں۔ چنانچہ اس کارروائی کے بعد آپ نے چند خطوط حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں لکھے۔ جن کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا انہیں خطوط میں سے، ایک خط ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

”محترم و مکرم حضرت مہتمم صاحب (دارالعلوم دیوبند) دام مجد کم

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

آپ کے دستخط سے مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ شعبان ۱۴۱۰ھ کی ایک تجویز ۱۴/۱۲ رمضان ۱۴۱۰ھ کو موصول ہوئی تھی جس میں دارالعلوم کی تدریسی ذمہ داریوں سے مجھے سبکدوش کرنے کا ذکر تھا اس میں چونکہ فیصلہ کی تاریخ نفاذ کا کوئی ذکر نہیں تھا اس لئے بروقت خاموش رہا کہ شاید اس کا تعین ہی بعد میں ہو یا شاید اور کوئی فیصلہ کیا جائے۔

مجھے آپکے خط سے جو تجویز موصول ہوئی اس میں میری سبکدوشی کی وجہ میری بیماری اور اس کے نتیجہ میں اشتعال میں آجانا تحریر کی گئی ہے۔ مجلس شوریٰ دارالعلوم کی موثر اور باختیار کمیٹی ہے جس کے اراکین کا میں ہمیشہ احترام کرتا آیا ہوں اور انکے فیصلہ کو بھی قابل احترام و تسلیم سمجھتا آیا ہوں۔ جن کا انہیں حق اور اختیار ہے اور اب بھی اگر مجھے کسی سبب اور علت کے بغیر سبکدوش کر دیتی تو شاید میں کچھ نہ کہتا لیکن اسکے برعکس مجلس نے مجھے سبکدوش کر نیکا فیصلہ ایک خاص سبب کے تحت کیا ہے اس لئے اب یہ سوال قدرتی طور پر سامنے آتا ہے کہ یہ سبب واقعتاً ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اتنے اہم فیصلہ کے لئے بنیاد بنایا جاسکتا ہے یا نہیں۔

تجویز کے مطابق مجھے سبکدوش کرنے کا فیصلہ اس لئے لیا گیا ہے کہ میں بیمار رہتا ہوں اور اسکی وجہ سے مشتعل ہو جاتا ہوں اولاً تو میں اسکو محض ایک الزام سمجھتا ہوں، کیونکہ اشتعال میں آنا اور مشتعل ہونا ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ جس کا کسی بھی باضمیر اور حساس انسان پر مخصوص حالات میں طاری ہونا ایک فطری امر ہے، یہی نہیں بلکہ کسی ایسے وقت میں جب موقع اظہار حق کا ہو اور دوسرے کی جانب سے اپنی مصلحت کی بنیاد پر حق کو جھٹلانے کی کوشش کی جا رہی ہو تو یہ کیفیت تمام حق پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ میرا مشتعل ہونا مزاجاً و طبعاً ہے یا بیماری کے باعث؟ اگر مزاجاً و طبعاً ہے تب تو آج اسکے قابل مؤاخذہ ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ میں اپنی اس طبیعت اور مزاج کے ساتھ گزشتہ ۲۸ سال سے دارالعلوم میں ہمہ جہت خدمت انجام دے رہا ہوں اور اس طویل مدت میں کبھی بھی میرے اس مزاج و طبیعت اور ان کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو قابل مؤاخذہ نہ سمجھا گیا اور نہ ہی عملی طور پر کوئی مؤاخذہ کیا گیا، بالخصوص حالیہ انقلاب میں اس مزاج نے جو نمایاں کردار ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، نیز اگر یہ اشتعال طبعاً و مزاجاً نہیں بلکہ بیماری کی وجہ سے ہے اور یہی آپ حضرت کا خیال بھی ہے جیسا کہ تجویز میں اس کی صراحت ہے تو حیرت ہے کہ اسے کیونکر اتنے بڑے فیصلے کی بنیاد بنایا گیا؟ کیوں کہ اس صورت میں یہ عذر ہو گا اور عذر قابل درگزر ہوتا ہے قابل سزا نہیں آخر عذر اور جرم کو یکساں کیوں کر رکھا جاسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ بیماری کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو تدریس سے کیا تعلق؟ اگر



اس سے تدریس میں کوئی کمی یا کوتاہی آئے تو اسے قابل گرفت سمجھا جاسکتا ہے لیکن یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ اس پہلو کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے اور تدریس کا نہ ذکر ہے اور نہ اس سلسلے میں کسی شکایت کا حوالہ!

دوسری چیز حالیہ دنوں میں جلسہ کے دوران مولانا ریاست علی اور مولانا اسعد صاحب نے مجھ پر انتہائی غلط اور بے بنیاد الزام لگائے ہیں اور وہ اسی وقت کے ہیں جب میں ناظم تعلیمات اور معاون مہتمم تھا۔ ظاہر ہے دونوں صورتوں میں کسی بالادستی کے تحت کام کر رہا تھا۔ لہذا اگر دونوں عہدوں پر رہتے ہوئے اگر میں نے کوئی غیر قانونی قدم اٹھایا تھا یا کوئی ایسا کام کیا تھا جو مفاد دارالعلوم کے خلاف تھا تو میرے بالادست کا فرض تھا کہ وہ بغیر رعایت کے اس پر مجھے متنبہ کرتا یا کوئی کارروائی کی جاتی، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا ان غیر قانونی اقدامات اور تعلیمات کے نظام کو تباہ و برباد ہوتے دیکھنے کے باوجود مجلس تعلیمی اور سربراہ ادارہ کا خاموشی اختیار کر لینا مفاد دارالعلوم اور ذمہ دارانہ احساس و امانت کے خلاف نہیں؟

نیز دونوں عہدوں سے الگ ہو جانے کے بعد میں جب تدریس پر واپس آیا تو اگر میں نے تدریس میں کسی طرح کی کوتاہی کی جیسا کہ اب کہا جا رہا ہے تو ناظم تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب نے میرے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی کیا یہ غیر ذمہ داری نہیں ہے؟ اسی طرح میرے معاون مہتمم کے زمانہ میں کبھی آپ نے مواخذہ نہیں کیا جب کہ آج الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے تمام نظام درہم برہم کر دیا تھا حالانکہ آپ نے اکثر میرے کاموں کو بنظر تحسین دیکھا ہے اور ان پر اطمینان اور خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔

پھر آج ایک شخص کو جس کا تعلق دارالعلوم کے خارجی امور سے ہے اس طرح کی الزام تراشی کا ان کو کیا حق حاصل ہے جو صرف شورائی کارکن ہے (اگرچہ فی الحال وہ دارالعلوم کا ناخذ ہے) بہر حال ایک رکن شورائی کو عوامی جلسے میں اس بھونڈے انداز سے میری کردار کشی اور مجھ پر الزامات لگانا قطعاً زیب نہیں دیتا، میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے ہمیشہ دارالعلوم میں صرف تدریس، افراد سازی اور مختلف النوع کے علمی و انتظامی کاموں کو ہی اولیت و اہمیت دی ہے اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی ملک و بیرون ملک کی یونیورسٹوں، ان کے جلسے، علمی سیمیناروں اور کانفرنسوں سے شرکت کے لیے بے شمار دعوت نامے آتے رہنے کے باوجود میں نے

دارالعلوم کی خدمت اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں شرکت کو کبھی اہمیت نہیں دی، اگرچہ میں شریک ہو تا رہتا اور اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کچھ فکر کی ہوتی تو آج حالت کچھ اور ہی ہوتی، مجھے نہ کل اس کی فکر رہی ہے نہ ہی آج اس پر کچھ افسوس و ندامت ہے، بلکہ مجھے اس پر خوشی اور فخر ہے کہ میں نے اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے جو کچھ سیکھا ہے، طلبہ دارالعلوم تک اسے پہچانے کی حتی المقدور کوشش کی اور الحمد للہ اس میں بہت کامیابی بھی نصیب ہوئی، کیا اس کے باوجود یہ افسوسناک بات نہیں ہے کہ میری ان تمام قربانیوں اور خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ میں نے دارالعلوم میں کوئی کام نہیں کیا۔ اسکو اور اس کے نظام کو برباد کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں دیا، نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے، بلکہ علمی، خاندانی، سیاسی اور ملکی و ملی سطح پر جو مجھے حیثیت عرانی حاصل ہے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے میری انتہائی ریک اور مکروہ انداز میں کردار کشی بھی کی جا رہی ہے اور سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک عوامی جلسے میں اور آپ کی موجودگی میں کہا گیا۔

لہذا آپ کے توسط سے مجلس شوریٰ سے میری گزارش ہے کہ ۱۸ جون ۱۹۹۰ء کے جلسے میں مجھ پر جو مختلف النوع کے الزامات لگائے گئے ہیں اگر وہ غلط ہیں اور یقیناً وہ غلط ہے جیسا کہ واقعہ ہے تو اس نہایت غیر ذمہ دانہ اور مذموم حرکت پر الزامات لگانے والوں سے باز پرس کی جاوے، کیونکہ ادارے کے مفاد کو بہر حال شخصیات پر فوقیت حاصل ہے، نیز تجویز میں میری سبکدوشی کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اور اس کے پس منظر میں جو الزامات کار فرما ہیں ان سب کی تحقیق کی جاوے اور مجھے بھی صفائی کا موقع دیئے جانے کے بعد اس فیصلے پر غور کیا جائے۔ امید کہ مجلس اپنی ذمہ داری اور انصاف پسندی سے کام لیتی ہوئی میری اس درخواست پر ہمدردانہ غور کرے گی۔

والسلام، خادم و حید الزماں کیرانوی ۲ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ (۱)“

## باب چہارم

### عربی زبان و ادب کی ترویج

دارالفکر

دارالمؤلفین

النادی الادبی

صحافتی خدمات

اسلوب تحریر

## عربی زبان و ادب کی ترویج

مولانا نے تحصیل علم کے بعد بہت سی علمی و فکری خدمات انجام دی ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو دیوبند واپس آ گئے اور دار الفکر نامی ایک ادارہ قائم کیا۔ مولانا منت اللہ رحمانی کی سفارش پر شوریٰ نے آپ کا تقرر دارالعلوم میں کیا۔ تقرر کے بعد دارالعلوم میں تعلیم و تربیت انتظام و اہتمام اور تعمیرات کے میدانوں میں آپ نے جو کارنامے انجام دیئے انھیں دارالعلوم کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے طلبہ کی رہنمائی اور ان کی تربیت میں نہ صرف بے مثال کردار ادا کیا بلکہ تعلیم و تربیت کی ایک نئی طرح ڈالی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں شاید یہ پہلی شخصیت تھی جس نے ”رجال سازی“ اور ”افراد سازی“ کا ایسا کارنامہ انجام دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ آپ نے معمولی سی تبدیلی اور اضافات کے ذریعہ دارالعلوم کی فضاء میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ وہ دارالعلوم جس کے طلبہ و اساتذہ عربی میں گفتگو کرنے سے شرماتے تھے اب اس کے درودیوار سے عربی لہجہ سنائی دینے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ جب ”جامع ازہر مصر“ کے شیخ عبدالحکیم دیوبند تشریف لائے تو انھیں دو چیزوں پر سخت حیرت ہوئی تھی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اتنا بڑا ادارہ صرف عوامی چندہ سے چلا کرتا ہے تو انھیں مبالغہ نظر آیا اس لئے ڈابھیل جا کر ایک بزرگ سے پوچھا کہ ”کیا واقعی دارالعلوم صرف عوام کے تعاون سے چلا کرتا ہے جب انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو تب یقین آیا، دوسری حیرتناک بات یہ تھی کہ استقبالیہ جلسہ کا اناؤنسر درجہ ہفتم کا ایک چھوٹا سا طالب علم تھا جس کی عمر تقریباً پندرہ برس تھی اور بے تکلف عربی بول رہا تھا اور خالص عربی لب و لہجہ میں کاروائی چلا رہا تھا۔ جلسہ کے بعد شیخ عبدالحکیم محمود نے حیرت کا اظہار کیا کہ ایک ہندوستانی بچہ اتنی صاف اور خالص عربی لہجہ میں کیسے بول سکتا ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ دارالعلوم میں عربی کی تربیت کا ایسا ہی انتظام ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ (۱)

مولانا ایک اجتہادی، تعمیری اور انقلابی ذہن و فکر کے مالک تھے اور اسی ذہن و فکر نے انھیں دارالعلوم میں ”نشاۃ ثانیہ“ کے نام اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کیا وہ دارالعلوم کو موروثی تسلط کے دائرہ سے نکال کر ایک آزاد علمی جمہوری فضاء میں لانا چاہتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دارالعلوم جیسے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم جدید اپریل و مئی ۱۹۹۵ء ص ۱۹ انضال الحق جوہر القاسمی۔

اسلامی اور عربی ادارے جسے ”ازہر الہند“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولانا سے قبل چند لوگ ہی عربی میں تقریر و تحریر میں کامل قدرت رکھتے تھے۔ مولانا نے آکر اس شدت سے محسوس ہونے والی کمی کو دور کیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد سمتوں میں کوششیں کی ایک طرف تو انھوں نے طلبہ کے لئے نصابی کتابیں اور لغات تیار کیں جن کی ترتیب میں روایتی نہج سے ہٹ کر عصری تقاضوں کو بنیاد بنایا اور دوسری طرف عربی زبان میں رسالے جاری کئے اور ”النادی الادبی“ قائم کی ان ہمہ جہت کوششوں کے نتیجہ میں انھوں نے عربی پر قدرت رکھنے والے نوجوانوں کی کئی نسلیں تیار کیں جو آج ملک و بیرون ملک میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں:

”علمی سطح پر مولانا نے دارالعلوم کے طلباء کو اس احساس کمتری اور مرعوب

ذہنیت سے آزادی دلائی جس کا وہ یونیورسٹی کے طلباء کے مقابلے میں مدتوں سے شکار تھے

اور جس کی وجہ صرف عربی میں اظہارِ تعبیر کی صلاحیت سے ان کی محرومی تھی مولانا نے

پہلی دفعہ استاد شاگرد کے درمیان وہ سچا تعلیمی رشتہ قائم کیا جو ان سے پہلے تعلیمی کم اور

خادم و مخدوم کا زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ کے درمیان جتنی مقبولیت ان کو حاصل تھی

وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو“ (۱)

دارالعلوم دیوبند میں جب آپ نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا اور عربی زبان و ادب کے سلسلے میں

چند سال ہی میں اس کے غیر معمولی اور حیرت انگیز نتائج سامنے آئے تو حضرت مولانا فخر الدینؒ نے فرمایا تھا کہ:

”دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کے دامن پر جو عربی زبان سے ناواقفیت ہونے کا

دھبہ تھا وہ آپ نے اپنی محنت و صلاحیت سے دھویا“ (۲)

آپ نے دارالعلوم میں جو عربی کا غلغلہ بلند کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مولانا کی اپنے مشن میں

کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج دارالعلوم اور وقف دارالعلوم میں کم از کم ۳۰/۳۱ اساتذہ

ایسے ہیں جن کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں مولانا کے فیض صحبت نے اہم کردار ادا کیا بلکہ تعلیم و تربیت کی ایک

نئی طرح ڈالی آپ کے ہزاروں شاگردوں نے شائستگی اور سلیقہ مندی کا نمونہ بن کر امت کے نو بہانوں

کو بنانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا (۳)

آپ نے دارالعلوم کے ۳۰ سالہ دورِ تدریس میں عربی لکھنے اور بولنے والوں کی ایک جماعت تیار

کردی جو ہند اور بیرون ہند میں عربی زبان میں دین و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند

کے نوجوان فضلاء جو عربی میں تقریر و تحریر کے لئے ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان میں تقریباً سبھی مولانا مرحوم یا

۱- ماہنامہ ترجمان دارالعلوم جدید خصوصی شمارہ ۹۹۵ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۱۵۳۔

۲- ”ماہنامہ حسنِ اخلاق“ نئی دہلی جون ۹۹۵ء ص ۶۵۔

۳- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ البدر“ کاکوری عبدالعلی فاروقی مئی ۹۹۵ء ص ۵۔

ان کے تلامذہ سے مستفید ہوئے ہیں اور ان کا یہ وہ اعزاز و امتیاز ہے جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ ممنونیت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ حلقہ دارالعلوم میں عربیت کا انقلابی پیانہ پر اجراء و احیاء اور اس کی ترویج و اشاعت مولانا وحید الزماں کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جو انھیں اسم با مسمیٰ بناتا ہے اور انھیں فرد و حید و فرد فرید ہونے کا حقدار ثابت کرتا ہے۔ (۱)

علاوہ ازیں مولانا مرحوم صرف عربی زبان کے مرد میدان نہیں تھے جیسا کہ عام تاثر ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں بعض وجوہ سے ان کی صلاحیت آشکارا ہو سکیں ورنہ دیگر علوم و فنون سے مولانا کا تعلق کچھ کم نہیں تھا ایک زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں مولانا کو دورہ حدیث کے بعض اسباق ملے تو انھیں بھی طلباء میں وہی مقبول عام حاصل ہوا جو مولانا کے عربی زبان کے اسباق کو حاصل تھا اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی وہی مقبولیت حاصل ہوئی چنانچہ مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر ”معارف القرآن“ کے مضامین کو چودہ سو صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں میں ”جواہر المعارف“ کے نام سے مرتب کیا گیا اور شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کی تسہیل کا جو خالص علمی کام کر دیا تھا اسے دیکھکر ان کی علمی گہرائیوں کا انداز ہوتا ہے یہ سب سے مولانا کی علمی ہمہ جہتی کی دلیل ہے۔ بقول مولانا ابوالحسن بارہ بنگوی :

”مولانا کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ وہ علامہ بکراں اور فاضل دوراں تھے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور برصغیر میں کچھ لوگ علم و فضل میں ان سے بڑے ہوں لیکن ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے اپنی شخصی کوششوں۔ بے لوث جدوجہد اور لگن سے عربی زبان و ادب، دینی علوم اور سماجی و علمی اور اخلاقی شعور و آگہی سے جتنی بڑی نسل کو آراستہ کیا شاید ہی آج کل کسی دینی درسگاہ سے شخص واحد کی محنت کے نتیجہ میں اتنی بڑی تعداد میں باشعور علماء نکلے ہوں“ (۲)

### امتیازی کمالات :

یوں تو مولانا مرحوم کی مدرس، خطیب، مصنف، صحافی اور منتظم ہر حیثیت سے ایک پہچان ہے لیکن ان کی اپنی امتیازی شان عربی تقریر و تحریر میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں وہ دارالعلوم کے ایک ایسے ممتاز یکتا اور فیض یافتہ فرزند تھے جن پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے ان کے فیض کو سمجھنے کے لئے بلا خوف و تردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حلقہ دارالعلوم دیوبند کے جو افراد آج عربی تقریر و تحریر میں کسی مقام کے حامل ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔ (۳)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے پندرہ روزہ ”خبر دار“ مئی ۱۹۹۵ء معصوم مراد آبادی ص ۷۔

۲- ماہنامہ البدر ”کاکوری“ مئی ۱۹۹۵ء مولانا عبدالعلی فاروقی ص ۶۔

۳- ماہنامہ ”الداغی“ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۹۵ء مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۷۔

## خطابت :

جہاں تک مولانا کی عربی خطابت کا معاملہ ہے تو آپ اس میدان کے شہسوار تھے اپ بغیر سوچے سمجھے کسی بھی موضوع پر عربی میں شائستہ اور فصیح و بلیغ تقریر پر قادر تھے ”چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم میں مملکت مصر و شام کے کچھ مہمان آنے والے تھے ان مہمانوں کی پوری ذمہ داری مولانا کے اوپر تھی آپ نے پوری تیاری کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کیا۔ طلبہ کی ٹیم نے مہمانوں کا عربی نعروں میں استقبال کیا۔ پھر دارالحدیث کے وسیع ہال میں استقبالیہ شروع ہوا جلسہ کی کاروائی کے فرائض ایک طالب علم انجام دے رہا تھا۔ عام طلبہ ”طالبعلمانہ مزاج“ کے مطابق دوران جلسہ باہر آنا جانا اور اٹھک بیٹھک لگائے ہوئے تھے کئی بار ناظم پروگرام نے اس طرف توجہ بھی دلائی لیکن طلبہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا آخر کار مجبوراً غصہ کی حالت میں مولانا پورے جاہ و جلال کے ساتھ مائیک پر کھڑے ہوئے اور طلبہ کو پھٹکارنا شروع کر دیا۔ آپ کی زبان سے الفاظ شعلوں کی طرح نکل رہے تھے یہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ عالم وار فٹکی میں ادا ہونے والے وہ عربی الفاظ تھے جن پر وہاں موجود دارالعلوم کے طلبہ و اساتذہ ”گوش بر آواز“ تھے ہی عرب مہمان بھی ”تصویر حیرت“ بنے اس ”جوار بھائے“ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر لہجہ کی پختگی، الفاظ کے زیر و بم، طرز ادا کی بے ساختگی اور تکلم پر کامل قدرت سے مغلوب و مبہوت ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ ایک معزز عربی مہمان اور سفیر شام کھڑے ہو گئے اور مولانا کو لپٹا کر ان کی پیشانی چوم لی اور اپنے دلی جذبات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ:

”مجھے دارالعلوم کے بارے میں اور کیا دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے جبکہ یہاں استاد و حید الزماں جیسے قادر الکلام، عربی متکلم اور خطیب موجود ہیں جن کی قدرت بیان پر مجھے بھی رشک آرہا ہے“ (۱)

بقول مولانا نور عالم صاحب :

”عربی زبان ان سے زیادہ صحت اور طلاقت کے ساتھ بولنے کا سلیقہ بر صغیر میں شاید ہی کسی عالم کو حاصل ہو۔ یہ اور بات ہے کہ عربی ادب کے ذخائر سے واقفیت اور عربی لکھنے کی قدرت میں ممکن ہے اور لوگ انکے ساتھ شریک یا ان سے بڑھ کر ہوں لیکن اسٹیج پر ان سے زیادہ رواں، برجستہ؛ شستہ اور نطق و اداء کی صحت کے ساتھ عربی بولنے والا کوئی اور نہیں تھا اور نہ ان سے اچھا کوئی عربی ادب کا مدرس تھا، یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا کی انتہائی مصروف ہمہ جہت اور ہنگامہ خیز زندگی میں قدیم عربی لٹریچر یا ادبی تراث کی تحقیق

”ماہنامہ البدر کاکوری“ مئی ۱۹۹۵ء مولانا عبدالعلی فاروقی ص ۷-۸

اور ایڈٹ کرنے اور جدید رجحانات پر نظر رکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ عربی کے مختصر سے اخباری تراشے/جتنا کام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ برہنہ برس تک ادبی لٹریچر کو کھگانے والوں کے بھی بس کی بات ہرگز نہیں تھی دوسری چیز تو اس سے بڑھ کر یہ تھی کہ اپنے افکار و خیالات کو منتقل کر دینے کی برق رفتار اور حیرت انگیز صلاحیت اور افہام و تفہیم، مرتب گفتگو اور مخاطب کو مطمئن کر دینے والوں کی بھرپور قدرت اس سے بڑھ کر یہ کہ ”بہت دور تک جا پہنچنے کے لئے بہت مختصر راستہ“ کی شریفانہ اور ہوشمندانہ راہ نمائی“ (۱)

وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے دارالعلوم کو ”قاسمیت“ کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے اور قاسمیت پر ان کے یہاں بڑا زور تھا۔ ہنگاموں کے دوران جب ان کی صف کے بعض افراد نے اس نسبت قاسمیت کا رشتہ دارالعلوم سے کمزور کرنے کی کوشش کی اور مسلم تاریخی حقیقت کو بدلنا چاہا اور ایک چھوٹا سا طبقہ جماعت دیوبند اور اس کی تحریک کو فکر و دانش اور علم و فضل کے قاسمی سرچشمہ سے جدا کر کے محض ایک روحانی شخصیت اور گوشہ نشین بزرگ کی حد تک محدود کرنے پر مصر ہوا تو مرحوم نے بڑے شہد و مد سے اس کام کا دفاع کیا اس وقت ان کی بات کو کسی نے نظر انداز نہیں کیا، چونکہ آپ کے نزدیک بات کسی مدرسہ کے آغاز اور بناء کی نہ تھی بلکہ جو چیز دارالعلوم دیوبند کے نام متعارف ہوئی اور جس کا خاکہ اور نقشہ قاسمی ذہن نے استوار کیا تھا اور جس کو شیخ الہند حکیم الامت حضرت تھانویؒ مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب جیسے نامور اور مشہور عالم نابغہ روزگار فرزند پیدا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ اصلاحیۃ الاسلام مولانا محمد قاسم ناتونوی جیسے عبقری وقت کے حکیمانہ ذہن کی بصیرت مندانہ تائید و نصرت سے بروئے کار آیا تھا پھر اس کو عالم گیر شہرت نے بام عروج تک پہنچایا کتنی قربانیوں کے بعد ایک پودے نے درخت کی شکل اختیار کر لی صرف چند لوگوں کی وراثت کیسے ہو سکتا ہے یہی بات مولانا مرحوم کے لئے قلق کا باعث بنی جس کی بناء پر کسی چیز کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ آپ کے نزدیک اپنی عزت و شہرت سے زیادہ دارالعلوم کا احترام تھا، دارالعلوم کی عظمت و وقار کے لئے بڑی سے بڑی رقم اور بڑے سے بڑا جھگڑا کر لیتے، چنانچہ آپ ایک بار چندہ کے لئے کسی جگہ تشریف لے گئے وہاں ایک صاحب مال و جلال سے ملاقات کی علاقہ کے علماء و برسر آوردہ شخصیتیں ساتھ تھیں۔ ان صاحب کو بہت ہی سخت و سست کہا اور غرور و نخوت کے انجام سے ڈرایا۔ حالانکہ اس نے اپنے رویہ پر معذرت چاہی اور بڑی رقم بھی

۱- ”وہ کوہ کن کی بات“ مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۳۵



پیش کی لیکن آپ نے اسکی رقم قبول نہیں کی، ٹھیک اسی موقع پر مولانا کے ایک شاگرد نے بڑی لجاجت سے اپنے گاؤں چلنے کی درخواست کی (جو قریب ہی تھا) آپ نے فرمایا میرا یہ سفر ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ دارالعلوم کے چندہ کے لئے ہیں اگر آپ کے یہاں دس روپے بھی چندہ ہو جائے تو میں تیار ہوں چنانچہ آپ وہاں تشریف لے گئے وہاں ایک کثیر رقم عزت و احترام کے ساتھ موصول ہوئی (۱)

مولانا مدارس عربیہ کے ناقص طرزِ تعلیم اور طلباء کی ذہن سازی و کردار سازی میں پھیلی کوتاہیوں کا بار بار تذکرہ فرماتے جس سے ان کے دل میں امت کے نو نہالوں اور قوم کے جگر گوشوں کی ہمدردی اور ان میں صلاحیت پیدا کرنے کی دلی تڑپ محسوس ہوتی تھی بہت درد سے فرماتے کہ:

”بھائی امت کا بہترین سرمایہ ہماری کوتاہیوں اور ناکردگی کے سبب ناکارہ بنتا جا رہا

ہے ہمیں کچھ کرنا چاہیے“

خصوصاً دارالعلوم کے طلباء میں وہ انقلابی تبدیلیوں کے خواہاں تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں جو تبدیلی ہوگی اس کا اثر برصغیر اور دیگر ممالک پر بھی پڑیگا آپ نے پوری جانفشانی اور انتھک کوشش کر کے دارالعلوم دیوبند کے طلباء میں ایک نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا فرمایا اور طلباء کی ایک اچھی خاصی تعداد عربی زبان اور مولانا کے طرز فکر کو لے کر ہندوستان اور بیرون ہند میں پھیل گئی۔

آپ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور طریقہ تعلیم و تدریس میں بھی تبدیلی کے خواہاں تھے اس سلسلہ میں کہا کرتے تھے کہ :

”اسلامی مدارس میں فارسی زبان کو بحیثیت زبان پڑھانا معقول بات ہے لیکن

عربی زبان کے لئے موقوف علیہ بنادینا قرین قیاس نہیں درس نظامی کے لئے ہمیں نئی اور

مفید کتابیں شائع کرنے کی ضرورت ہے جس میں نئی نسل کی ذہنی ساخت اور دورِ حاضر کے

تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تفسیر حدیث، فقہ اصول فقہ تو مسلمات میں سے ہیں ان میں جو

تبدیلی ممکن ہے وہ طریقہ تعلیم اور زیادہ سے زیادہ کتابوں کے انتخاب میں ہونی چاہیے۔ البتہ

دیگر علوم و فنون جن کی حیثیت مقاصد کی نہیں ان میں جو غیر ضروری فن ہے یا جس کی

افادیت کم ہو گئی ہے اس کو نکال دینا یا صرف حسب ضرورت باقی رکھ کر دیگر ضروری

اور مفید فنون کو داخل نصاب کرنا چاہیے کیونکہ اصل مقصود نصاب نہیں بلکہ طلبہ میں

صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اس کیلئے نصابِ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے

بعد طریقہ تعلیم میں بھی حتی المقدور اصلاح کی ضرورت ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ استاد

رات بھر مطالعہ کے نام پر جو ہضم کرتا ہے مسند تدریس پر بیٹھ کر اس کی قے کر دے بلکہ سبق کے وسیع تر مطالعہ اور مکمل تشفی حاصل کرنے کے بعد طلبہ کی عقل و فہم کا لحاظ اور غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے درس دے۔ ہمارے یہاں فقہی یا کلامی مختلف فیہ مسائل میں طویل تقریر کی جاتی ہے اور جہاں اخلاق و معاملات اور آداب زندگی کے متعلق احادیث آتی ہے ان سے سرسری طور پر اساتذہ گزر جاتے ہیں یا وہاں تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ سال ختم ہو جاتا ہے اس طریقہ کار سے عملاً اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ دین میں صرف عقائد و عبادات کی اہمیت ہے معاملات و اخلاقیات وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے حالانکہ اگر معاملات درست نہ ہو تو عبادات بھی عند اللہ مقبول نہ ہو اتباع سلف یہ نہیں کہ مخصوص ماحول کے پیداوار قدیم معتقدات و خیالات کی تردید میں پورا زور صرف کر دیں اور جہمیہ و معتزلہ اور خوارج جیسے قدیم اور بے نام و نشان فرقوں کی تردید نیز صفات باری کے عین و غیر اور قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کے سلسلے میں فلسفیانہ موشگافیاں زیر بحث لائیں بلکہ اکابر و اسلاف کا اتباع تو یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے دور کے باطل فرقوں کے افکار و نظریات کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے پودے جڑ سے اکھاڑ دیئے اس طرح ہم بھی دور حاضر کے باطل فرقوں اور اسلام مخالف تحریکوں کا جائزہ لے کر مدلل طریقے سے ان کا جواب دیں اگر آج ہمارے اسلاف زندہ ہوتے تو وہ بھی دور حاضر کے پیچیدہ مسائل ان کی تقریر و تحریر اور سرگرمیوں کا محور ہوتے، وقت کی ضرورتوں سے آنکھ بند نہیں کر سکتے تھے“ (۱)

چنانچہ آپ اس طرح کی خامیوں کو ہمیشہ دور کرنے کی کوشش کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا اس پر عمل بھی کرتے خاص طور پر انہوں نے اپنے نصاب اور اپنے طریقہ تدریس میں تبدیلی لا کر سب کو اس طرف اکسایا انہوں نے اس میں بہت حد تک کامیابی بھی حاصل کی اور ان چیزوں سے طلبہ کو پہلے کے مقابلے زیادہ فیض حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کچھ چیزوں میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب اور طریقہ تعلیم کی تعریف کرتے کیونکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ کو ہر ایک چیز پڑھنے سے خود پر بھی اعتماد ہو جاتا ہے اور ایک علم کے ساتھ دوسرے علوم کی بھی اچھی خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں کے طلبہ بہت سی چیزوں کا خود سے مطالعہ کرتے ہیں۔

چنانچہ انھیں چیزوں کو دیکھ کر آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ دارالعلوم اور علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی میں ایک تعلق پیدا ہو جائے خاص طور سے عربی ادب کے سلسلے میں جو مواقع طلباء کو دارالعلوم میں میسر نہ آئے وہ علی گڑھ میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارے اور طلبہ علی گڑھ میں اپنے اثرات پیدا کریں، چنانچہ آپ نے اس خواہش کا تذکرہ پروفیسر محمد راشد ندوی سے کیا اور انھوں نے آپ کی بات سے اتفاق فرمایا یہ بات اکیڈمک کونسل میں پیش کی گئی اور وہاں سے پاس کرائی گئی اسی وقت سے دارالعلوم کے فضلاء شعبہ عربی میں داخل ہونے شروع ہو گئے (۱)

جب آپ دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی کے فارغین کا موازنہ کرتے تو آپ کو اس بات پر افسوس ہوتا کہ فضلاء قاسمی میں علیگ برادری کی طرح تعلق نہیں ہے۔ علی گڑھ کے طلبہ میں علی گڑھ چھوڑنے کے بعد بھی ایک خاص تعلق رہتا ہے اور ہر علاقہ میں علیگ برادری کی انجمنیں ہیں۔ سوسائٹیاں ہیں لیکن قاسمی فضلاء میں یہ سب چیزیں ناپید ہیں، فضلاء دارالعلوم دیوبند میں اگر صحیح رابطہ ہو تو وہ عظیم کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

دوسرے خود دارالعلوم کے بہت سے فضلاء عرب ممالک اور ہندوستان میں علمی کام کر رہے ہیں اور ایک خاص مقام رکھتے ہیں مگر دارالعلوم کے رسائل اور ذمہ داروں کی طرف سے ان کی کبھی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فضلاء کی خدمات کو ارباب ندوہ اور اس کے عربی اردو ترجمان جس طرح پیش کرتے ہیں اس کا پچاس فیصد بھی دارالعلوم کی طرف سے نہیں ہوتا حالانکہ ان کی صلاحیتوں سے خود دارالعلوم فائدہ اٹھا سکتا ہے، آپ فضلاء کے لئے مستقل ایک پروگرام بنانا چاہتے تھے۔ (۲)

## دارالفکر

دارالعلوم سے رسمی فراغت کے بعد آپ کے سامنے روزگار کا اہم مسئلہ درپیش تھا۔ اولاً آپ نے اسی پریشانی کی پیش نظر مولانا حبیب الرحمن کے یہاں بحیثیت سیکریٹری ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن یہ سلسلہ کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا پھر وہی حالات عود کر آئے لیکن مزاج میں مایوسی اور حالات سے گھبرانا آپ کی عادت کے خلاف تھا۔ طبیعت ہزار رنگ، ذوق جدت پسندی اور عربی تحریر و انشاء پر قادر الکلامی نے ایک نئی راہ بھائی۔ دوبارہ دیوبند کی طرف کوچ کیا چونکہ یہاں پر طلبہ کا ہجوم تھا جو عربی لکھنے اور بولنے کی اہمیت جان چکے تھے لیکن کوئی ایسا معلم نایاب تھا جو ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر دے اس کام کی مولانا میں پوری صلاحیت تھی۔ چنانچہ آپ نے طلبہ کی ضرورت پورا کرنے کے لئے اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے ”دارالفکر“ کی بنیاد ڈالی۔ دارالفکر کے افتتاح کے ساتھ ہی طلبہ دارالعلوم کی اچھی تعداد ان سے جڑ گئی۔ دارالفکر کا قیام عمل ۱۹۵۸ء میں ہوا چونکہ اس کو ایک ادارہ کی حیثیت دی گئی جس میں چند لوگوں کی شرکت

۱- پروفیسر محمد راشد ندوی (سابق چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف عربک) بالمشافہ۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم جدید خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۳۳۱-۳۳۳۔

ضروری ہوتی ہے۔ لہذا آغاز کار ہی سے آپ نے چند لوگوں کو اپنا ہم خیال بنالیا جس میں مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی اپنی استعداد اور زبان و ادب کی صلاحیتوں کے شعلہ مزاج گرم گفتاری اور اخلاص مندی سے آراستہ، قاری علاؤ الدین صاحب مدنی کتب خانہ کے منبر ایک خاص سیاسی حلقے سے وابستگی کے باوجود یاروں کے یار اپنی آزادانہ رائے کے مالک، خود مولانا وحید الزماں نفاست پسندی، دوست نوازی، فراخ دستی، بلند حوصلگی اور انتظامی امور میں مہارت اور مشاہد صاحب قلم طرز ادیب اپنی خاموش طبع، صلح جوئی دقیقہ سنجی سے آراستہ یہ ارکان اربعہ ہر جمعرات کو ہفتہ واری مجلس طعام یاد عوت شیراز میں شریک ہوتے جہاں اخوان الصفاء اپنے یہاں سے کھانا لاتے اور دارالفکر میں ایک دسترخوان پر بیٹھ کر Table talk کا لطف اٹھاتے جس کا مرکز حافظ ظہیر صاحب کی بیٹھک ہوا کرتی، یہ مجلس دیر رات تک جاری رہتی چنانچہ دارالفکر کو ایک ادارہ کی حیثیت حاصل ہو گئی اور لوگوں نے اس کی طرف توجہ دینا شروع کر دی تو مولانا نے اس ادارہ سے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام ”القاسم جدید“ رکھا گیا سب لوگوں نے اس میں پورا پورا تعاون کیا اور ہفتہ واری Table talk میں ماہنامہ ”القاسم جدید“ کے مضامین کا انتخاب، ادارہ اور تبصرہ و ترتیب پر مشاورت ہوتی اور مجلس ہی میں تمام چیزوں کو آخری شکل دے دی جاتی اس رسالہ نے کافی مقبولیت حاصل کی اور بعض لوگوں نے اس پر تبصرہ بھی کیا۔ لیکن افسوس کہ اس کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور مجبوراً دو سال بعد اس کو موقوف کرنا پڑا۔ (۱)

دارالفکر قائم تو کیا گیا تھا جدید عربی زبان و ادب کی تعلیم و مشق کے لئے، لیکن وہاں صرف عربی ادب کی کلاسیں ہی شروع نہیں ہوئی بلکہ اس احساس کے تحت کہ عربی مدارس کے فضلاء میں انگریزی زبان سے ناواقفیت کے سبب شدید احساس کمتری پائی جاتی ہے اس کے پیش نظر انگریزی کلاسوں کا بھی آغاز کر دیا گیا، انگریزی کلاس کی ذمہ داری حافظ واجد علی صاحب جھنجھانوی کے سپرد کی گئی اس ادارہ میں زبان و ادب کی تعلیم کے مقاصد اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کر دیا جاتا اس طرح دارالفکر کا فیض یافتہ ہر طالب علم اعتمادی فکری شعور و آگہی، ذہنی بالیدگی اور احساس ذمہ داری کا پیکر بن کر باہر آتا تھا اور یہ دراصل سب کچھ مولانا کے علمی فیضان کا نتیجہ تھا جنہوں نے دارالفکر کے ذریعہ مردم خیزی اور کردار سازی کی ایک مہم شروع کی تھی اور اس مہم کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں ان کی فعال اور متحرک شخصیت شب و روز مصروف کار رہتی تھی۔ (۲)

”مولانا کے اچھوتے طرز تعلیم اور طلباء کی صلاحیتوں کو ابھارنے ان میں خود

اعتمادی اور خودداری پیدا کرنے ان کو نظم و ضبط کا پابند بنانے، عربی تلفظ درست کرانے

۱- ڈاکٹر علاؤ الدین دیوبندی (رفیق محترم مولانا وحید الزماں کیرانوی) بالمشافہ۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ترجمان اسلام“ بنارس ۱۹۹۵ء مولانا اسیر اوروی ص ۹-۱۱۔

اور مختصر وقت میں عربی رسم الخط میں ماہر بنانے وغیرہ جیسی کئی خصوصیات کے سبب دارالفکر اور مولانا کا چرچا دارالعلوم کی چہار دیواری میں عام ہو گیا، طلبہ کے ساتھ بے تکلفی کا انداز آپ کے یہاں مدارس کے عام اساتذہ سے بالکل مختلف تھا، خوش طبعی اور کشادہ دلی سے بات چیت کرنے کے باوجود ادب و احترام اور نظم و ضبط کا سلیقہ و طریقہ کار ”دارالفکر“ کی شان تھی“ (۱)

دارالفکر کے ذریعہ مولانا کا مقصد مدارس عربیہ میں نئی روح پھونکنا تھا بیداری لانے کا لائحہ عمل تو اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی مرتب کر چکے تھے وہ قدیم طریقہ تدریس سے متفق نہیں تھے اور نصاب تعلیم کو جامد نہیں سمجھتے تھے چنانچہ زمانہ کے حالات اور رفتار دیکھ کر انھوں نے عربی زبان و ادب میں دستگاہ کامل پیدا کرنے کے لئے نیا نصاب تعلیم مرتب کیا اور دارالفکر میں نیا نصاب تعلیم اور نیا طریقہ تعلیم بھی رائج کیا۔ بلاشبہ مولانا مرحوم کی تعلیم و تربیت میں مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور اسی بصیرت نے ان گنت لعل و جوہر پیدا کئے دارالفکر کے طریقہ تدریس میں یہ بھی شامل تھا کہ مکمل طور پر تختہ سیاہ کا استعمال کیا جائے جو آج کل اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے مدارس میں یہ طریقہ آج بھی مستعمل نہیں ہے۔ دارالفکر کے قیام کے بعد آپ نے ایک مکتبہ فکر کے قیام کا لائحہ عمل تیار کیا جس میں ابھرتے ہوئے مصنفین کو دعوت دی کہ ادارہ سے وابستہ ہو کر اپنی کاوشوں کو جاری رکھیں ادارہ ان کی نگارشات کو منظر پر لائے گا لیکن اس مکتبہ کے قیام کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ دیوبند کے ایک متمول عالم مولانا شوکت علی خاں مرحوم بھٹہ والے اس کے قیام کے لئے راضی ہو گئے یہ مکتبہ چند مہینے میں ہی عروج پر پہنچ گیا اور اس مکتبہ کی شہرت کا باعث ”القاموس المجید“ بنی جو اسی مکتبہ سے شائع ہوئی علاوہ ازیں اس مکتبہ سے خود مولانا کی کئی اور چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوئیں اور دیوبند جگہ پر اس کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی لیکن کچھ لوگوں کو اس کی ترقی دیکھ کر خطرہ لاحق ہوا کہ اس مکتبہ کے رہتے ہوئے ان کی تجارت ماند ہو جائے گی چنانچہ انھوں نے صاحب اثاثہ کو مولانا کی طرف سے شکوک و شبہات میں ڈال کر غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اور اس سلسلہ کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا (۲)

## دارالمؤلفین

”مولانا وحید الزماں صاحب کو دارالعلوم کے ذرہ ذرہ سے عقیدت و محبت تھی اور اپنے اکابر سے غایت درجہ کی عقیدت تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے علوم و معارف

۱- ”ماہنامہ دینی مدارس“ دہلی اپریل ۱۹۹۵ء مولانا سید غیاث الحسن مظاہری ص ۳۔

۲- مولانا ریاست علی بجنوری (استاد حدیث دارالعلوم دیوبند) بالمشافہ

پراکٹمی کے طرز کا ٹھوس، تحقیقی اور معیاری کام ہو تاکہ ہمارے اکابر کی عظمتِ شان آج کی علمی دنیا میں زیادہ اجاگر ہو انھوں نے کوشش کی یہ عظیم و تاریخ ساز علمی کارنامہ دارالعلوم ہی کے زیر سایہ انجام پذیر ہو۔ لیکن جب یہ بات نہ بن پائی تو خود ہی اس مقصد کے لئے ایک جگہ خرید کر تعمیر کرائی اور ۱۹۸۸ء کے اوائل میں مولانا نے ”دارالمؤلفین“ کے نام سے ایک تصنیفی اور ثقافتی ادارہ کی بناء رکھی“ (۱)

اس ادارہ کی بنا اور قیام سے مولانا کے کئی مقاصد تھے آپ نے اکابر کے علوم کا احیاء اور ان کی کتابوں کو ایڈٹ کرا کے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرایا۔ اپنے ان معاصرین و تلامذہ کے قلم کو جنہیں تصنیف و تالیف کا ذوق ہے، جلا بخشنا یہاں کے طلبہ و اساتذہ کے لئے عالم عرب کے نوع بہ نوع مفید لٹریچر کا ترجمہ و اشاعت بھی دارالمؤلفین کے متعلق لکھتے ہیں:

”دیوبند ایک قصبہ ہونے کے باوجود مرکز تعلیم ”دارالعلوم“ کی بناء پر عالمی شہرت و اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ یہاں تجارتی کتب خانوں کی کمی نہیں ہے جو تجارتی سطح پر ہی سہی علوم اسلامیہ کی اشاعت کا کام انجام دے رہے ہیں لیکن ایک ایسے تصنیفی علمی ادارہ کی برابر ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے ذریعہ ایک طرف اسلامی موضوعات پر لٹریچر شائع کیا جائے جو مسلمانوں کی نئی نسل کے ایمان و عقائد کی پختگی اور ملت کے روحانی و معنوی بقاء و تحفظ میں نمایاں کردار ادا کرے۔ دوسری طرف ”دارالعلوم دیوبند“ اور دیگر مدارس عربیہ کے باصلاحیت افراد کی تصنیفی اور تحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون و مددگار ہوگا۔

”دارالمؤلفین دیوبند“ اسی جذبہ و احساس کے ساتھ بہت سے احباب و مخلصین کے مشورہ و اصرار پر متوکلاً علمی اللہ قائم کیا گیا ہے۔ بظاہر اس کے پاس جذبہ عمل اور عزم محکم کے علاوہ مادی وسائل و اسباب نہیں ہیں۔ انشاء اللہ اس کے پروگراموں کو احباب و رفقاء اور علم دوست حضرات کے تعاون سے حتی الامکان بجلت ممکنہ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔“

”اغراض و مقاصد دارالعلوم دیوبند“:

(۱) عصر حاضر کے اسلوب بیان اور اس کے علمی و عقلی تقاضوں کے مطابق حسب ذیل موضوعات پر مختلف عنوانات کے تحت کتابوں کی ترتیب و اشاعت

علوم کتاب و سنت تعلیمات و احکام اسلام عقائد و نظریات شخصیات اسلام  
اسلامی معیشت عبادات اخلاق و معاشرت فلسفہ اسلام تاریخ اسلام  
تعلیم و تربیت

- (۲) اکابر دیوبند کے علوم کا احیاء و تحفظ اور ان کے افارات کی تسہیل و ترتیب جدید  
(۳) اہم اور مفید کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم  
(۴) عربی زبان کی اشاعت اور نصاب تعلیم کیلئے حسب ضرورت کتابوں کی تیاری  
(۵) دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے ہونہار فضلاء کی تصنیفی تربیت“ (۱)

چنانچہ مولانا نے اپنے اس ادارہ کا افتتاح شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی سوانح حیات  
”مآثر شیخ الاسلام“ سے کیا پھر یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ اکابر کے علوم و معارف کو ایڈٹ کرانے کے لئے  
ابتداء کہاں سے کریں؟ یہ طے پایا کہ سالارِ قافلہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی پر کام کریں چنانچہ  
اولاً حضرت نانوتوی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی کتابوں کی تسہیل و ترتیب پر کام شروع ہوا اور اس پر کام کرنے  
والوں کو پوری آزادی دی گئی کہ کام بہترین کریں ادارہ میں جو چیز طلب کی جاتی فوراً مہیا کی جاتی۔ ایک خاص  
بات جو دارالمؤلفین کے سلسلے میں نظر آئی وہ یہ کہ مولانا علمی و دینی پہلو سے دارالعلوم کے خاص فکر اور منفرد  
نقطہ نظر کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے مکتبہ فکر کے افکار و خیالات کا احترام بھی کرتے تھے اور  
اس سلسلے میں وسیع النظر اور روشن خیال بھی تھے (۲)

چنانچہ ایک بار دارالمؤلفین کے کسی ممبر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حضرت نانوتوی کی مشکلمانہ انداز میں  
اسلام کے دفاع میں لکھی کتابوں اور مضامین کو آج کی عصری زبان میں پیش کرنے میں مولانا مودودیؒ کی  
تحریروں میں زبان و بیان طرزِ نگارش اور طریقہ استدلال کی حد تک رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ مولانا مودودیؒ  
کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود دورِ حاضر کے ایک متکلم اسلام کی حیثیت و اہمیت میں کوئی  
کلام نہیں اس لئے اگر دارالمؤلفین کی لائبریری میں مولانا مودودیؒ کی تصنیفات بھی ہوں تو ہمیں اپنے کام سے  
متعلق ان سے استفادہ کا موقع ملے گا اور رہنمائی بھی حاصل ہوگی۔ مولانا نے اس کو فوراً منظور کر لیا اور  
دوسرے ہی روز دارالمؤلفین کی لائبریری میں مولانا موصوف کی تمام تصنیفات کا ایک مکمل سیٹ آگیا۔ یہاں  
پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دیگر اکابر دیوبند کی طرح آپکو بھی مولانا مودودیؒ سے بہت سی چیزوں میں  
اختلاف تھا اس کے باوجود ان کی مذکورہ روشن خیالی کا موازنہ اگر دارالعلوم کی اس صورت حال سے کیا جائے  
تو بڑا عجیب لگتا ہے جس میں مختلف کتابوں کے لٹریچر کے مطالعہ کی ہمت افزائی تو دور کی بات ہے بلکہ یہ چیزیں

۱- حاکم دارالمؤلفین (غیر مطبوعہ)

۲- مولوہ عبدالقدوس نیرانوی (بالمشافہ)

قابلِ عتاب بھی ہیں ایسے ماحول میں روشن خیالی ذہانتوں اور صلاحیتوں کی صقلی گری عجیب بات ہے۔ (۱)

مولانا کی علمی جہتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود مولانا کی زیر نگرانی مرکز دعوت اسلام جمعیت علماء ہند اور دارالمؤلفین دیوبند سے جو مختلف علوم و فنون کی وسیع کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ ان کی علمی ہمہ گیری کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ پھر جس علمی یکسوئی اور اس کمال کے ساتھ آپ نے زندگی کے آخری تین سالوں میں مفتی محمد شفیعؒ کی مقبول عام تفسیر ”معارف القرآن“ کے مضامین کو چودہ سو صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں ”جواہر المعارف“ کے نام سے مرتب فرمایا اور شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کی تسہیل کا جو کام شروع کر دیا تھا یہ سب مولانا کی علمی جہتی کی دلیل اور دارالمؤلفین کی ترقی اور علمی کارناموں کا ثبوت ہے۔

## النادی الادبی

مولانا وحید الزماں سے قبل دارالعلوم دیوبند میں عربی تقریر و تحریر اور انشاء پر دازی کا ماحول نہیں تھا۔ گنتی کے چند اساتذہ ہی عربی گفتگو پر قدرت رکھتے تھے۔ وہاں جو کچھ بھی علمی یا دینی اور ادبی کام ہوا اس کا تعلق انشاء پر دازی یا عربی صحافت وغیرہ کی ذہن سازی سے نہ تھا اور جہاں تک طلبہ کا تعلق ہے تو اس وقت پورے دارالعلوم میں گنتی کے چار یا پانچ طلبہ ہی عربی انشاء پر قدرت رکھتے تھے ان طلباء کی بھی یہ صلاحیت ان کے ذاتی شوق اور کوششوں کا نتیجہ تھی کیونکہ نہ تو دارالعلوم میں کوئی اس کا انتظام تھا اور نہ ہی کسی نے اب تک اس طرف پیش قدمی کی تھی۔

لیکن مولانا وحید الزماں صاحب نے اس کمی کو محسوس کیا اور اس سلسلے میں کوشش کی اور باضابطہ مدرس ہونے کے بعد دارالعلوم میں جس بڑے پیمانے پر عربی کا غفلتہ بلند کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے آپ نے معمولی سی تبدیلی اور اضافات کے ذریعہ دارالعلوم کی فضاء میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی وہ دارالعلوم جس کے طلباء اساتذہ عربی میں گفتگو کرنے سے شرماتے تھے وہاں پر مولانا کے تعمیری اور انقلابی ذہن نے دارالعلوم میں ”نشاۃ ثانیہ“ کے نام پر اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کر دیا اور دارالعلوم کو موروثی تسلط سے نکال کر ایک آزاد علمی اور جمہوری فضاء میں لے آئے اس سلسلے میں انھوں نے کئی سمتوں میں کوشش کی۔ ایک طرف تو انھوں نے طلبہ کے لئے نصابی کتابیں اور لغات تیار کیں جن کی ترتیب میں روایتی نہج سے ہٹ کر عصری تقاضوں کو بنیاد بنایا اور دوسری طرف عربی میں رسالے جاری کئے اور طلبہ کی قوت گویائی کی صلاحیت اجاگر کرنے کے لئے ”النادی الادبی“ نام کی انجمن قائم کی، جس کے قیام کا مقصد طلبہ کو عربی زبان کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے اندر عربی بولنے اور لکھنے کا سلیقہ پیدا کرنا تھا لیکن آپ نے اپنی وسعت ذہنی اور بلند فکری سے اس پلیٹ فارم کو طلبہ کی ہر طرح کی تربیت کا میدان بنا دیا اور اس کے ذریعہ

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان اسلام“ بنارس مئی ۱۹۹۵ء مولانا سیر اور وی ص ۱۵۔



جہاں آپ نے طلبہ سے علمی و تصنیفی کام لئے اور ان کو عربی زبان بولنے اور سمجھنے کا ملکہ دیا اسی طرح ان کے جمود و تعطل کو توڑ کر ان میں فعالیت پیدا کرنا طلبہ میں اخلاقی قدروں کو بحال کرنا ان کو اپنے مقام و مرتبہ کی شناخت کرانا، ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا، تھوڑے وقت میں کام کرنے کا گر سکھانا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا اور اسلامی طرز معاشرت کی طرف عملی رہنمائی کرنا۔ آپس میں جذبہ اخوت و بھائی چارگی پیدا کر کے آپسی تعاون پر آمادہ کرنا اور اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنے کا سلیقہ دینا غرض کہ آپ نے ”النادی الادبی“ کے ذریعہ طلبہ میں علمی و عملی بیداری کی وہ روح پھونکی کہ ہر طرف دارالعلوم میں ”النادی الادبی“ کے پروگراموں کا چرچا ہونے لگا اور ہر آنے والا طالب علم اس سے وابستہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ”النادی الادبی“ کے ہفتہ داری پروگراموں سے طلبہ نے عربی میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا سلیقہ سیکھا اور اس کی بدولت علم مجلسی سے آراستہ ہوئے۔ النادی کے خاص مکتبہ نے طلبہ میں مطالعہ و تحقیق کا شگفتہ ذوق پیدا کیا اور اسکے شعبہ تصنیف و تالیف نے طلبہ میں عربی زبان میں مضمون نگاری کا جذبہ پیدا کر کے دیواری پرچوں کے ذریعہ اظہار خیال کے مواقع دیئے۔ اس کے نظام ترکیبی نے طلبہ میں حسن انتظام اور اپنی زندگی کو منظم کرنے کا طریقہ سکھایا، یہی وجہ تھی کہ النادی کا بڑے سے بڑا پروگرام طلبہ خود کر لیا کرتے تھے اور اس میں اپنی انتظامی صلاحیتوں کا وہ مظاہرہ کیا کرتے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے (۱)

”النادی الادبی“ کے تمام امور کے لئے باقاعدہ ایک کمیٹی مقرر کی جاتی جس کے مشرف اعلیٰ بذات خود مولانا تھے، باقی ذمہ داری طلبہ کے سپرد تھیں۔ ہر سال شعبہ عربی سے ان کا انتخاب کیا جاتا جس کا طریقہ یہ ہوتا کہ سبق کے آغاز کے چند ہی دنوں میں آپ اس بات کا اندازہ لگالیا کرتے تھے کہ کچھ طلبہ زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور کچھ کمزور ہیں صلاحیت کی بنیاد ہی پر کابینہ کی تشکیل دی جاتی جس میں ایک معتمد ہوا کرتا جس کو ”النادی الادبی“ کا صدر کہا جاتا تھا۔ پوری ذمہ داری اسی کے سپرد تھی اس ادارہ کا اپنا الگ دفتر تھا جس میں متعدد ڈیسک رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈیسک پر ”النادی“ کے کسی خاص ایک ذمہ دار کے منصب کی تختی رکھی ہوتی تھی۔ الماریوں میں قرینے سے فائلیں اور رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طلباء کی تحریری کاوشوں کے نمونہ شیشے کے بڑے بڑے فریموں میں آویزاں تھے۔ ”النادی“ کا اپنا الگ ایک نظام تھا پوری انجمن مختلف شعبوں پر منقسم تھی، شعبہ تقریر، شعبہ تحریر، شعبہ اصلاحات، شعبہ تعاون وغیرہ، ہر شعبہ کے تین عہدیدار ہوتے تھے۔ ناظم، نائب ناظم، معاون، معتمد ان سب شعبوں کا سربراہ تھا اور براہ راست سرپرست اعلیٰ کو جوابدہ تھا۔

۱- ”النادی الادبی کے جلسے کا آنکھوں دیکھا حال“ (کتابچہ) پروفیسر بدر الدین الحافظ ص ۳-۱۰۔

## شعبہ تقریر

اس شعبہ کے تحت طلباء عربی زبان میں تقریر کی مشق کرتے تھے ان کے لئے جمعرات کے دن مغرب کی نماز کے بعد دارالعلوم کی مختلف درسگاہوں میں آٹھ آٹھ دس دس طلباء ایک جگہ بیٹھتے ایک طالب علم جو ان سب میں باصلاحیت اور ممتاز ہوتا ان کی نگرانی کرتا یہ ایک چھوٹا سا جلسہ ہوتا تھا اور اس میں ایک مکمل اجلاس کے آداب کی رعایت کی جاتی مراقب یا نگران کسی طالب علم کے نام کا اعلان کرتا اور وہ متعین جگہ پر کھڑے ہو کر اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق تقریر کرتا نگران کے پاس ”النادی الادبی“ کے مطبوعہ فارم ہوتے تھے جن پر مقرر کا نام اس کی تقریر کا عنوان تحریر کیا جاتا اور یہ بھی لکھا جاتا کہ اس نے کتنی دیر تقریر کی ہے اس کا لہجہ کیسا تھا اس کی تقریر میں نحوی، صرفی اور لغوی غلطیاں کتنی تھیں۔ بعد میں یہ فارم دفتر میں جمع ہوتے اس طرح تمام ممبر طلباء کی ہفتہ واری سرگرمیوں کی رپورٹ معتمد کے سامنے رہتی۔ ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی ان جلسوں میں خاص طور پر ان طلباء کو ترجیح دی جاتی تھی جس کی کارکردگی ہفتہ واری اجتماعات میں بہتر رہی ہو (۱)

ماہانہ جلسوں کی شان اپنی الگ تھی کافی دن پہلے دارالعلوم کے صدر گیٹ پر اعلان آویزاں کر دیا جاتا کہ فلاں تاریخ کو ”النادی الادبی“ کا ماہانہ اجتماع منعقد ہو گا جو طلبہ اس اجتماع میں اپنی تحریری یا تقریری کاوشیں پیش کرنا چاہتے ہو وہ درخواست دے دیں، اس کے ساتھ ہی اجتماع کی باقاعدہ تیاری شروع ہو جاتی۔ خواہشمند طلباء سے انکے مقالے، تقریریں، نظمیں اور محادثے حاصل کر لئے جاتے معتمد اور شعبہ تقریر کے ذمہ دار لوگ ان کاوشوں پر غور و خوض فرماتے، ضرورت کے مطابق اصلاح بھی کرتے، لمبی اور طویل تحریروں کو مختصر کرتے تاکہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ طلبہ کو موقع دیا جاسکے یہ اجلاس پورے مہینہ کی کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ اس لئے بڑی دل جمعی، نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اس کی تیاری ہوتی اور کوشش کی جاتی تھی کہ پورا پروگرام اتنا دلچسپ اور ہم جہت ہو تاکہ سامعین شروع سے آخر تک جلسہ گاہ میں جمع رہیں۔ اس مقصد کیلئے نئے نئے موضوعات پر محادثے اور مکالمے تیار کئے جاتے تھے اور دو ایک تقریروں یا مقالوں کے بعد ایک محادثہ پیش کر دیا جاتا۔ ماہانہ اجتماعات میں مولانا بذات خود شرکت فرماتے بعض دوسرے مدرسین کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر اساتذہ دارالعلوم ہی جلسوں کی صدارت بھی کیا کرتے تھے۔

پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مولانا کے دماغ میں یہ بات آئی کہ جلسہ کی صدارت کسی استاد کے بجائے کسی ذہین طالب علم کو کرنی چاہیے کیونکہ جلسہ کی صدارت کرنا بھی ایک فن ہے اور اس ماحول سے

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”الداغی“ جون ۱۹۹۵ء مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۱۴۔

رخصت ہونے کے بعد ایسے مواقع پیش آ سکتے ہیں کہ کسی جلسے کی صدارت کرنی پڑ جائے اس لئے اس کی مشق بھی ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ نے آئندہ کے لئے حکم صادر فرمایا کہ آج کے بعد جلسہ کی صدارت طالب علم ہی کرے گا اگرچہ یہ فیصلہ دارالعلوم کے ماحول کے لئے سازگار نہیں تھا بلکہ اس میں طلباء کے مفاد کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ بہر حال متعدد طلبہ نے اپنے اساتذہ کی موجودگی میں صدر جلسہ بننے کا شرف حاصل کیا۔ دارالعلوم کے تعلیمی و ثقافتی ماحول پر ”النادی الادبی“ کے ماہانہ اجتماعات کے زبردست اثرات مرتب ہوتے تھے، طلباء زیادہ بہتر انداز میں کام کرنا چاہتے تھے اور کامیابیوں سے حوصلہ پا کر ذمہ دار طلباء نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے اور اجتماعات میں پیش کئے گئے پروگراموں کے معیار اور جلسہ گاہ کے نظم و نسق میں مولانا کے ذہن و فکر کی جھلک ملتی تھی۔ یہ ماہانہ اجتماعات دوسری اصلاحی انجمنوں کے لئے نمونہ اور معیار قرار پاتے۔

### سالانہ اجتماع

یہ پروگرام پورے سال اسی طرح پر چلتے رہتے پھر سال کے آخر میں سالانہ پروگرام کا انعقاد کیا جاتا اس میں پورے سال کی کارکردگی کے مطابق ان ہی طلباء کو شرکت کی اجازت دی جاتی جن کا ریکارڈ اچھا ہوتا یہ اجتماع دارالعلوم کی تعلیمی زندگی کا ایک بے مثال پر جوش اور پر کیف واقعہ ہوا کرتا تھا۔ تقریباً دو ماہ پہلے سے اس اجتماع کی تیاری شروع کر دی جاتی تھی۔ خواہش مند طلباء سالانہ اجتماع میں پروگرام پیش کرنے کیلئے درخواستیں دیتے تھے مگر ترجیح ان طلباء کو دی جاتی جنہوں نے ہفتہ واری اور ماہانہ اجتماعات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو جس کی درخواست منظور ہو جاتی اس کی استعداد و صلاحیت کے مطابق موضوع دیا جاتا۔ اجتماع سے کافی پہلے تمام طلباء کے موضوعات تحریری شکل میں لے لئے جاتے۔ ان پر غور و خوص کیا جاتا بعض طلباء کو دفتر میں بلا کر تقریریں اور محادثے سنے جاتے، جلسہ گاہ کے نظم و نسق کے متعلق تمام جزئیات پر نظر ڈالی جاتی اور ہر کام کے لئے طلباء میں سے ذمہ دار مقرر کئے جاتے۔ یہ زمانہ ”النادی الادبی“ کے اراکین کے لئے مصروفیت کا زمانہ ہوتا، رات بھر دفتر میں کام چلتا رہتا۔ چاروں طرف سے مشقوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا ہر مرحلے میں طلباء کے ساتھ شریک رہتے اپنا قیمتی وقت بھی دیتے اور اپنی جیب بھی ہلکی کرتے ”النادی الادبی“ کے سالانہ اجلاس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں ملک و ملت کی کسی اہم شخصیت کو بطور صدر مدعو کیا جاتا تھا خاص طور سے کسی ایسی شخصیت کو جس کا دارالعلوم دیوبند سے علمی و فکری تعلق بھی ہو۔ (۱)

مولانا کے تخیل کی پرواز جداگانہ تھی نئے بال و پر کی تلاش کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی جدت

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم جدید“ نئی دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۱۳۹۔

طرازیوں سے کسی بھی واقعہ کو یادگار بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھے آپ صدر جلسہ کے استقبال کے لئے ”النادی الادبی“ کے کچھ اراکین میں سے کچھ طلباء کا انتخاب فرماتے اس گروپ کی اپنی الگ شان ہوتی۔ یہ لوگ مہمان خصوصی کے استقبال کے لئے مقرر کیے جاتے اور جب مہمان اپنی قیام گاہ سے جلسہ گاہ کے لئے نکلتے تو پورا دارالعلوم نعروں کی آواز سے گونج اٹھتا اور اس کی شان میں مختلف قسم کے نعرے لگائے جاتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک مہمان محترم اسٹیج پر جلوہ افروز نہ ہو جاتے۔ یہ اجتماع آپ کے حسن انتظام، سلیقہ مندی اور فکر و تدبر کا ایک ایسا مظاہرہ ہوتا جس کی صدائے بازگشت سے کافی دنوں تک دارالعلوم کے درودیوار گونجتے رہتے اس شعبہ کو ”النادی الادبی“ کے شعبہ تقریر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

### شعبہ تحریر

”النادی الادبی“ کا دوسرا بڑا شعبہ ”قسم التحریر“ تھا اس شعبہ کے تحت ”النادی الادبی“ میں شامل طلباء عربی زبان میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کی مشق کرتے تھے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ مضمون نگاری سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کے چند گروپ بنائے جاتے اور ہر گروپ کو ایک دیواری پرچہ نکالنے کا پابند کیا جاتا۔ کچھ پرچہ الصّف الاول، الصّف الثانی کے طلباء اور کچھ تکمیل ادب کے طلباء نکالتے تھے ہر پرچہ کا ایک مدیر ایک نائب مدیر اور کچھ اراکین مجلس ادارت ہوتے، رسالوں کے شائع ہونے کی تاریخ مقرر ہوتی تھی۔ رسالہ شائع ہونے سے قبل مضمون نگار حضرات اپنے اپنے مضامین ایڈیٹر کے سپرد کر دیتے، ایڈیٹر مضامین کی خود اصلاح کرتا یا اپنے سینئر زکو دکھاتا اس کے بعد سفید کاغذ جس کے چاروں طرف پھولوں کی رنگین نیل بنائی جاتی تھی کوئی خوش خط طالب علم مضامین کی کتابت کرتا، کتابت شدہ مضمون کا پرچہ شیٹس کے فریم میں سجا کر دارالعلوم کے صدر گیٹ پر آویزاں کر دیا جاتا ہر پرچہ ہفتہ دس دن دیوار پر معلق رہتا اور جب ناظرین کرام کی توجہ کم ہو جاتی تو اس فریم میں دوسرا پرچہ لگا دیا جاتا اسی طرح ایک ماہ میں چند پرچہ شائع ہو جاتے (۱)

لیکن ”النادی الادبی“ کے طلباء نے ”النادی“ کے نام سے بے پندرہ روزہ عربی پرچہ نکالتے تھے پھر کچھ زمانہ کے بعد ایک جدت پیدا ہوئی کہ طلباء نے مولانا کی رائے مشورہ اور ہمت افزائی سے ”النادی“ کو پندرہ روز کے بجائے روزنامہ بنا دیا اس میں ملکی و غیر ملکی خبریں روزنامہ ”الجمعیۃ“ سے اخذ کرتے اور دارالعلوم کی داخلی خبروں کے لئے دفاتر کے کلرکوں اور چپر اسیوں کے انٹرویو لیتے پھرتے۔ داخلی طور پر زیادہ دلچسپی کا محور اساتذہ کرام کی رخصت ہو کر تھی اور یہ خبر کہ آج صبح کون استاد چھٹی پر ہیں انکو نمایاں طور پر شائع کی جاتی۔ رات کو دیر تک رسالہ تیار کیا جاتا اور کسی ایک شخص کی یہ ذمہ داری ہوتی کہ وہ فجر کی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ الداعی“ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۹۵ء مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۱۵۔

اذان اور نماز کے درمیانی وقفہ میں روزنامہ کو فریم میں لگا کر صدر دروازہ پر چسپاں کر دیتے نماز پڑھ کر لوٹنے والے طلباء اخبار کے سامنے ہجوم لگا لیتے تھے حالانکہ اس وقت روشنی بھی پوری نہیں پھیلتی تھی۔ اس طرح کی سرگرمیوں میں مولانا کی رہنمائی اور نگرانی قدم قدم پر ہوتی یہ آپ کی ہی ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ ”النادی الادبی“ کے اراکین رات رات بھر جاگ کر رسالے نکالتے اس میں مشق کی مشق تھی اور دلچسپی سے بھرپور ایک مشغلہ بھی۔

علاوہ ازیں ”النادی الادبی“ کے شعبہ تحریر و تقریر کے علاوہ ایک شعبہ سماجیات سے متعلق تھا۔ جس میں طلباء کو Social Life کے بارے میں کچھ چیزیں سکھائی جاتی تاکہ مستقبل میں جس ماحول سے بھی واسطہ پڑے اس میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرے اس کیلئے آپ نے دوسرے شعبوں کی بنیاد ڈالی تھی جو النادی کے تحت ہی تھے۔ انھیں میں سے ایک شعبہ مالیات کا تھا جس کے ذریعہ ”النادی الادبی“ کے ماہانہ اور ہنگامی چندے وصول کئے جاتے، چندے بہت معمولی ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مصارف کے لئے مولانا اپنی جیب سے ہی انتظام کرتے دارالعلوم میں چونکہ اس کے لئے فنڈ نہیں تھا اس لئے سوائے لاؤڈ اسپیکر کے دارالعلوم سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔

دوسرا شعبہ جو سماجیات سے ہی متعلق تھا وہ امداد باہمی کے لئے تھا۔ اس شعبہ کے ذریعہ نادار طلبہ کی مالی مدد کی جاتی تھی۔ دارالعلوم میں غیر امدادیات طلباء کی معقول تعداد زیر تعلیم رہتی تھی۔ ان میں کچھ طلباء جو ذی حیثیت گھرانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے کسی وجہ سے دارالعلوم کی امداد سے محروم رہ جاتے وہ خشک روٹی کا انتظام بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے طلباء کا معاملہ مولانا کے لئے اذیت کا سبب بن رہتا، چونکہ ”النادی الادبی“ بھی کوئی خوش حال انجمن نہیں تھی کہ اپنے مصارف کی بھی متکفل ہوتی اور ضرورت مند طلباء کو بھی کھانا مہیا کراتی اس لئے اس کا حل یہ نکالا گیا کہ جو طلباء اپنی روٹیوں سے کچھ بچا دیتے ہیں وہ ضائع نہ کریں بلکہ النادی کے آفس میں جمع کرادیں اور ضرورت مند طلباء یا تو خود وہیں کھالیں یا پھر اپنے کمرہ لے جائیں اس مقصد کے لئے مولانا دار جدید کے مختلف کمروں کا گشت کرتے اور جو روٹی بچی ہوئی حاصل ہوتی اسے النادی کے دفتر میں لا کر رکھ دیتے یہ ایک ایسا اقدام تھا جو شاید کسی کے ذہن میں اس کا تصور آیا ہو لیکن آپ کو اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی توانائی عطا فرمائی تھی کہ اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ (۱)

”النادی الادبی“ کا ایک اور اہم شعبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تھا اس شعبہ کے مقاصد میں یہ بات اہمیت کی حامل تھی کہ طلبہ میں دینی بیداری کیسے پیدا کی جاوے، طلباء کو نماز کے اوقات میں نماز کیلئے تاکید کرنا، خاص طور سے فجر اور ظہر کی نمازوں میں کمروں میں گھوم کر طلباء کو بیدار کرنا۔ یہ ایک اہم

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ ترجمان دارالعلوم جدید“ نئی دہلی خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۱۲۰۔

ذمہ داری تھی۔ فجر کے وقت مولانا خود بھی طلباء کو بیدار کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی فضل و کمال کے ساتھ ساتھ ذاتی وجاہت اور شخصی ہیبت بھی عطا فرمائی تھی اور یہ چیز بہت ہی کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ طلباء عام طور پر کم ہی لوگوں سے اتنا متاثر ہوتے ہیں جس حد تک وہ مولانا سے متاثر تھے ان کی ایک آواز پریاقتہ مولوں کی آہٹ پر طلباء اپنے بستروں سے الگ ہو جاتے۔

امداد باہمی اور ”النادی الادبی“ کی ضروریات پورا کرنے کیلئے کچھ صندوق بھی آویزاں کئے گئے تھے جن کو صندوق النادی کا نام دیا گیا۔ صندوق میں طلبہ وہ رقم جمع کیا کرتے تھے جو النادی کے پروگراموں پر خرچ کی جاتی تھی اور اسکے مقاصد کو آگے بڑھانے میں استعمال ہوتی تھی۔

### صندوق الاستقراض :

اس سے ضرورت مند طلبہ کو ایک معین وقت کے لئے قرضہ دیا جاتا اس طرح اس کے ذریعہ سے دوسرے کے کام آنے کے جذبہ کو فروغ دینا تھا۔

### صندوق المساعدة :

یہ النادی کا وہ فنڈ تھا جس سے مستحق طلبہ کی مدد کی جاتی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں ایسے تعاون خیر خواہی اور انسانیت نوازی جیسی صفات پیدا ہو جائیں۔

### صندوق التوفیر

بچت فنڈ اس کے ذریعہ طلباء کفایت شعاری کے اصول سکھائے جاتے اس سے طلباء اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بچا کر اس میں جمع کیا کرتے تھے۔ اس کے ذریعہ طلباء کو یہ سکھانا مقصد تھا کہ اصراف بیجا شرعاً ممنوع اور مذموم ہے۔ اپنا سرمایہ خرچ کر کے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اسلامی اصولوں کے منافی ہے اس لئے اپنے مصارف پر کنٹرول کر کے کچھ جمع کرنے کی عادت ڈالنا چاہئے آنے والی پریشانیوں کا علاج ہے (۱) خلاصہ یہ کہ ”النادی الادبی“ ایک انجمن ہی نہیں تھی بلکہ اپنے آپ میں مکمل ادارہ تھی ایک تربیت گاہ تھی جس نے دارالعلوم کے طلباء میں عربی زبان کا شوق اور اسے ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے سیکھنے کا جذبہ بیدار کیا۔ ان میں اجتماعیت کا شعور اور اس کی طاقت کا احساس بخشا۔ ان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت راسخ کی گئی کہ وہ بیکار نہیں ہیں بلکہ امت مسلمہ کیلئے ان کی حیثیت شہ رگ کی سی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ”النادی“ بے جان تھی اسکی روح مولانا تھے ایک دور مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ کا تھا جنہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ وہ کس طرح قطروں کو گہر بنائیں اور کس شخص سے کیا کام لیں کہ وہ آسمانِ علم پر آفتاب بن کر چمکے۔ ایک شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تھی جن کی تربیت نے

-۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ الداعی“ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۹۵ء ص ۱۵۔

ایسا جادو جگایا اور ایسے شاگرد پیدا کئے جو آج دارالعلوم کی آبرو ہیں۔ ایک شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی جنہوں نے چھوٹے سے قصبہ کی مسجد کو رجاں علم و عمل اور اصحاب فضل و کمال کے سانچے میں ڈھالنے کا کارخانہ تیار کیا ہے ان چند عظیم شخصیتوں کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں اگر کسی نے رجاں سازی کے میدان میں کوئی نیا کارنامہ انجام دیا ہے وہ مولانا وحید الزماں کی شخصیت ہے۔ انہوں نے اپنے طلباء کو اپنے مادی نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر اپنے مفوضہ فرائض سے الگ ہٹ کر اور بہت کچھ سکھانے کی کوشش کی۔ پھر ان کی جدوجہد کے نتائج برآمد ہوئے آج دارالعلوم کے بیٹھار فضلاء جہاں بھی ہیں جس جگہ بھی علم و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ سب مولانا کی تیس سالہ سعی پیہم کی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور ان کے خوابوں کی صحیح تعبیر ہے۔

”النادی الادبی“ آپ کی ایک ایسی تخلیق ہے جس کو انہوں نے اپنے خون و جگر سے پروان چڑھایا اپنوں اور غیروں کی سرد گرم نگاہوں سے اس کے نرم و نازک وجود کو بچایا۔ مخالفتوں کی تیز و تند آندھیوں سے اس پودے کے گلاب بکھرنے نہیں دیئے اگر کوئی مؤرخ دارالعلوم کی تاریخ لکھے گا تو وہ ”النادی الادبی“ کے حوالے سے مولانا کی طویل جدوجہد اور بے مثال خدمات کو دارالعلوم کی تاریخ کا سنہرا عنوان قرار دیگا۔

## صحافتی خدمات

صحافت اور صحافی کے الفاظ یوں تو عربی زبان کے لفظ صحیفہ سے نکلے ہیں لیکن ہم لوگوں کے یہاں۔ انگریزی کے الفاظ Journalism-Journalist کے ترجمہ کے طور پر ہی رائج ہوتے ہیں۔ صحافت قومی سطح پر یکجہتی اور استحکام پیدا کرتی ہے۔ قومی سوچ کا رخ متعین کرتی ہے قوم میں خود اعتمادی اور حوصلہ مندی نیز تحقیق و تحسین کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ سیاسی و ملی شعور کو بیدار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ عوام کو کسی اعلیٰ مقصد کیلئے تیار کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ نیز بین الاقوامی سطح پر قوموں کے درمیان رابطہ، ابلاغ، اور معاملہ فہمی کے ساتھ ساتھ اعصابی اور نفسیاتی جنگ اور تہذیبی یلغار کا بہترین حربہ ہے اس کے ذریعہ نیکی کی تبلیغ بھی کی جاسکتی ہے اور غلط خدا کو بہکانے اور پھسلانے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔

بہر حال صحافت انسانی زندگی کا ایک اہم جز ہے جس سے قوموں کے مزاج اور تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں بالخصوص اس ترقی یافتہ دور میں صحافت کا ایک بہت بڑا رول ہے۔ قوموں کے عروج و زوال اور انقلابات برپا کرنے میں اس کا ایک بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اگرچہ اس میدان میں مغربی ممالک نے بہت ترقی کی یہاں تک کہ پوری دنیا پر مغربی صحافت چھا گئی لیکن اسی کے ساتھ عربی صحافت نے بھی اس میں ترقی کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔ اس ضمن میں مصر کی صحافت نے بڑا مؤثر رول ادا کیا، جدید دور میں عربی صحافت نے عربوں کی کایا ہی پلٹ دی ان کے افکار و خیالات، ان کی تہذیب و تمدن ان کی تعلیم و میں

یہاں تک کہ ان کے سیاسی نظام کو ہلا کر رکھ دیا رفتہ رفتہ ہندوستان میں بھی علماء اور عربی داں حضرات نے اس کی طرف قدم بڑھایا (۱)

اگرچہ یہاں عربی صحافت میں وہ زور و آہنگ پیدا نہیں ہو سکا جو جدید دور کی عربی صحافت میں پایا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے صحافیوں اور ادیبوں کیلئے عربی زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے لیکن بہر حال عربوں کے اختلاط اور ان کے تعاون سے ہندوستانی عربی صحافت نے بھی عربوں کے درمیان ایک قابل قدر مقام حاصل کر لیا اور عربی کے اس ذوق و شوق کی وجہ سے ہندوستان میں بھی متعدد عربی رسائل و مجلات منظر عام پر آئے ان میں چند قابل ذکر درج ذیل ہیں :

الضیاء، البعث الاسلامی، صوت الامة، المجمع العلمی الہندی، ثقافت

الہند، الدعوة، الرائد، الداعی، الکفاح، دعوة الحق، الرشاد وغیرہ ہیں۔

مذکورہ بالا جرائد و رسائل میں سے بعض نے عربوں کے درمیان اپنا لوہا بھی منوایا گو کہ ان میں سے بعض زیادہ مدت تک اپنی ضیاء پاشیوں کو بکھیر نہ سکے اور بند ہو گئے لیکن بیشتر اب بھی جاری ہیں جو یقیناً ملک و بیرون ملک کو جوڑے رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

انہیں مجلات و اخبارات میں ایک ”دعوة الحق“ اور دوسرا ”الکفاح“ تھا اول الذکر دارالعلوم کا پاسان و نقیب اور دوسرا جمعیۃ علماء ہند اور ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ و ترجمان تھا ان دونوں کی ادارات کے ذمہ دار مولانا وحید الزماں ہی تھے۔ اور ایک طرح سے آپ ان کے بانی بھی تھے۔ آپ سے قبل دارالعلوم دیوبند جس کو اسلامی علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کی عظیم خدمات کی وجہ سے ازہر ہند کہا جاتا ہے۔ اس کا جدید عربی صحافت کی نشر و اشاعت میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں تھا لیکن مولانا وحید الزماں صاحب کو احاطہ دارالعلوم میں باریابی کا موقع ملا تو پہلے ہی مرحلہ میں آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید عربی صحافت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ آپ نے جدید عربی ادب و صحافت کی ترویج کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا۔ اس کی شروعات آپ نے طالب علمی کے زمانہ سے ہی کر دی تھی۔ چنانچہ آپ نے ”سلسلة الدروس العربیة“ کے نام سے ایک دیواری پرچہ نکالا جس میں جدید رائج الوقت عربی زبان کی مشق کے علاوہ کوئی لطیفہ یا نصیحت عربی زبان میں لکھ کر دارالعلوم کے کسی شارع عام پر آویزاں کر دیتے تاکہ دوسرے طلباء کی دلچسپی کا باعث بنے۔ (۲)

آہستہ آہستہ طلباء کے اندر رجحان پیدا ہونے لگا اور آپ کی یہ ترکیب کار گر ثابت ہونے لگی اب باقاعدہ آپ نے طلباء کی اس طرف رہنمائی شروع کر دی اور جن طلباء کے اندر معمولی صلاحیت بھی ہوتی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”اسلامی صحافت“ عبید السلام زبئی ص ۲۶۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ثقافت الہند“ ج ۳۸ شمارہ ۱-۴ ۱۹۸۸ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۹۶۔



اس کی حوصلہ افزائی کر کے اسے کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کر دیتے۔

مولانا ادب کی راہ سے صحافت میں آئے اور ان کی صحافت پر ہمیشہ ادبی رنگ غالب رہا۔ اگرچہ صحافت میں بھی ان کا کوئی استاد نہیں تھا وہ خود ہی معلم تھے۔ جس طرح عربی ادب میں انھوں نے باقاعدہ کسی نصاب یا کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی اسی طرح صحافت و ادارت میں مولانا نے کسی سے تربیت نہیں لی۔ اس زمانہ میں Journalism کا کوئی باقاعدہ مرتبہ کورس نہیں تھا مولانا کی اپنی خداداد صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت ان کی معلم اور رہنما تھی ان کو ایڈٹ کرنے کا گراپہ آپ ہی وضع کیا۔ آپ کے سامنے اگر کوئی نمونہ تھا تو مصر اور ترکی کے عربی اخبارات اور رسائل تھے جو مولانا کے پاس بلا انقطاع آتے تھے مضامین کے انتخاب، موضوعات کے تعین، دیگر مسائل و مباحث کے انتخاب حتیٰ کہ الفاظ و اصطلاح کی ترجیحات پر بھی مولانا کی نظر اور گرفت رہتی تھی۔

مولانا صحافت کا تجربہ اور اس کی فنی نزاکتوں سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ وہ دو سال تک ماہنامہ ”القاسم“ اردو کو ایڈٹ کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے عالم اسلام کی صحافت اور اس کے طرز و معیار کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے اپنے صحافتی تجربات اور واقفیت سے عربی صحافت پر بھی خصوصی توجہ کی مولانا کی صحافت خشک اور سپاٹ نہیں تھی اس میں ادب اپنی تمام تر عنائی اور جلوہ گری کے ساتھ موجود رہتا، مولانا کی صحافت کو ادب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کے حسین امتزاج سے ہی مولانا کی وہ نثر بنتی ہے جس پر اہل عرب بھی عیش عیش کرتے تھے۔

آپ کی صحافت عہد حاضر کی اصطلاح اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ صحافت کے طرز و آہنگ میں علمی و قاری ادبی پاکیزگی اسلوبی متانت اور وسیع امکانات پیدا کرنا مولانا کی اولیات میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ یقیناً یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں عربی صحافت اپنے شباب کی منزلیں طے کر رہی ہے اس میدان میں بہت سے کہنہ مشق، اپنی مہارت و مقبولیت کا ثبوت دے چکے اور دے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں مولانا کی انفرادیت اور ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صحافت کے مروجہ تصور اور معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ اس کی سرحدیں تخلیقی ادب اور علمی تصنیف سے مل گئی جیسا کہ ان کے مضامین اور اداریوں سے واضح ہوتا ہے۔

مولانا نے کئی سال تک ”دعوة الحق“، الکفاح اور مجلہ القاسم کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور ”الداعی“ کے مدیر مسئول بھی رہے۔ آپ نے ان اخبار و رسائل کو ایک امتیازی شان بخشی اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب دنیا میں بھی اپنی ایک الگ پہچان بنائی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو صحافت نہیں بلکہ ماورائے صحافت کی کسی اور چیز سے تعبیر کرنا ہو گا۔ (۱)

## دعوة الحق

مولانا وحید الزماں کے دارالعلوم میں باقاعدہ مدرس ہونے کے بعد جدید عربی سیکھنے اور اسکے استعمال کا ذوق عام ہو چکا تھا۔ اب رفتہ رفتہ ایک عربی رسالہ کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں شوری کے مشورہ کے مطابق ”دعوة الحق“ کا اجراء عمل میں آیا جس کے فیض سے اہل دارالعلوم نہیں بلکہ باہر کے لوگ بھی مستفیض ہوئے اور عربی داں طبقہ میں دارالعلوم کے وقار کو بلند کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

یہ رسالہ دارالعلوم دیوبند کے علمی و مذہبی افکار کا ترجمان تھا۔ یہ ایک علمی و مذہبی رسالہ تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ تین چوتھائی مذہبی اور ایک چوتھائی علمی و ادبی تھا اس لئے کہ جو مضامین مذہبی و علمی ہوتے تھے ان میں بھی تاریخی فلسفہ اور تمدنی غرض کی کوئی نہ کوئی علمی رنگ لئے ہوتی تھی۔ مولانا وحید الزماں کا معیار عصری تقاضوں کو دیکھتے ہوئے نہایت بلند تھا اس لئے ”دعوة الحق“ میں اس کو جگہ دیتے اور اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس رسالہ میں علمی، دینی، تاریخی اور دیگر مسائل پر تحقیقی مقالات ہو کرتے تھے۔ ”نفحات السنۃ، من توجیہ القرآن“ اور ”التحریر“ کے عنوان سے عالم اسلام کے حالات پر تبصرہ خود ایڈیٹر کے قلم سے ہوتا تھا، آپ خود رسالے کو ترتیب دیتے، مضامین کی نوک پلک درست کرتے، لوگوں سے مضامین طلب کرتے، اپنے اسلاف کی تحریروں کو معرب کرا کے ان کو شائع کراتے گویا کہ ”دعوة الحق“ کا پورا بار آپ ہی کے کندھوں پر تھا لیکن اس کے باوجود یہ رسالہ ایک مدت تک چلتا رہا تا آنکہ اہل دارالعلوم نے اسے خود بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”دعوة الحق“ کو مثالی رسالہ بنانے کے لئے مولانا نے بیسیوں عربی رسالے مصر و شام وغیرہ سے منگوائے، ملک کے مشاہیر اہل قلم سے تعاون کی درخواست کی اور ان سے بلند پایہ مقالہ لکھوائے، مضامین کے انتخاب میں ذوق صحیح سے کام لیا، ان میں مناسب ترمیم و اصلاح اور فکر و فن میں بھی اضافہ کیا۔

”دعوة الحق“ کو خوب سے خوب تر بنانے اور عصری صحافت میں اس کو صف اول میں جگہ دلانے کے لئے مولانا نے اپنے تمام علمی و صحافتی صلاحیتوں کو صرف کر دیا۔ جب ۱۹۶۴ء میں اس کا اجراء ہوا ہے اس وقت سے کئی سال تک مسلسل اس رسالہ کا تمام بار تنہا اپنے دوش نا تواں پر اٹھائے رہے، ہر نمبر کے لئے ایک دو مستقل مضامین اور کئی کئی صفحات کے ادارہ لکھنا، تفسیر و علم حدیث پر ہر رسالہ میں مضمون تیار کرنا، نئی کتابوں پر تبصرہ، دارالعلوم کی خبریں، علاوہ ازیں علماء و شہرت یافتہ لوگوں کی وفیات لکھنا یہ سب مولانا ہی کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ شاید ہی کوئی رسالہ ملے جن میں مولانا کی کوئی تحریر موجود نہ ہو۔ مضامین کے موضوعات کا دائرہ بھی محدود نہ تھا بلکہ زمانہ کی ضرورت کے مطابق نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھاتے، اور اپنی

خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے، اس کے علاوہ مستقل تصنیف و تالیف جابجا درس اور ”النادی الادبی“ کے صدر کی حیثیت سے پورے دارالعلوم کی انجمنوں کا کام مستزاد تھا۔

”دعوة الحق“ کے اجراء کے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ اس کا مقصد طلبہ دارالعلوم دیوبند کی

صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے اندر مقالہ نگاری کا رجحان اور سلیقہ تحریر و تصنیف پیدا کرنا تھا۔ (۱)

”دعوة الحق“ نے دارالعلوم دیوبند کے مقاصد کی حسب خواہ تبلیغ و اشاعت کی، ہندوستان میں عربی تعلیم کی اہمیت سے مسلمانوں کو ذہن نشین کرائی اور مسلمانوں کی فکر و نظر پر غیر معمولی اثر ڈالا، پھر ان سب سے بڑھ کر اس رسالہ نے علمی حیثیت سے بہت قابل قدر اور اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول منقول اور قدیم و جدید کے موازنہ میں بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے۔ ”دعوة الحق“ نے اندرون ملک اور عرب دنیا میں جو علمی نتائج پیدا کئے وہ ذیل میں درج ہیں :

(۱) عربی زبان میں علمی مباحث کا ایک ذخیرہ پیدا کر دیا۔

(۲) جدید عربی ادب کی طرف اہل علم کی توجہ دلائی۔

(۳) علماء کو جدید مسائل، حدیث اور تفسیر کے نئے انداز سے روشناس کرایا۔

(۴) اسلام اور تاریخ اسلام کو ایک نئے انداز سے پیش کیا اور بہت سے اعتراضات کو دفع کیا۔

(۵) عربوں کے مابین اتحاد و اتفاق کی انتہائی کوشش کی۔

(۶) یہود اور استعماریت کی ناپاک سازشوں کو بے نقاب کیا۔

”دعوة الحق“ میں کبھی کوئی اشتہار شائع نہیں ہوا۔ اس خصوصیت میں بعض اور رسالے بھی ”دعوة الحق“ کے سہیم ہیں، اس میں نئی مطبوعات کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن اس کی حیثیت مردوجہ اشتہار کی نہیں بلکہ آخر میں نئی کتابوں کے لئے آپ نے رسالے کے کچھ صفحات مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ”دعوة الحق“ کا ایک اہم امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دارالعلوم کے علمی و تصنیفی جود کو توڑا اور خالص علمی و تحقیقی موضوعات پر سنجیدہ تحریریں لکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار کر دی۔ مثال کے طور پر مولانا ابو بکر غازی پوری، مولوی بدر عالم، سعید احمد اکبر آبادی، مولانا ابو العاص وحیدی، واصف حسین، ندیم الواجدی، مولانا محمد سالم قاسمی، قاضی اظہر مبارک پوری۔ جو مقالہ نگاری کے مطلع شہرت پر خوب چمکے وہ دراصل دعوة الحق کے ہی مرہون منت ہیں۔

دعوة الحق کی ضخامت شروع میں تقریباً ۶۰ صفحات تھی لیکن بعد میں اس کی مقبولیت کے پیش نظر تقریباً اسی صفحات تک پہنچ گئی یعنی شروع سے آخر تک اس کی ضخامت یکساں نہیں رہی لیکن سالانہ قیمت مع

محصول ڈاک ۱۰ روپیہ ہی رہی اس کے پبلشر مولانا وحید الزماں اور پرنٹر مطبع کوثر سرائے میر اعظم گڑھ نامی پریس سے طبع ہو کر دارالعلوم سے شائع ہوا کرتا تھا۔ علمی مقالات کے علاوہ دو صفحے دارالعلوم کے احوال و کوائف اور ایک صفحہ ”النادی الادبی“ کی سرگرمیوں کی تفصیل کے لئے ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مطبوعات جدیدہ کے عنوان سے نئی کتابوں پر تبصرہ بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں خاص لوگوں کی وفیات اور تعزیت کے لئے اکثر ایک مضمون لکھا جاتا تھا۔

مولانا کے تمام مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شدید مذہبی پابندی کے ساتھ ایک وسیع النظر اور روشن خیال انسان تھے آپ کا پرانی مذہبی چیزوں کو اقتضاء عصر کے مطابق جدید رنگ میں پیش کرنا دراصل حالات اور زمانہ کے تاثرات کی وجہ سے تھا لیکن اس میں آپ کی حیدر آبادی زندگی کو بڑا دخل تھا۔ جس نے قدیم صالح اور جدید نافع میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا گر سکھایا چنانچہ ایک طرف تو آپ ایسے عالم دین تھے جسے اپنی قدیم روایات سے گہرا لگاؤ تھا اور دوسری طرف ایک بالغ نظر ادیب اور محقق بھی تھے جو زمانہ کے حالات اور فتنہ کا پورا شعور رکھتا ہو۔ انہیں قدیم علوم میں گہرائی اور بصیرت کے ساتھ جدید علوم سے واقفیت اور جدید طرز پر کسی چیز کو پیش کرنے کا سلیقہ حاصل تھا ان کی تحریروں میں علمی متانت اور سنجیدگی تھی ان کا اسلوب مؤثر اور بلیغ تھا۔ قدیم و جدید کا کون سا مسئلہ ہے جس پر ”دعوة الحق“ میں مضامین شائع نہ ہوئے ہوں خود مولانا وحید الزماں نے جو بیش قیمت مضامین اس میں لکھے ہیں۔ ان کی ضخامت سیکڑوں صفحات ہوگی، آپ نے اہل عرب کو بیدار کرنے اور مغرب کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے بعض بے حد گر انقدر مقالے ”دعوة الحق“ میں سپرد قلم کئے۔ مثلاً یہود کی اسلام سے دشمنی کے سلسلے میں لکھتے ہیں اور اس میں حضورؐ کے زمانہ سے لے کر یہود کی موجودہ وقت تک کی تمام خرافات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ یہود ہمیشہ سے اسلام کے دشمن رہے ہیں :

”ان اعداء اليهود الاسلام و المسلمين ليس بحديث العهد بل انه متأصل بعيد المدى ولقد اخطب الله عن ذلك اذ قرأهم بالمشرکین فی آیه“  
واحدة لشدة عداوتهم للمسلمين وحقدهم عليهم، قال تعالى لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا۔ غاظ اليهود ماصورة القرآن من اخلاقهم واشتد هم خصامهم للاسلام، فالتجؤا الى ايداء النبی صلی الله علیه وسلم بكل ما مكنهم من الوسائل، ودبروا المؤامرات و والخطط الشیطانیته للاضرار به وبالمسلمين وكان ذلك جزاء منهم على المعاهدة العادلت التي انما ابرموا ليخدعوا المسلمين و يخفونوا ياهم الباطلة ويد بروافى السرمایفسدون به امرهم، وهل

كان من الممكن ان يخلص اليهود لتلك المعاهدة وهم لم ينسوا انهم  
يهود، واولئك عرب قد صاروا الى دين جديد ينهض بهم ويضيع على اليهود  
ماكانوا يربحونه من غفلتهم ويخلصهم من برائتهم الاقتصادية الاستغلالية و  
احابدهم الربوية التي تكدست بها لهم الاموال وكيف كان يمكنهم ان  
يخضعوا لهذه السياسة العادلة التي ازال الفوارق الجنسية وساوت بين اناس  
واناس، وهم لا يعرفون الاجنسهم ودينهم وما عداها لاقية له عندهم (۱)۔

اس وقت یہود نے فلسطین پر حملہ کیا ہی تھا اور تقریباً پورے فلسطین کو امریکہ کی حمایت سے اپنے قبضہ میں  
لے لیا تھا اور دیگر عرب ممالک کو دھمکی دینی شروع کر دی تھی چونکہ خود عربوں میں آپس میں بہت زیادہ انتشار و  
اختلاف تھا، یہود برابر عربوں پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ انگریز کھل کر ان کی حمایت کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں  
اسرائیل بلکہ سوشلزم کے حملے کے مقابلے میں اسلام کی حمایت اور دفاع کتنی اہمیت کی حامل تھی، بہر حال مولانا  
اسرائیل اور یہود کے خلاف اکثر لکھا کرتے تھے اور اپنے مضامین میں عربوں کو بیدار کرنے اور آپس میں اتحاد و اتفاق  
پیدا کرنے کے لئے زور دیتے، اتحاد و اتفاق کے فوائد بیان کرتے کبھی یہود کی مکرو فریبی اور دھوکہ بازی کا رونا روتے۔  
مولانا نے ”دعوة الحق“ کے ادارتی صفحہ کا مستقل عنوان ”التحریر“ رکھا تھا۔ اسکے تحت ہر ماہ مدیر کے قلم  
سے مختلف النوع و وقتی امور و مسائل پر تبصرہ ہوتا۔ ”دعوة الحق“ کے ”التحریر“ میں مولانا وحید الزماں کی تحریریں  
خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

ایک عرب نے ”التحریر“ کی ان خصوصیات کا عمدہ تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں :

”مولانا وحید الزماں صاحب“ کے عنوان ”التحریر“ بھی نہایت اہم ہوتے تھے۔ عموماً  
مختلف النوع، وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر ”التحریر“ میں اظہار خیال کرتے  
تھے اس لئے ان کی ”التحریر“ مباحث و مسائل کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت  
رکھتے ہیں اور ان سے ان کے دور کی قومی و ملی تحریکوں میں مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے  
پیش آمدہ حالات کی تاریخ مقرر کی جاسکتی ہے اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے  
جاسکتے ہیں۔ آپ کی ”التحریر“ غور و فکر خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ، ایجاز و  
اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کے شاہکار ہیں“ (۲)

مولانا نے ”التحریر“ میں ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ عنوان  
جو مسلمانوں کی مذہبی و ملی زندگی کے اجزاء و عناصر پر لکھے گئے ہیں ان میں ان کی ترقی و انحطاط اور بقاء و استحکام کا

۱- ”دعوة الحق“ ج ۳، شمارہ ۳، اگست ۱۹۶۶ء ص ۷۔

۲- مولانا مزمل الحق الحسینی (تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند) بالمشافہ۔

پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضامین صرف عارضی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی مستقل اہمیت ہے جن سے ہر زمانہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب و انشاء کے طالب علم اور صحافت و سیاست کے نوواردان مضامین سے حسن بیان متانت تحریر اور اصابت رائے کا سبق لیں، ذیل میں مولانا کے ادارہ ”التحریر“ کی چند جھلکیاں بطور نمونہ از خردارے پیش کی جاتی ہے۔ علماء کو انکی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں :

”قد آن الوقت و تحتّم على العلماء ان يتركوا الدعة والحياة المريحة المنعزلة عن الشعب و ابناء الوطن ، ويتخلوا عن المناصب المصطنعة والمظاهر الرسمية ويعودوا الى منصبهم الجليل الذى شرفهم الله به عن فضله ، فلا يصرفوا وقتهم الثمين و طاقاتهم فى تائيد حكومة و قائد و ذم حكومة أخرى وقائد أخرى ، ولا يمنعونهم عن الجهر بالحق ملك ولا رئيس امير ولا سلطان كما لا يحثهم على المعارة و المناهضة الاصرار على الرأى والتعصب للفكرة والانتقام للنفسى فان كل ذلك يحول دون طريقتهم و يعرقل نشاطهم و دعوتهم و اعمالهم النبائية وانما مهمتهم هو السيرو المضى فى الدعوة والاصلاح وبناء الجيل المسلم و النشى الحاضر بناء مستقيماً على أسس من الايمان والغيرة الاسلامية فانه يكاد ينخرط من سلك الاسلام ، ويكاد يتلاشى فى غمار من النظم و الافكار والفلسفيات السقيمة المادية“ (۱)

ایک اور ادارہ میں مولانا مسلمانوں کی کاہلی سستی اور بے عمل زندگی کو جھنجھوڑتے ہیں جس میں شکوہ شکایت تو زیادہ ہے البتہ عمل نام کی کوئی چیز نہیں ہے انکے فکر و خیال میں کوئی معجزہ رونما ہو جائے اور ان کی حالت خود بخود سدھر جائے، مسلمانوں پر ظلم کا رونا روتے ہیں لیکن خود میں اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا نہیں کرتے اسی کو آپ اس طرح تحریر فرماتے ہیں :

”ان حالة المسلمين فى شبه القارة الهندية خاصة تشكل خير مثال لهذا القول و تصدقه ، فان هناك احزابا ذات اسماء رنانة و هتافات تحرق عنان السماء و اجتماعات احتجاجية و صحفاً مجلات موالية للاحزاب والجميعات تملأ صفحاتها بالمقالات الحادة للاذعة كانهاتكاد تحقق الهدف لمن تواليه وتعاضده و توذى بالامة الى الغاية الكبرى والحياة المثلى المطمئنة الهادية لاشك ان هذا نشاطاً و سمة نشاطاً ثورياً اذا شئت او اطلق عليه اسماً افخم من

ذلك و لكنه هروب في الحقيقة من العمل الجاد والكفاح المستميت في سبيل  
بناء الحياة ديناً وفكراً علماً وثقافة، صناعةً و تجارةً حضارةً وسياسةً فترى  
صاحب هذا النشاط و قائد هذه الحركة صارخاً بملء فمه على منصة الخطابة  
ينفث كلمات كأنها جمرات مهب و يثرثر طويلاً تحسبه رجلاً مقدماً، صاحب  
عزيمة ورجل عملی، واذابه في بيته جثة هامدة، لا يعتنى بتعليم ابناءه ولا  
يقدم بترتيبهم على ماتقتضيه الظروف و يحتمه عليه الدين، ولا يصرف  
طاقاته وامكانياته في اعداد هم خير اعداد حتى يكونوا اعداء صالحة للامة  
جمعاء و اداة بناء في جهازها. (۱)

مولانا ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مدبر عالم بھی تھے انہیں مسلم مسائل سے گہری دلچسپی تھی  
وہ اس بات سے واقف تھے کہ علم کا کاروبار اور سیاست کا پیشہ دو متخالف چیزیں ہیں دونوں کو ساتھ لے کر چلنا  
محال کی حد تک دشوار ہے۔ وہ سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ لیکن جمعیت علماء کے فعال ممبر ہونے کی  
وجہ سے ملک اور عالم اسلام کے مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ پھر صحافت بغیر سیاسی شعور کے لغو اور بیکار  
ہے یہی سبب ہے کہ سیاسی شعور نے ان کے علمی کاموں میں حائل ہونے کے بجائے ان کے اندر ایک پختگی  
پیدا کر دی۔ چنانچہ آپ ایک بیدار ذہن کے ساتھ درد مند دل بھی رکھتے تھے اس لئے دنیا کے کسی بھی حصہ  
میں جب مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی تو وہ بے چین و مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر اپنے ادارہ میں  
کہیں وہ مسلمانوں کی غفلت پر گریہ کناں ہیں کبھی علماء کی کج روی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں کبھی عظمت رفتہ کو  
یاد کرتے ہیں اور کبھی ان کی ذہنی پسماندگی پر متنبہ کرتے ہیں اور ایک ضرب کلمی لگا کر ان میں خود شناسی اور  
خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں کبھی لسانی تعصب و تنگ نظری پر حکومت وقت کے سامنے سینہ سپر نظر آتے  
ہیں اور کبھی کسی عزیز دوست، ہمد، دیرینہ بزرگ یا ملت کے رہنما کی موت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں  
چنانچہ جمال عبدالناصر کی وفات پر بطور تعزیت لکھتے ہیں :

” في الثامن والعشرين من ستمبر الماضي الموافق السابع والعشرين  
من رجب وجئى العالم والامة العربية خاصة بوفاة القائد المغوار والزعيم  
المقدام المغفور له الرئيس جمال عبدالناصر رئيس جمهورية العربية المتحدة  
اثر نوبة قلبية حادة اصيب بها بعد انتهائه آخر مراسم مؤتمر القمة العربى  
الطارى للملوك ورؤساء الدول العربية الذى انعقد فى القاهرة.

كانت وفاته كارثة الیمة تفجعت لها قلوب العرب والمسلمین وبكت  
 علیه عشرات ملائین من العیون وذرفت دموعاً من الدماء علی الفقید العظیم  
 الذی كان وحید عصره فی قیادة قافلة الحربیة وفرد دهره فی مقاومة  
 الاستعمار الذی شاء وحاول مهده فی كل زمان ومكان ان یقضی علی شخصیة  
 المسلم و شوكة الاسلام ویفت فی عضده وینخر جسمه متظاهراً بالوان من  
 الود والصدقة“ (۱)

چونکہ دعوت الحق بنیادی طور پر ایک علمی و تحقیقی رسالہ تھا اس لئے بیشتر اسلامی اور مشرقی موضوعات  
 پر مستند اور معیاری مضامین شائع ہوتے تھے لیکن تنوع قائم رکھنے کی غرض سے تنقیدی و ادبی مقالات بھی  
 کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ اس میں مختلف علمی موضوعات پر مشاہیر اہل قلم کے بلند پایہ مقالات شائع  
 ہوئے ہیں، ذیل کی فہرست سے اس کے تنوع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

العلاقة بین الشر و الخیر	حبیب الرحمان عثمانی	اگست ۱۹۶۷ء
صدمة علاجیة	شیخ عبدالحلیم النمر صاحب	"
كلمة حق عند سلطان جائر	شیخ حسین احمد مدنی تعریب اظہار الحق صاحب	"
من المسیحیة الی الاسلام	ابوبکر غازی پوری	"
لیست المسؤلیة علی العرب و حد هم	مولانا قاری محمد طیب صاحب	نومبر ۱۹۶۸ء
العقوبات الشرعیة	ڈاکٹر محمد تقی امینی	"
القبلة ماہی	شیخ محمد یوسف بنوری	"
الکمال العلمی من مزايا الرسول	مولانا محمد قاسم نانوتوی	"
التفکیر العمرانی فی القرآن	شمس تبریز خاں الآروی	نومبر ۱۹۶۷ء
جزاء الهم بالسئیة او الحسنة	مولانا شبیر احمد عثمانی	فروری ۱۹۶۸ء
بحث حول تعیین سمت القبلة	شیخ یوسف بنوری	"
النظام الاجتماعی فی الاسلام	ڈاکٹر مصطفیٰ صادق الرافعی	اگست ۱۹۶۸ء
الانسان و الانسانیة فی مراحل التطور	مولانا محمد میاں	"
الحرية فی الاسلام	ڈاکٹر مصطفیٰ صادق الرافعی	نومبر ۱۹۶۸ء
الابادة الجماعیة للمسلمین فی موریشوس	مولانا انعام الحق قاسمی	"



فروری ۱۹۶۹ء	ابو بکر غازی پوری	هل الدين حائل في سبيلی التقدم
مئی ۱۹۶۹ء	شیخ محمد صالح القعیطی	مناهج الاستدلال على مبدع الكائنات
	ڈاکٹر سید عبداللہ ابن عبدالقادر الفقیہ العلوی	الہجرة والعام الجديد
	ڈاکٹر از نجانی	بفضلک تنطق الافلاک
اگست ۱۹۶۹ء	شیخ عبدالمعتال الصعیدی	الدولة الاسلامیة فی عهد النبوة
	قاضی اطہر مبارک پوری	اشراقۃ الاسلام على الهند
نومبر ۱۹۶۹ء	شیخ زکی الدین شعبان	الایمان واثره فی سلوك الانسان
فروری ۱۹۷۰ء	عبداللہ بن عبدالقادر	القضية الفلسطينية
مئی ۱۹۷۰ء	شیخ سعید احمد اکبر آبادی	الشيخ الطوسی و منهجه فی تفسیر القرآن
اگست ۱۹۷۰ء	مولانا وحید الدین خان	القرآن والاكتشافات الطبعية فی العصر الحديث
نومبر ۱۹۷۰ء	ڈاکٹر قاضی زین العابدین	مشروعية الجهاد فی الاسلام
	شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر المملکی	اثر الاسلام على ارتقاء الحياة العربية
	حکیم محمد کامل بحر العلومی	الحياة الاجتماعية فی الاسلام
فروری ۱۹۷۱ء	شیخ مستشار علی علی منصور	التحکیم فی الاسلام
	صالح بن غالب القعیطی	نظريات المادیين فی الكون و نظامه
نومبر ۱۹۷۱ء	شیخ بہی الخولی	آفاق تكوين الانسان
	شیخ ابوالوفا مصطفی المراءغی	ادب الزيارة والضيافة فی الاسلام
	مصطفی لطفی المنفلوطی	من الحجاب الى السفور
فروری ۱۹۷۳ء	الاستاذ بہی الخولی	الانسان والروح
	الاستاذ ابوالوفاء مصطفی الرفاعی	الاستئذان لدخول البيت
مئی ۱۹۷۳ء	خالد الشواف	انما العزة فی وحدتنا
	شیخ محمد غزالی	ما وراء الحياة الدنيا
	وقار عظیم صدیقی	المسلمون فی ما ضیہم وحاضرهم
اگست ۱۹۷۳ء	شیخ لطف الرحمان	صراع بین العالم المادی والروحي

نماذج اليقظة الايمانية من واقع الاسلام سيد قطب

فروری ۱۹۷۷ء (۱)

اس فہرست کی حیثیت محض خردار کی ایک مشمت کی ہے ورنہ ”دعوة الحق“ کی ضخیم فائلوں میں یہ جلوے قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کا انتخاب آسان کام نہیں ہے، مذکورہ بالا مضامین سے دعوة الحق کے تنوع کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں مذاہب عالم سے بحث بھی ہے اور قرآنیات کے مباحث بھی ہیں حدیث کی باریکیاں اور فقہ کے اسرار بھی، تصوف کی چاشنی بھی ہیں اور فلسفہ و کلام کی دقیق بحثیں بھی، سیاسیات و معاشیات بھی ہیں اور تذکرہ و سوانح بھی، تاریخ و سیرت، سفرنامہ جغرافیہ بھی ہیں اور تعلیمی مسائل بھی ان تمام نقشہائے رنگ برنگ کے باعث دعوة الحق ہندوستان کی عربی صحافت کی تاریخ میں نقوش جادواں مرتسم کر چکا تھا۔ پھر جب ان بلند پایہ مضامین کے لکھنے والوں کے اسماء گرامی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ رسالہ اس بلندی کا مستحق تھا ذیل میں ان بعض فضلاء و ادباء کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن کے مضامین اکثر و بیشتر دعوة الحق میں شائع ہوتے تھے۔

پروفیسر عبدالحلیم عباس، سید حسن کتبی وزیر الاوقاف مملکت کویت، مولانا مسیح اللہ خان صاحب، الاستاذ بہی الخولی، ابوالوفاء مصطفیٰ المراغی، پروفیسر عبدالحلیم عباس، شیخ محمد یوسف بنوری، علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ محمد مامون الازرنجانی، ڈاکٹر مصطفیٰ الرافعی عبدالمعتل الصعیدی، علامہ یوسف القرضاوی، سید قطب، شیخ صالح بن غالب القعیطی، ڈاکٹر ابراہیم نجات مراکشی، ڈاکٹر عباس کراہ مصری، مولانا اشرف علی تھانوی، ڈاکٹر مستشار علی منصور وغیرہم ان کے علاوہ بھی بہت سے بلند پایہ حضرات کے مضامین اس رسالہ میں شائع ہوئے جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

دعوة الحق کے ادبی مضامین اور اس کے لکھنے والوں کے اسماء کی اس جھلک سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالہ کا ادبی معیار کتنا بلند تھا اگر ان مقالات کو ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو عرب کے کسی بلند پایہ ادیب کی تحریروں سے کم معلوم نہیں ہوتی۔

”دعوة الحق“ میں مختلف ادوار اور مقتضائے وقت کے مطابق اس کے مستقل عنوانات میں برابر تغیر ہوتا رہا۔ عموماً جو عنوان شروع سے آخر تک قائم رہے وہ حسب ذیل ہیں۔

من توجيه القرآن، نفحات السنة، اخبار من دارالعلوم دیوبند مطبوعات جدیدة مقطعات ان میں سب سے پہلے ”من توجيه القرآن“ کے تحت قرآن کی کسی آیت یا سورۃ کی تفسیر بیان کی جاتی، تفسیر بھی مفتی محمد شفیع کی مشہور تفسیر ”معارف القرآن“ سے منتخب ہوتی اس میں تفصیل کے ساتھ تمام چیزوں کو بیان کیا جاتا۔ مثلاً ایک جگہ مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے لئے قرآن شریف کی ایک

آیت کی تفسیر بہت مفصل انداز میں بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين: (سورہ آل عمران)  
 ”الوهن: الضعف في العمل وفي الا مروفي الراي، والحزن الم يعرض  
 للنفس اذا حرمت ماتحب وفقدت ماترغب فيه، فالمعنى: لا تضعفوا ولا  
 تضحلوا ايها المسلمون من القتال وما يلزمه من التدبير ما اصابكم من القرح  
 و الفشل وفي احد ليس مما ينبغي ان يكون موهنا لامركم و ضعفاً لكم في  
 عملكم ومفترأ لعزائمكم ولا موجباً لحزنكم و انكسار قلوبكم و اضمحلال  
 عفويتكم فان ذلك لم يكن نصراً تاماً نهائياً للمشركين عليكم، وانما كننا لكم فيه  
 تربية على وقع منكم من مخالفة قائدكم رسول الله في تدبيره الحربى المحكم  
 وبهذه التربية تكونون احقاً بان لا تعودوا الى مثل تلك الذنوب والاطغاء (الى  
 آخره)“ (۱)

اسی طرح ”نجات السنۃ“ کے تحت کسی موضوع کی حدیث کو لے کر تفصیل سے بیان کرتے، چنانچہ  
 یہاں تک اس میں جو اختلافات ہوتے انہیں بھی بیان کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے جیسے ایک حدیث جو  
 ابو ہریرہؓ سے منقول ہے جس کا متن یہ ہے کہ:

”عن ابی ہریرہؓ قال! قال رسول اللہؐ قال اللہ عز وجل: اذا هم عبدی  
 بسیئة فلا تکتبوا علیہ، واذا عملها فاکتبو سیئة واذا هم بحسنة فلم یعلمها  
 فاکتبوا حسنة فان عملها فاکتبوا عشرآ۔“  
 فی الحدیث امر للحفظۃ وفيہ دلیل علی ان الملك یطلع علی مافی قلب  
 الآدمی اما باطلاع اللہ ایاہ او بان یخلق له علماً یدرك به ویؤید الاول ما اخرجه  
 ابن ابی الدینا عن عمران الجونی قال ینادی الملك اکتب لفلان کذا و کذا  
 فیقول: یارب! انه لم یعملہ، فیقول انه نواه؛ وقیل بل یجد الملك لهم بالسیئة رائحه  
 خبیثة وبالחסنة رائحه طيبة و اخرج ذلك عن ابی معشر المدنی ووجه مثله عن  
 سفیان بن عیینہ ورائیت فی شرح مغلطائی انه ورد مرفوعاً کذا فی الفتح“ (۲)۔

دعوتہ الحق میں مقطعات کے تحت عربی شعرا کی شعری تخلیقات نظم یا غزل پیش کی جاتی اس میں بہت  
 سے ایسے شعراء کا کلام بھی پیش کیا گیا جن کو اہل عرب کے یہاں اچھے شعراء میں شمار کیا جاتا ہے اگرچہ

۱- ”دعوتہ الحق“ ج ۶، شمارہ ۳، مئی ۱۹۷۰ء ص ۳۔

۲- ”دعوتہ الحق“ ج ۴، شمارہ ۲، مئی ۱۹۶۸ء ص ۷۔

خود کبھی آپ نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن اس فن کے حسن و بچ سے بہت اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہر نظم اور ہر غزل کے تمام پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ ڈال کر شائع کرتے تھے اس لئے ”دعوة الحق“ میں شائع ہونے والا کلام کبھی مبتذل یا غیر معاری نہیں مل سکتا ہے مثلاً ایک جگہ ابو العتہیہ کے چند اشعار بطور نصیحت پیش کرتے ہیں۔

الم تر ان الحق ابلج لائح	وان لحاجات النفوس حوائج
اذالمء لم يكفف عن الناس شره	فليس له ماعاش منهم مصالح
اذا كف عبدالله عما يضره	واكثر ذكر الله فالعبد صالح
اذالمء لمدحه حسن فعالة	فليس له و الحمد لله مادح
اذاضاق صدر المء لم يصف عيشه	وما يستطيب العيش الاالمسامح
وبينا الفتى و الملهيات يذقنه	جنى اللهواذا قامت عليه النوائج
وان امراء اصفاك فى الله وده	وكان على التقوى معيناً لناصح
وان الب الناس من كاهمه	بما شهدت منه عليه الجوارح (۱)

”دعوة الحق“ کے آخری صفحات میں مولانا نئی نئی کتابوں کو متعارف کراتے جو اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے اہل علم کی نئی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی۔

مولانا مصر و شام کے عربی رسالے الاہرام، البعث، الهلال، المقطف کو نہایت اہتمام و انتہاک کے ساتھ پڑھتے۔ ان رسالوں میں فرانسیسی و برطانوی اہل علم اور ماہرین فن کی تحقیقات برابر شائع ہوتی رہتی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے اور ان سے اہم اور کارآمد چیزوں کو اخذ کر کے کبھی علمی خبروں کے تحت اور کبھی مستقل مضمون کے طور پر ”دعوة الحق“ میں شائع کرتے رہتے۔

”دعوة الحق“ مولانا وحید الزماں کے قلم سے تحریر کی ہوئی وہ عبارات اور مضامین جن کی فہرست بہت طویل ہے میری نظر سے جو مضامین ”دعوة الحق“ کے گزر رہے ان کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

نحن فى ابتلاء من الله	ج ۳ عدد ۳	اگست ۱۹۶۷ء جمادی الاول ۱۳۸۷ھ
العدوان الاثیم	ج ۳ عدد ۳	فروری ۱۹۶۸ء ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ
موقف دارالعلوم بدیوبند من نكبة العرب	ج ۳ عدد ۳	فروری ۱۹۶۸ء ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ
عمود سقوط من عمادا لعلم والدين	ج ۳ عدد ۳	فروری ۱۹۶۸ء ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

وعد الله الصادق	ج ٢ عدد ١	فروري ١٩٦٨هـ	ذيقده ١٣٨٨هـ
انما الصبر عند الصدمة الاولى	ج ٢ عدد ١	فروري ١٩٦٨هـ	ذيقده ١٣٨٨هـ
الامة المريضة في طريقة الاستشفاء	ج ٢ عدد ٢	مئي ١٩٦٨هـ	صفر ١٣٨٨هـ
جاهدوا في الله حق جهاده			
نفحات السنة، هل من مشمر للجنة	ج ٢ عدد ٢	مئي ١٩٦٨هـ	صفر ١٣٨٨هـ
النبي محمد مثل في الكمال للانسان الاعلى			
حاربوا الساليب الاستعمار			
طريق المؤمن الى الفلاح			
وحدة الصفوف ضمان للبقاء	ج ٢ عدد ٢	اگست ١٩٦٨هـ	جمادى الاول ١٣٨٨هـ
اضطهاد المسلمين في اثيوبيا			
التواصي بالحق		نومبر ١٩٦٨هـ	شعبان ١٣٨٨هـ
من معالم الاخلاق			
المنفقون الفائزون	ج ٦ عدد ١	فروري ١٩٧٠هـ	ذوالحجة ١٣٨٩هـ
النشاط الاسلامي في العالم	ج ٦ عدد ٢	مئي ١٩٧٠هـ	ربيع الاول ١٣٩٠هـ
انتم الاعلون	ج ٦ عدد ٣		
التوبة باب المغفرة	ج ٦ عدد ٤	نومبر ١٩٧٠هـ	رمضان ١٣٩٠هـ
الراحل العظيم جمال عبدالناصر	ج ٦ عدد ٤	فروري ١٩٧٠هـ	ذی الحجۃ ١٣٩٠هـ
طهارة الضمير			
عاطفة الانفاق في سبيل الله			
رعاية الفقراء في السلام	ج ٩ عدد ١	فروري ١٩٧٣هـ	ربيع الثاني ١٣٩٣هـ
روح التضامن والوحدة في المواقف العربية	ج ٩ عدد ٢	فروري ١٩٧٣هـ	محرم ١٣٩٣هـ
واجب العلماء في الوقت الراهن			
الاسلام غرض ايجابي			
نظرة تاريخية على تأسيس دارالعلوم بدیوبند			
نظرة على الغزوات الاسلامية	ج ٨ عدد ٣	اگست ١٩٧٣هـ	جمادى الآخر ١٣٩٣هـ
كارثة وفاة الشيخ الاستاذ فخر الدين			

الناحية الاجتماعية من شهر رمضان	عدد ۴	نومبر ۱۹۷۲ء	رمضان ۱۳۹۶ھ
دارالعلوم وفتنة القاديانية	ج ۱ عدد ۱	اگست ۱۹۷۲ء	شعبان
معاداة اليهود للاسلام والمسلمين	ج ۵ عدد ۲	مئی ۱۹۶۸ء	بیچ الاول ۱۳۸۸ھ
الوصايا العشر الربانية			
روائع الحكم	ج ۸ عدد ۳	اگست ۱۹۷۲ء	جمادی الآخر ۱۳۹۳ھ
نور جديد يسطع من آفاق مكة			
خدمات علماء دارالعلوم دیوبند	ج ۱ عدد ۱	مئی ۱۹۷۲ء	بیچ الاول ۱۳۹۵ھ (۱)

## الكفاح

مولانا وحید الزماں کا شہرہ آفاق پندرہ روزہ عربی اخبار ”الكفاح“ مختلف حیثیتوں سے عربی صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ”الجمیعیہ“ اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کی عہد آفریں شہرت و عظمت کا سہرا مولانا کی نابغہ روزگار شخصیت کے سر ہے۔

الكفاح عربی صحافت میں محض ایک اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ اپنی ذات سے ایک مستقل تحریک تھی جس نے طوفان حوادث میں اسلامیات عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدا کی کافریت انجام دیا اس کے سیاسی و ادبی کارناموں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس منظر کا اجمالی تذکرہ ناگزیر ہے جس میں الكفاح کا اجراء عمل میں آیا تھا۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان بڑے نازک دور سے گزر رہے تھے۔ تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات نے ان کے قویٰ مضحل کر دیئے تھے۔ ذرائع معاش تقریباً ختم ہوتے جا رہے تھے۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں ان کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ عرب ممالک صرف پاکستان کے مسلمانوں کو اہمیت دیتے تھے ان کی ہمدردی اور تعاون پاکستان کے لئے ہی خاص ہو گئی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق ہندوستان میں ایک بہت ہی معمولی تعداد میں مسلمان تھے وہ بھی مذہبی اعتبار سے ناکارہ اور نابلد پھر حکومت میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

چونکہ جمعیۃ علماء ہند یہاں مسلمانوں کی قائد جماعت تھی، تمام مسلمانوں کے احوال ان کے سامنے تھے عربوں کے خیالات کا بھی انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ عربوں کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے، ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور ہندوستان میں جمیعت کے کردار کو اجاگر کرنے کی غرض سے اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ”الكفاح“ کا اجراء عمل میں آیا جس کا سہرا مولانا وحید الزماں صاحب کے سر ہے۔ شروع میں کئی سال تک تو

پورا بار آپ کے ہی کندھوں پر رہا۔ جس وقت ’الکفاح‘ منظر عام پر آیا اس وقت ہندوستان میں کانگریس کی حکومت تھی۔ چنانچہ اس اخبار کا دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عرب ممالک کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی حقیقت اور عمل دخل نہیں ہے اور حکومت کا رویہ ان کے ساتھ ظالمانہ ہے چنانچہ اس اخبار کے ذریعہ بہت سی غلط فہمیاں دور بھی ہوئی اور حکومت کی بہت سی غلط پالیسیوں پر پردہ ڈالا گیا۔ چونکہ مولانا وحید الزماں صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ کلیتہً مالک نہیں تھے۔ لہذا جو بھی جمعیت کا موقف ہوتا اس کو اسی انداز میں پیش کر دیتے گویا کہ آپ کی حیثیت ایک ترجمان کی تھی۔ ایسا نہیں کہ حکومت پر کبھی تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ ادارہ ”کلمۃ الکفاح“ میں ہر موضوع پر گفتگو کرتے خواہ حکومت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو البتہ پورا اخبار صدر جمعیت کے اسفار و پروگرام اور جمعیت کی خبروں سے ہی لبریز ہوتا۔ (۱)

ان حالات اور جمعیت کے مقاصد کے پس منظر میں ”الکفاح“ افق صحافت پر بڑی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا اور اس کی ضیا پاشیوں نے دہلی کے مطلع سے شروع ہو کر مشرق و مغرب یہاں تک کہ عرب ممالک سب کو مطلع انوار سے روشن کر دیا۔ یہ اخبار مسلمانوں کی نئی آواز اور عالم اسلام کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے روشناس کرانے کے لئے ایک نیا پیغام تھا۔ مولانا وحید الزماں کی زبان قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کی ندرت تراکیب اور جذبات کی صداقت ایسی تھی کہ اخبار نکلتے ہی ساری دنیا پر چھا گیا۔ دیکھتے دیکھتے ہی اس کی تعداد اشاعت میں کافی اضافہ ہو گیا جو کہ عربی اخبارات کے حصہ میں کم ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ الکفاح کاروباری مشغلہ نہ تھا جیسا کہ اس دور کی عام روش تھی کہ اخبارات صرف تجارت کا ذریعہ بن چکے تھے لیکن جمعیت نے اس کو کبھی بھی تجارت کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ الکفاح ہمیشہ خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ، ۸ صفحات پر مشتمل عجیب و غریب واقعات سے مزین ہوا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک سیاسی پرچہ تھا۔ لیکن اس کے متنوع اور ہمہ گیر انداز میں سیاست، تبلیغ دین، فلسفہ و حکمت، احوال شرق و غرب علمی و ثقافتی معلومات سب تھیں۔

الکفاح کی امتیازی خصوصیت مولانا وحید الزماں کے طرز تحریر کی بداہت نئی زبان اور علوم اسلامیہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ جذباتی قسم کا اسلوب جس کی تحریر میں قیامت کی ادا نظر آتی ہے۔ جملوں اور لفظوں کے تودہ بادشاہ تھے اور محض ترتیب کے الٹ پھیر سے اپنی تحریروں میں وہ گرمی پیدا کر دیتے تھے جس کی آنچ مدھم ہوتے ہوئے بھی پڑھنے والے کے شعور کو بے بس کر جاتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا وحید الزماں کے یہاں جو مرصع کاریاں مترادفات کی کثرت تراکیب، ابداع سخن اور اختراع معانی ہے اس کا اہتمام ہندوستان کی عربی صحافت میں کم ہی ملے گا۔ پھر یہ لفظی گل کاری محض نمود و نمائش کے لئے نہیں تھی

بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد اور ایک تحریک بھی وابستہ تھی۔ (۱)

جیسے جیسے مولانا کی وسعت مطالعہ کے ساتھ گہرائی اور مشاہدہ میں گہرائی آتی رہی مضامین سے قطع نظر ان کے ادارہ کا دامن بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو الکفاح کے ایڈیٹر میں زیر گفتگو نہ آتا ہو، اگرچہ بنیادی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کو حاصل تھی لیکن اس محور کے گرد ساری دنیا گھومتی تھی۔ اس کے علاوہ ملکی و بین الاقوامی مسائل کا بیان ان اداریوں میں نمایاں ہیں۔ مدیر الکفاح قابل رشک بات پر ”کلمۃ الکفاح“ (اداریہ) کے ذریعہ لوگوں کو اکساتے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے، قابل تقلید امور کی نشاندہی کرتے اور غیروں سے کوئی اچھی بات ملتی تو اس کی مناسب الفاظ میں تعریف کرتے اور معیاری چیزوں کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کرتے تھے اور ان غیروں کا ذکر بڑی عزت و احترام سے کرتے لیکن کسی مذہب اسلام اور اسکے واسطے سے مسلمانوں کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا تو یہی مدیر اپنے قلم کے نشتر سے اس کی آنکھیں نکالنے کا سامان تیار کر لیتا اور اگر کوئی غلط بات زبان پر لاتا تو طنز کے تیروں سے اس کو زخمی کر ڈالتے۔

۱۹۷۳ء میں جب الکفاح ”طلوع ہوا تھا تو ایک عرصہ تک مولانا وحید الزماں نے اس کو تنہا سنبھالا مگر اپنی گونا گوں تدریس و تالیف کی مصروفیات کے باعث معاونین کے متلاشی ہوئے اور مولانا منزل صاحب جو آج ملی جمعیت کے سیکریٹری اور تنظیم انباء قدیم کے بھی آفس سیکریٹری اور متحرک ممبر ہیں۔ مولانا ان کی صلاحیتوں کے کما حقہ معترف تھے۔ کیمپ دارالعلوم دیوبند کے دوران انہوں نے ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ عربی میں آپ کی صلاحیت بہت اچھی تھی، لہذا مولانا منزل صاحب کو ۸۳ء میں معاون ایڈیٹر کی ذمہ داری سونپ دی جنہوں نے اسکو بخوبی انجام دیا اور ۹۸ء میں باقاعدہ ایڈیٹر بنا دیا گیا ایڈیٹر بننے کے بعد پورے اخبار کو سنبھال لیا۔ مولانا اخبار کے شائع ہونے سے قبل صرف ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے لیکن تمام کام مولانا منزل ہی خود کیا کرتے تھے۔ (۲)

مولانا الکفاح کے ادارہ تحریر سے تقریباً ۱۵ سال تک وابستہ رہے اس مدت میں انہوں نے بہت سے گرانقدر علمی و مذہبی مقالات و مضامین لکھے اس دوران کئی خصوصی نمبر بھی نکالے جیسے ذکرئی ملک فیصل، شاہ فیصل کی وفات پر اور حرکتۃ انقاذ الوطن و الملة، ملک و ملت بچاؤ تحریک صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم نمبر۔ یہ خصوصی نمبر ۳۲ صفحات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ اس اخبار میں مستقل لکھنے والے یہ تھے۔ ابو بکر غازی پوری، ابو القاسم بنارسی، ابو العاص وحیدی، عبد الوحید حیدر آبادی، واحد فیاض فیض آبادی، عبد الستار سلام، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا ندیم الوجدی وغیرہ۔ جمعیت کی تمام خبریں اور

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ثقافتہ الہند“ ج ۳۸ شمارہ ۱-۳ ۹۸ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۹۲۔

۲- مولانا منزل الحق الحسینی (سابق ایڈیٹر الکفاح) بالشانہ۔



ایڈیٹوریل ”کلمۃ الکفاح“ ایڈیٹر کے قلم سے ہوا کرتا۔ کبھی کبھی عرب ادباء کی تحریریں بھی نقل کی جاتی۔ آخری صفحہ پر مخصوص مصطلحات کا کالم ہوا کرتا تھا۔ مصطلحات سیاسیہ مصطلحات حربیہ، مصطلحات صحفی، وغیرہ۔ تعلیقات الصحف کے عنوان سے عالمی خبروں پر تبصرہ ہوا کرتا تھا۔

اس اخبار نے بہت جلد عرب ممالک میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا اسکے ذریعہ مولانا وحید الزماں کا نام بھی پورے عالم عرب میں گونجنے لگا۔ عربوں میں اس اخبار کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کی تحسین اور اس کے مدیر کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اس پر گرانقدر تبصرہ بھی کیے گئے۔ اکثر عربی اخبارات نے اس کی تعریف و توصیف کی اور خطوط کے ذریعہ ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی کی۔ اخبارات نے گرانقدر تبصرہ بھی لکھے۔ التضامن الاسلامی، الوعي الاسلامی، الاصلاح، الازہار، البلاغ، الازہار، الرسالة الاسلامیہ، مسلموا آسیاء قزاقستان۔ ان تمام اخبارات نے اس کی تعریف و توصیف کی اور ایڈیٹر کی تحریروں کو سراہا۔ اکثر اخبارات نے اس کے مضامین نقل کئے جس سے تمام عرب ممالک میں جمعیۃ علماء ہند کی ایک اچھی خاصی شہرت ہو گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل بھی ان کی توجہ کا مرکز بن گئے ورنہ اس سے قبل اہل عرب یہاں کے احوال سے ناواقف تھے۔ اس کے ذریعہ سے یہاں کے سیاسی حالات کا بھی علم ہونے لگا۔ اس اخبار کی وجہ سے خود مولانا وحید الزماں کی بھی اچھی خاصی شہرت حاصل ہو گئی اور عالم اسلام کے تمام ادباء و علماء ان کے علم و ادب کا اعتراف کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عرب کے ایک بہت بڑے بزرگ اور عالم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں ”الکفاح“ کے ذریعہ نئی تعبیرات اور نئے الفاظ سیکھتا ہوں جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو مولانا وحید الزماں نہایت شستہ اور فصیح و بلیغ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن میری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ مولانا کا مصر کے سلسلے میں جمال عبدالناصر کی طرف جھکاؤ کیوں ہے؟ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب جمال عبدالناصر صدر مصر اور امریکہ میں کش مکش چل رہی تھی، آپ جمال عبدالناصر کی طرفداری میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ (۱)

## الداعی

۱۹۷۰ء میں بعض اسباب کی بناء پر عربی سہ ماہی رسالہ ”دعوة الحق“ کے بند ہونے کے باعث دارالعلوم طلبہ کے اندر ایک بے چینی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی اور جو لوگ عربی صحافت سے دلچسپی رکھتے تھے اور عربی میں مقالات وغیرہ لکھنے کا شوق رکھتے تھے ان کے لئے دشواری پیدا ہو گئی تھی۔ دارالعلوم کی عربی صحافت پر جمود و تعطل کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، پھر طلبہ کے لئے عربی کی نئی نئی تعبیرات کے اخذ کرینا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا، عربی زبان و ادب کے جس ماحول کو پیدا کرنے میں مولانا وحید الزماں نے بے انتہا محنت اور جدوجہد کی تھی اس پر تنزلی کا دور شروع ہو گیا تھا لہذا ان اسباب و عوامل کے پیش نظر دارالعلوم کی

انتظامیہ نے پندرہ روزہ عربی اخبار ”الداعی“ کے نام سے نکالنے کا فیصلہ کیا جس کے مدیر مسئول مولانا وحید الزماں منتخب کئے گئے۔ دارالعلوم کے دوسرے کاموں میں مشغولیت کے باعث آپکو رکیس التحریر کی ذمہ داری سے علیحدہ رکھا گیا، البتہ پورا اخبار آپکی نگرانی میں ہی نکلتا تھا۔ یہ اخبار دارالعلوم کا ترجمان اور دیوبند کا عکس اس میں واضح نظر آتا ہے، ابتداء میں چند سال اسکے رکیس التحریر مولانا بدر الحسن رہے ۱۹۸۳ء میں اسکی ادارت مولانا نور عالم غلیلی امینی کے سپرد کی گئی جو آج تک بڑی ذمہ داری سے اسکے فرائض انجام دے رہے ہیں کچھ عرصہ سے اسکو باقاعدہ مجلہ کی شکل دیدی گئی ہے۔

یہ مجلہ دینی و علمی مقالات پر مشتمل ہونے کے علاوہ ہندوستان اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی اہم خبروں پر بھی مشتمل ہوتا ہے خاص طور سے ”محلّیات“ کے عنوان سے ایسی خبریں تحریر کیجاتی ہے جو ملت اسلامیہ ہند کے تعلق سے اہم ہوتی ہے اس کے مستقل دو کالم ”کلمۃ العدد“ اور ”اشراقہ“ رکیس التحریر (مدیر) کے قلم سے ہوتی ہیں اشراقہ کے کالم کو وہ ابواسامہ نور کے نام سے تحریر کرتے ہیں۔“ (۱)

اسمیں شائع ہونے والے کچھ مقالات عرب اہل قلم یا عربی زبان میں لکھنے والے ہندوستانی اہل قلم کے ہوتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اس میں ہندوستانی علماء و فضلاء کی اردو تحریروں کو بھی عربی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے اس طرح یہ رسالہ اردو زبان میں لکھنے والے ہندوستانی علماء و فضلاء کے افکار و خیالات سے اہل علم کو روشناس کرا نیکا اہم ذریعہ ہے متعدد مواقع پر اس جریدہ کے خصوصی شمارہ بھی منظر عام پر آچکے ہیں یہاں اس کا وہ شمارہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے جو دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس میں دارالعلوم کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ اجلاس کی مکمل تفصیل اور اس موقع پر مہمانوں کی جانب سے پیش کئے گئے کلمات شائع کئے گئے تھے اس میں اہل علم اور اسکالرس کی علمی و تحقیقی تحریریں سامنے آتی رہتی ہے۔ خود مولانا وحید الزماں بھی کبھی کبھی اس میں لکھا کرتے تھے اور انکے بہت سے مضامین بھی شائع ہوئے ہیں جن میں صرف ۱۲ مضامین ہی دستیاب ہو سکے جنکی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

- |   |                        |
|---|------------------------|
| (۱) مصیر الانسان فی نظر الاسلام                             | ۱۰ / ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ |
| (۲) واجب العلماء فی الوقت الراہن                            | ۲۶ / رجب ۱۴۰۳ھ         |
| (۳) موقفنا فی حاجة الی التغبیر                              | ۱۱ / شعبان ۱۴۰۳ھ       |
| (۴) معاداة الیہود الاسلام والمسلمین فی العصر الاول          | ۲۷ / شعبان ۱۴۰۳ھ       |
| (۵) محاولة تفریق الیہود بین المسلمین                        | ۱۳ / رمضان شوال ۱۴۰۳ھ  |
| (۶) جامعة دارالعلوم و خدمات مشرقہ علی صفحات التاریخ الاسلام | ۷ / محرم ۱۴۰۳ھ         |

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”شعۃ الہند“ ج ۳۸، شمارہ ۱-۴ ۱۹۸۷ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۵۶۔

- (۷) الصوم و آثاره فی الفرد والمجتمع ۲۸ / ذی الحجة ۱۴۰۴ھ
- (۸) يوم الجائزة والرضوان ۱۳ / ذی الحجة ۱۴۰۴ھ
- (۹) خطاب فضيلة الشيخ وحيد الزمان الكيرانوى ۹ / صفر ۱۴۰۴ھ
- (۱۰) دروس عن الصيام ۱۰ / رمضان ۱۴۰۴ھ
- (۱۱) التربية الاسلامية للشباب مارس ۱۴۰۴ھ
- (۱۲) يوم الجائزة والرضوان ۱۳ / ذی الحجة ۱۴۰۴ھ

الداعي کے درجہ ذیل مقاصد ہیں جو اس کے آخری صفحہ پر ہمیشہ تحریر ہوتے ہیں

- ☆ ایقاظ الوعي الاسلامی فی قلوب المسلمين
- ☆ المشاركة فی آلام الامة الاسلامیة واحلامها
- ☆ احاطة المسلمين العرب بما یعیشہ المسلمون العجم من القضا والمشكلات
- ☆ الاهتمام بتوسيع رقعة اللغة العربیة فی هذه الديار خصوصاً وفي العالم عموماً
- ☆ نشر الدعوة والثقافة الاسلامیة نقیة من الشوائب
- ☆ العمل على تصحيح صلة المسلمين بالله و العودة بهم الى الكتاب والسنة و
- ☆ تجنيبهم من الخرافات والاهام -
- ☆ العمل على تأهيل الشباب المسلم لمواجة التحدى الحضارى الحديث بجميع
- ☆ شئونه وسمومه وفنونه ومكره ونفاقه وجنونه
- ☆ اثبات ان الاسلام رسالة الله الخالدة الباقيّة التي تصلح لكل زمان ومكان بما
- ☆ يحمله من مقومات الحياة المتجددة ومن المشمول والمرونة والنعموة
- ☆ التعبير عن الفكر الاسلامی الاصيل المتوارث عن الصحابة والتابعين ومن
- ☆ تبعهم باحسان
- ☆ تجنيب الشباب المسلم عن الافراط والتفريط في فهم الدين وتطبيقه. (۱)

### ماہنامہ القاسم (جدید)

مولانا وحید الزماں کا شمار اگرچہ اردو صحافیوں میں نہیں ہوتا ہے انکا اس میدان میں کوئی خاص حصہ بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ نے اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جس زمانہ میں آپ نے دیوبند میں دارالفکر نامی ادارہ قائم کیا اور وہاں عربی زبان و ادب کی کلاسیں شروع کی اسی دوران آپ نے ایک

رسالہ کی ضرورت محسوس کی جس کا مقصد عوام کی اصلاح اور ادارہ کی بقاء و تشہیر تھی اس خیال سے آپ نے ”ماہنامہ القاسم جدید“ کا اجراء کیا اور شروع میں تن تنہا اس کی تمارت ذمہ داری خود ہی سنبھالی ادارہ یہ سے لیکر شذرات تک اصلاحی مضامین سے لیکر سیاسی مضامین تک حدیث کی تشریح اور قرآن پاک کی تفسیر، ”تراشے“ جو عالمی دلچسپ خبروں سے معمور ہوتا تھا غرض کہ کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس پر آپ نے قلم کو جنبش نہ دی ہو اکثر مضامین آپ ہی کے قلم کے مرہون منت ہوتے لیکن کچھ دنوں بعد آپ نے ادارہ تحریر کی ایک ٹیم تیار کی جس میں مولانا ابوالحسن بارہ بنگوی کو مدیر اور رئیس احمد اور بدرالدین مراد آبادی کو رکن تحریر بنایا گیا اگرچہ رسالہ اپنی ضیا پاشیوں کو زیادہ دن برقرار نہ رکھ سکا اور ادارہ کی کچھ مشکلات کے سبب رسالہ کو بند کرنا پڑا لیکن جتنے دن بھی منظر عام پر آیا لوگوں میں ایک مقام حاصل کر لیا اور اس دور کے معیاری رسائل میں شمار ہونے لگا، لوگ مولانا کے ترشحات قلم سے مستفید ہونے کے لئے بے چین رہتے مولانا سادہ عام فہم زبان استعمال کرتے ادارہ شذرات اور چھوٹے چھوٹے جملوں سے مرصع عبارت ان کی تحریروں کو چار چاند لگا دیتی، علمی مسائل پر اکثر تبصرہ کرتے رہتے اس رسالہ کے بنیادی مقاصد کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ اس کے اجراء سے ایک جانب وابستگان مسلک علماء دیوبند کو عصری تقاضوں اور مسائل حاضرہ سے باخبر رکھا جائے اور دوسری جانب اکابر امت اور علماء دیوبند کی علمی کاوشوں سے استفادہ کرنے والے شائقین کے ذوق طلب کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہوتا رہے۔

القاسم کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا اس میں مدیر مصلو کی ذمہ داری مولانا ہی پر تھی اس میں اصلاحی مضامین کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات پر بھی بحث کیجاتی اس کے علاوہ اس میں ”تراشے“ نام سے ایک کالم ہوا کرتا جس میں عالمی خبروں کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب واقعات کو شائقین کے لئے لکھا جاتا تھا یہ کالم ناظرین القاسم میں بے حد مقبول تھا۔ نیز معارف القرآن سے کسی آیت کی تفسیر اور اسپر سیر حاصل بحث ہوتی۔ آخر میں دو صفحے ”الدرس العربی“ کے لئے مخصوص تھے عربی کے چھوٹے چھوٹے جملے اور نئی تعبیرات کے ساتھ ان جملوں کا ترجمہ بھی لکھا جاتا تاکہ ان جملوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

اس کا ادارہ مولانا ہی کے قلم سے تحریر ہوا کرتا تھا اگرچہ اس پر کہیں بھی آپ کا نام تحریر نہیں ہے لیکن دوسرے لوگوں کی جو تحریریں ملتی ہے اس میں مضمون کے شروع یا آخر میں اس شخص کا نام ضرور ملتا ہے اگرچہ شروع میں اس کے مدیر مولانا ابوالحسن بارہ بنگوی تھے لیکن انکی تحریریں بھی ان کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو مضامین یا ادارہ بغیر نام کے شائع ہوتے تھے وہ مولانا وحید الزماں کے ہیں۔ آپ کا ادارہ سیاسی، اصلاحی اور تنقیدی ہر قسم کے موضوع سے لبریز ہوتا۔

القاسم کا پہلا شمارہ ۱۹۶۰ء میں نکلا یہ رسالہ دار الفکر کا علمی رسالہ تھا اس کے مقاصد وہی تھے۔ جو خود

دارالفکر کے تھے۔ مولانا نے القاسم کے پہلے نمبر میں نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ ”القاسم“ کے اجراء، اس کے اغراض و لائحہ عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طویل ادارہ کے کچھ اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں :

”جہاں تک موجودہ ماہنامہ ”القاسم“ کا تعلق ہے تو اس کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ایک جانب وابستگان مسلک علماء دیوبند کو عصری تقاضوں اور مسائل حاضرہ سے باخبر رکھا جائے اور دوسری جانب اکابر امت اور علماء دیوبند کی علمی کاوشوں سے استفادہ کے شائقین کے ذوق طلب کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہوتا ہے رسالہ کی ترتیب کے سلسلے میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین اپنی علمی ندرت کے باوجود غیر علمی حلقوں کے لئے بھی باعث دلچسپ ثابت ہوں ماہنامہ کے بعض مستقل عنوانات مزید محنت اور توجہ کے مستحق ہیں جسکی پوری رعایت انشاء اللہ آئندہ شماروں میں محفوظ رہ سکے گی سر دست بطور نمونہ چند چیزیں پیش کر دی گئی ہیں۔ ”معارف کے ذیل میں آپ آئندہ قدیم و جدید افکار سے مستفید ہو سکیں گے اور افادات اکابر“ کے تحت اکابر امت خصوصاً اکابر دیوبند کے مخصوص نتائج فکر کی توضیح و تشریح کا سلسلہ جاری رہیگا جسکی ابتداء قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ کے علمی تبرکات سے ہو رہی ہے ارادہ یہ ہے کہ ”اور اقی پارینہ“ کے تحت بعض قلمی نوادرات یا مطبوعات اور نایاب مضامین ماہنامے ”کی زینت بنتے رہے اس سلسلہ میں الہلال مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کا ایک معرکہ الآراء مضمون ”الجزائر کے دو مجاہد“ پیش کیا جا رہا ہے۔

جو حضرات جدید عربی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے درس عربی کا مستقل عنوان برقرار رہیگا اس عنوان کے تحت ایسے اسباق کی مسلسل ترتیب و اشاعت کا پروگرام زیر غور ہے جو طلبہ مدارس عربیہ کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہو سکے..... بتدریج جدید عربی لٹریچر کے مروجہ اسلوب تحریر سے روشناس ہوں اور ان میں اس درجہ ادبی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ مصر و حجاز سے شائع ہونے والے مجلات و جرائد اور تازہ ترین مطبوعات کا سہولت مطالعہ کر سکیں۔“ (۱)

مولانا وحید الزماں صاحب ”القاسم“ کے ایک سال گزرنے پر اکتوبر ۱۹۶۱ء کے ماہنامہ کے ادارہ میں ”القاسم“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”القاسم“ اپنے مقاصد اپنے مزاج اور اپنی صورت و سیرت کے لحاظ سے ان دلفریب رعنائیوں کے غازہ سے یکسر محروم رہا جو التفات قلب و نظر کے لئے یہ ضروری ہے۔ وہ علم و فن کی ان دل آویز نمائشوں کے لئے دعوتِ نظارہ بن سکتی ہے ہم زندگی کے بارے میں جن تصورات کے حامل ہیں۔ انسانی قدروں کے جن سانحوں کو اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں اور فکر و نظر کے جن پیمانوں پر یقین رکھتے ہیں وہ اس دور کے مزاج سے بالکل متغائر آج کے مشاغل سے بالکل متضاد اور وقت کی دلچسپیوں سے سراسر مختلف ہیں ہمارے سامنے ماضی کا وہ عظیم ورثہ، حال کے تجربات اور مستقبل کے امکانات ہیں ہم نے نئے رجحانات کے طوفان میں وقت کے دھارے کے خلاف اپنی کشتی ڈالی تھی اور اس عزم کے ساتھ اس سفر پر چلے تھے کہ خطرات کو انگیز کریں گے حوادث کو خوش آمدید کہیں گے اور تلخیوں کو انگلیں سمجھیں گے تحدیث بالعمۃ کے طور پر اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ بھگدہ اللہ ہمارے اس عزم میں جو توانائی آغاز سفر کے وقت تھی وہی آج بھی ہے ہم انہیں ارادوں انہیں مقاصد اور انہیں ولولوں کے ساتھ ”القاسم“ کے سفر کو جاری رکھنا چاہتے ہیں جن کا توشہ لیکر ہم نے یہ سفر شروع کیا تھا۔

اس ایک سالہ زندگی میں لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہم نے اپنے قارئین کی طلب انکے ذوق اور انکے مزاج کے مناسب فکر و نظر کا ساز و سامان، علم و ادب کی غذا اور دین و اخلاق کی پونجی فراہم کی۔ مخلصانہ سعی سے دریغ نہیں کیا۔

اس نئے سال کے آغاز پر ہم اسی اخلاسی دیگانگت کے ساتھ اپنے حلقہ احباب و ہمدردان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان کے ذوق کی تسکین اور القاسم کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں کریں گے گذشتہ یک سالہ سفر کے تجربات کی روشنی میں آئندہ ”القاسم“ کی معنوی ترتیب اور اس کے ظاہری محاسن کو بہتر بنانے کی کوشش جاری رہی ہے مگر ہماری یہ کوشش اسی وقت بار آور ہو سکتی ہے جب ہمارے مخلص و احباب کا تعاون ہمیں نہ صرف یہ کہ بدستور حاصل رہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ ہو۔

یہ بات ہمارے مخلصین اور ہمدردوں کے پیش نظر رہے کہ ”القاسم“ مسلک دیوبند کا ترجمان اور اتحادِ ملت کا نقیب بھی، اصلاحِ امت کا داعی بھی اور ماضی کی غلطیوں کا امین بھی، وہ حادثاتِ حال کا شاہد بھی ہے اور مستقبل کے صبح کا پیغامبر بھی وہ اس مشن کو

لیکراٹھا ہے اور امت کے ہر فرد سے اس کا خطاب یہ ہے کہ فکر و نظر کی گمراہی چھوڑ کر راہِ مستقیم پر آؤ کتاب و سنت کا دامن پکڑ کر مسلمانوں میں رہو، عزت کی زندگی بسر کرو یا عزت کی موت مر جاؤ، یہ ”القاسم“ کی دعوت کا خلاصہ ہے اور یہی تحریکِ دیوبند کا حاصل ہے یہ وہ راہ ہے جس پر ”القاسم“ کا کارواں رواں دواں ہے اس راہ میں صعوبتیں بھی ہیں اور کلفتیں بھی لیکن اس راہ میں ایک قدم بھی ایک مستقل زندگی ہے اور اس راہ کی شہادت اک نقشِ جاوداں ہے جسکو توفیق میسر ہو اس کے لئے یہ کارواں منتظر ہے،“ (۱)

ماہنامہ القاسم کے ادارہ کے چند اقتباسات ذیل میں تحریر کئے جاتے ہیں جن سے بخوبی اس کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے فرقہ وارانہ فسادات میں کافی تیزی آگئی تھی۔ اکثر آجکل کی طرح ان میں نقصان زیادہ تر مسلمانوں ہی کا ہوا کرتا تھا لہذا مولانا نے پنڈت نہرو کے ایک بیان پر جس میں انہوں نے ریاستی حکومتوں کو ہدایت کی تھی کہ اقلیتوں کی شکایات کو دور کیا جائے اور فرقہ پرستی کے رجحانات کو روکا جائے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

”ظاہر ہے کہ امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے یہ کوئی پہلی اپیل نہیں ہے، شانتی کی اپیل برابر ہوتی رہتی ہیں اور ہنگامے بھی برابر ہوتے رہتے ہیں۔ اپیلیں آئندہ بھی ہوتی رہیں گی اور ہنگامہ بھی۔ ۱۹۴۷ء سے اپیلوں اور ہنگاموں کے درمیان جو رشتہ قائم ہے گذشتہ تیرہ سال کے واقعات اس کی استواری ثابت کر چکے ہیں اب بہتر یہ ہے کہ ان زبانی اپیلوں کا سلسلہ بند کر دیا جائے کیونکہ وطن دشمن عناصر امن و امان کی تلقین سے متاثر ہونے کے بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھتے ہیں اسی کے ساتھ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہر فساد اور ہر ہنگامہ کے بعد جمہوری دستور کے مطابق انہیں کھلے عام پھرنے اور دوبارہ تقریر و تحریر کے ذریعہ اشتعال انگیزی پھیلانے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔“ (۲)

۱۹۶۱ء میں جیلپور میں ہندو مسلم فساد ہوا جس میں ظاہر ہے کہ پولیس کی بربریت اور ان کا ظلم صرف مسلمانوں پر ہی ہوا۔ اسمیں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان بہت زیادہ ہوا اس کے بعد مسلمانوں کی پوری قوم میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہر شخص کی نگاہ مسلم رہنماؤں کی طرف تھی اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ مسلم رہنما اس سلسلے میں کوئی بیان دیں اور ایسا کوئی اقدام کریں جس سے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات دنیا بھر کے سامنے آجائے اور حکومت بھی آئندہ انکے تحفظ کو یقینی بنائے چنانچہ مسلم قوم پرستوں کی جانب سے ”انڈین مسلم کنونشن“ کے نام سے ایک کنونشن کا انعقاد کیا گیا جو کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی آواز تھی اولاً اس کافرنس کے سلسلے میں

۱- ماہنامہ ”القاسم جدید“ ج ۲، شمارہ ۱، اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۳۔

۲- ماہنامہ ”القاسم جدید“ ج ۱ شمارہ ۲، نومبر ۱۹۶۰ء ص ۴۔

یہاں کی پریس نے خوب اچھالا اور اسکو ایک اچھا خاصہ ڈرامہ بنادیا لیکن یہ اخبارات کا اپنا مشغلہ ہے کہ کسی بات کو کیسے ہی توڑ مروڑ کر پیش کر دیں لیکن جو کچھ اس کانفرنس میں ہوا وہ ایک ڈرامہ سے کم نہ تھا، مولانا وحید الزماں صاحب نے اس کنونشن پر تبصرہ کرتے ہوئے اسکی تفصیل اس طرح بیان کی۔

”بہت سے ایسے مسلم رہنماؤں نے جو سرکاری اور درباری حیثیت رکھتے ہیں اپنی احساسِ کمتری اور مسلمانوں کے احساسات سے بے نیازی کا حیرتناک ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک صاحب نے جو مسلمان بھی ہیں اور اتفاق سے ایک نہایت اونچے منصب پر بیرونی دنیا میں ملک کی نمائندگی کا فرض ادا کرتے رہے ہیں ان کو بھی کنونشن کے لئے شروع میں اعتماد میں لیا گیا تھا اور کنونشن سے متعلق تمام امور سے آگاہ کر دیا گیا تھا، لیکن وہی صاحب لندن پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”مسلمان ہندوستان میں اسی طرح مطمئن اور خوشحال ہیں جس طرح دوسری قومیں“ اسی طرح کے بیانات کچھ دوسرے مسلم سیاسی رہنماؤں نے بھی دیئے اس سے کنونشن کا ڈرامہ بھی سامنے آگیا اور تمام سیاسی لیڈروں کے چہرے بھی سامنے آگئے ان تمام حالات کے بعد آپ لکھتے ہیں۔

”آج ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی کنونشن کی تجاویز میں مسلم اقلیت کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کئے جانیکے بجائے ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا کہ جیسے گورنمنٹ آف انڈیا کی آئندہ پالیسی ان خطوط پر مرتب کیجائے۔ اگر جہلپور کے الم ناک حادثہ کی صرف یہی قیمت ہو سکتی ہے کہ کچھ گزارشات پیش کر دیجائیں تو عقل، تاریخ اور تجربہ کی رو سے جہلپور کی یہ سب سے کم قیمت ہے جو ہم نے خود لگائی ہے، قوموں کی زندگی کا فیصلہ درخواستوں اور التجاؤں پر کبھی نہیں ہوا پھر جس تذبذب اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کنونشن کا انعقاد ہوا اس نے ہمارے قوم پرور رہنماؤں کے وقار کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان سے وابستہ توقعات بھی کافی حد تک مجروح ہوئی ہیں۔“ (۱)

## مقبولیت

یہ رسالہ عوام خواص سبھی میں بہت ہی مقبول ہوا جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس کے ادارہ تحریر کو داد تحسین سے نوازا اور ان لوگوں کی کوشش کو سراہا لوگوں نے خطوط کے ذریعہ حوصلہ افزائی فرمائی انھیں میں سے چند خطوط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔



قارئین کرام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

”القاسم کا پہلا شمارہ سامنے ہے اس نے جس سلیقے، شعور اور حوصلے سے سفر شروع کیا ہے وہ بجائے خود قابل مبارکباد ہے۔ اگر اسی طرح اسے چلاتے رہے تو اچھا کام چلا سکیں گے“

قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے اس رسالہ کی تعریف و توصیف میں لکھا:

”القاسم کا پہلا شمارہ شدید انتظار اور انتہائی اشتیاق کے بعد موصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ رسالہ کی ترتیب اور طباعت و سادگی دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے جیسا کہ آپ نے ادارہ میں تحریر فرمایا ہے، واقعہً یہ پرچہ اپنے نصب العین کی غمازی کر رہا ہے اور اہل نظر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ماہنامہ کا آئندہ معیار کیا ہو گا۔“

قاضی زین العادین سجاد میر ٹھی اس رسالہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

”القاسم کا بامعان نظر مطالعہ کیا اس کے مضامین پر زور اور بصیرت افروز ہیں، وہ زندگی کے بھرپور احساسات سے لبریز اور معنوی تجلیات کا پر تو ہے اس میں اسرار فطرت لطیف انداز میں بے نقاب کئے گئے ہیں، القاسم اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابل ستائش اور ادارہ تحریر مبارکباد کا مستحق ہے۔“

مولانا محمد میاں صاحب دہلی نے اس طرح ذمہ داران ”القاسم“ کی حوصلہ افزائی فرمائی:

”رسالہ کی ترتیب میں آپ حضرات نے جس سلیقہ کا ثبوت دیا ہے، اسی کی توقع تھی۔ رسالہ ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے بہت پسند آیا، شمارہ کی ترتیب اور حسن کتاب و طباعت قابل تعریف ہے خصوصاً حدیث کے صفحات لائق مطالعہ ہیں اس میں شک نہیں کہ ’القاسم‘ کا اجراء اقتضاء وقت کے عین مطابق ہے۔“ (۱)

## اسلوب تحریر

عربی زبان میں مولانا کا اسلوب ادبی سلاست و روانی، علمی متانت و سنجیدگی اور تبحر علمی کا آئینہ دار ہے ان کے اسلوب میں متنوع خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔ وہ موضوع کی مناسبت سے واضح الفاظ اور مؤثر اسلوب اختیار کرتے تھے اہل ادب فصاحت و بلاغت کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ اہم بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ کلام متکلم کی مراد اور موقع و محل کے مطابق ہو۔ تاکہ قاری کے ذہن میں آسانی سے اتر جائے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے بہت سے اہل قلم عاری ہیں۔

اس سلسلے میں قابل غور چیز یہ تھی کہ چودھویں صدی ہجری کے بعد سے عہدِ جدید کے آغاز تک عربی ادب و انشاء پر تکلف و تصنع، عبارت آرائی اور دقت پسندی کا رجحان غالب رہا۔ جس سے عہدِ انحطاط کے کم ہی ادباء اور اہل قلم محفوظ رہے، وہ لوگ جو اس روش سے ممتاز تھے ان میں ابن خلدون کا نام بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر میں لفظی و معنوی دونوں خوبیوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی علماء میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ طرز اختیار کیا ان کے علاوہ جن لوگوں نے یہ اسلوب اپنایا تھا ان کی تعداد بہت کم تھی۔

ہندوستان میں عربی زبان کو وسیلہ اظہار بنانا مشکل کام تھا اس لیے کہ عربی اس ملک میں تقریر و تحریر کی زبان نہ تھی عربی میں وہی شخص آسانی سے بات کر سکتا تھا جسے زبان و بیان پر کافی قدرت حاصل ہو خواہ اس لیے کہ عربی اس کی مادری زبان ہو یا اس نے عربی تحریر کے مختلف اسالیب اور مشہور اہل قلم کی نگارشات عالیہ کا مطالعہ کیا ہو۔ جن میں عربی زبان کو سہل بنا کر پیش کیا گیا اور انہیں عربی انشاء کے جدید اسالیب کی پوری وضاحت کی گئی اس سلسلہ میں ان کی کتاب ”القرأة الواضحة“ کا سیٹ اور عربی کے رائج الفاظ کی ڈکشنری ”القاموس المجدید“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا وحید الزماں نے عربی زبان کی بقاء و تحفظ اس کے ارتقاء کے لیے کافی جدوجہد کی اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اس زبان میں تعبیر کی پوری قدرت اور ملکہ حاصل کر کے اس بات کا ثبوت دیں کہ یہی وہ واحد زبان ہے جو مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو کر ان کے اندر اتحاد و یگانگت پیدا کر سکتی ہے چنانچہ ”دعوة الحق“ کے ادارہ میں مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے انکی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

ان مشكلتنا الكبرى التي يواجهها المسلمون في جميع اقطارهم ان من يقوم فيهم راعيا او ناصحاً مرشداً او مصلحاً يريد ان يحصد مساء ما يبذر صباحاً ولم يحصل له لحد الآن بذر يحقق له امنية فهو آيس وقانط، ولا يرضى ان يزرع اويبد وللجيل القادم ، فيسقى ذرعه بد مائه لا ينتفع به نفسه بل يستفيد من ياتي بعده

وللمسلمين عبرة في حياة كثير من الاله ، التي كانت متخلفة . ولكهنا ضحية و لم تملأ الآفاق هتافاً ، عملت بصبر و وضعت خططاً طويلاً المدى ، ولم يحرص العاملون على جنى الثمار لا نفسهم ، انما هم غرسوا لا بناء هم و احفادهم . فما توا في جهاد و عسر و ضيق ، ولكهنم مهد والطريق الى المستقبل

الزاهر لجيلهم القادم فاصبحوا قوماً راقياً قائداً ليفكر دعاة المسلمين ملياً -  
 وليضعوا لهم مشاريع طوية المدى للاصلاح والتطوير. ويصرفوا طاقاتهم  
 لاعداد الشباب المؤمن وتكوين جيل المسلم الغيور ؟ (۱)

مولانا کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کتنی متانت، وضاحت و بلاغت، معنویت، حدت اور تازگی  
 ہے، عبارت تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ جملوں کی ساخت اور الفاظ کی نشست میں بڑا حسن و رعنائی اور دلکشی ہے۔  
 بسا اوقات وہ موقع اور محل کی مناسبت سے ایسے منتخب فقرے استعمال کرتے ہیں جو کافی دلچسپ اور معنی خیز  
 ہوتے ہیں۔

مولانا عربی زبان میں کسی ایک موضوع کے پابند نہیں تھے بلکہ مختلف موضوعات پر لکھتے۔ کبھی وہ علمی  
 مقالے لکھتے تو کبھی کتابوں پر مقدمے سپرد قلم کرتے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر تقریباً سو سے زیادہ مضامین  
 تحریر کئے جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین و مقالات کے مطالعہ سے آپ کی علمی وسعت میں  
 گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں ہر قسم کا مواد موجود ہے اور عوام و خواص سب کے لیے بے  
 حد مفید ہیں۔ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مذہبی مسائل اور تاریخی  
 عقدے حل ہوتے ہیں۔ اخلاق و عادات کی اصلاح کے لیے بھی وہ بے حد مفید ہیں۔ بہت سے مشکل سوالوں کے  
 تسلی بخش جوابات بھی ان میں موجود ہیں۔ ان میں علمی حقائق بھی ہیں اور علمی لطائف بھی، ان میں درد بھی ہے اور  
 سوز بھی، ان میں دلچسپی بھی ہے اور دلکشی بھی، غرض مولانا وحید الزماں صاحب کے یہ مضامین و مقالات ایک سدا  
 بہار گلدستہ ہیں جن میں ہر رنگ اور ہر قسم کے خوشبودار پھول موجود ہیں۔

آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ قوم میں پھیلی تمام کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ خواہ وہ سیاسی ہو  
 یا سماجی، ادبی ہو یا اصلاحی ہر میدان میں آپ نے زور آزمائی کی۔ سیاسی، سماجی، اصلاحی، ادبی، اور تعزیتی، ذیل میں ہم تمام  
 مضامین کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

### سیاسی مضامین

مولانا وحید الزماں کی پوری عمر اگرچہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ہی گزری ہے اور کبھی سیاست  
 میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں دکھائی۔ کبھی کسی سیاسی جماعت سے باقاعدہ وابستگی بھی نہیں رہی لیکن اس کے باوجود اس  
 میدان میں آپ کی معلومات کافی وسیع تھیں اکثر مضامین میں آپ کی سیاست میں وسعت گہری معلوم ہوتی ہے۔  
 ایک چیز جو تمام سیاسی مضامین میں یکساں معلوم ہوتی ہے وہ مسلم قوم کی خیر خواہی ہے۔ کیونکہ اگر آپ حکومت کے  
 خلاف لکھتے ہیں تو مسلمانوں کی پریشانیوں کو مد نظر رکھ کر لکھتے ہیں۔ کبھی عرب قوم کی نااہلی، اور آپسی نا اتفاقی کے

باعث یہود کا ان پر غلبہ و تسلط، کبھی ہندوستانی حکومت کا مسلمانوں پر ظلم و استبداد کبھی مسلمانوں کی مایوسی و جہالت کا ذکر کرتے یہی چیزیں آپ کی موضوع بحث ہوا کرتی تھی۔ آپ کا قلم ہر قسم کی فرقہ پرستی کے لیے شمشیر برہنہ تھا، انھوں نے اپنے خون جگر کو اپنے قلم کی سیاہی بنا کر مسلم قوم کے اندر بیداری اور ایک پریشان طبقہ کو نئی زندگی دینے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کے ساتھ نا انصافیوں کی نشاندہی کر رہے ہیں چنانچہ ایک جگہ ”العدوان الاثیم“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”قد وقع عدوان اسرائیل ومن ورائها امريکا و بريطانيا في الخامس من يونيو على الدولة العربية الثلاثة“ الجمهورية العربية المتحدة “ الاردن وسوريا وما ان حمى و طيس المعركة حتى كشفت الاوضاع السائدة فيها عن مؤامرة عربية واسعة النطاق دبرتها القوى الاستعمارية مع اسرائيل للقضاء على الحركة التحررية السائدة في البلاد العربية و تحطيم القوى النامية والتقدمية فيها احتفاظاً باسرائيل فانها وليدة بريطانيا و ربيبة امريکا.

ان هذه القوى الطاغية نظراً الى فشلها الذريع في معركة السويس في هجومها السافر ورجوعها بالخذ لان غير اسلوب الهجوم الثائري هذه المرة فالقت ستار الحياة على وجوهها الكالحة وحاربت الدول الثلاث.

آگے آپ نے بعض ان اسباب کا بھی تذکرہ کیا ہے جو عرب قوم کی ہزیمت و رسوائی کا باعث رہی ہے اور جن کی وجہ سے عرب قوم پستی کی طرف جا رہی ہے:

- (۱) انتشار صفوف العرب وتمزق وحدتهم
- (۲) عدم التضامن والتعاون في استخدام الوسائل الطبيعية التي وهبها الله لهم جغرافياً واقتصادياً و دينياً
- (۳) عدم التخطيط الحربى الموحد و انعدام التعظيم العسكرى في قيادة واحدة محكمة
- (۴) عدم التوافق بين الميول والاتجاهات السياسية وتشعت المسالك فيها
- (۵) صرف الطاقات في آثاره النزعات الاهلية وبذل القوى في الدعايات من دولة ضد شقيقها و ذالك ما خدم صالح الصهانية والاستعمارية
- (۶) عدم الانتباه لسلاح الاستعمارية (فرق تسد) وعدم مقاومة هذا سلاح بسلاح التضامن والتأخى الذى يكون ضربة نهائية على القوى العربية

## الاستعمارية ونواياها الميثة

- (٧) عدم التعاون المالى والفنى الصناعى فيها بين الدول العربية والاسلامية على نطاق واسع فاذا كانت عند واحدة امكانيات متوفرة وعند الاخرى فن وخبرة ولا تعاون بينهما فكل منهما بدون الآخر عالة على الاجنبى وان تدعيم الصناعات والتجارات فى البلاد العربية مع التعاون الاقتصاد الكبير بينهما يقضى على مصالح الاستعمار فى الشرق الاوسط ويضمن الاستقرار و النجاح للامم العربية فى المجال الحيوى كما يكون سبباً لضعف اقتصاد اسرائيل انهيار وجودها فى البلاد
- (٨) شيوع التحليل و الخرافة الغربية بالانعكاف على الماديات، والزخارف، والانشغال بالترف والتنعيم بين طبقات ال اثرياء والخنوع للتقليد الاعمى للغرب فى كل شىء بين الشباب والفتيات وتنازلهم عن مقوماتهم الشخصية العربية الاسلامية ومنابت الفردو المجد
- (٩) تلاشى النخوة العربية الدينية التى يصعب معها الخنوع للغالب والتقليد له فى الخير والشر

(١٠) ازمة الثقة بالنفس والايمان والقدرة على خوض المعركة اعتماداً على

الله و بروج الجهاد فى سبيله مع العدو اللازمة الى حد مستطاع (١)

عرب اسرائيل کے تنازع میں دارالعلوم کے موقف کی وضاحت کی۔ اس معرکہ میں دارالعلوم نے عرب قوم کی تائید و حمایت کھل کر کی اور عرب قوم کو یقین دلایا کہ علماء دارالعلوم آپ کے ساتھ ہیں اور فلسطین پر یہود کا غیر قانونی قبضہ اور ترکی کی اسلامی حکومت کے خلاف برطانیہ کی بمباری ان تمام مضامین میں اہل دارالعلوم اور ہندوستانی مسلمان جان و مال اور ہر اعتبار سے اہل عرب کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں اسی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

”كانت دارالعلوم رجالاً واساتذة وطلبة فى نشاط ملموس وحركة دائبة لجمع التبرعات للاخوان الاتراك المنكوبين وأقيمت لنفس الغرض “ لجنة الهلال الاحمر “ فى الدار وتبرع طلبتها بمبلغ خطير بالنسبة الى مستواهم الاقتصادى ووجه مدير الدار بياناً صحفياً الى جميع الصحف والمجلات فى الهند يناشد فيه قيامهم جنباً بجنب لاخوانهم العرب فى محو

آثار العدوان الصهيوني من ارض العروبة والا سلام والاسترجاع نالت  
الحرمين والاراضى العربية السلبية وحقوق شعب فلسطين الشرعية من  
المتحليين و الغاصبين و آثار غير تهمة الدينيه والعاطفة الاخوية ورجاهم ان  
يسخواتبرعات مالية اسهاماً فى تأدية الواجب المقدس(۱)

مولانا کا مزاج تھا کہ جب بھی کوئی برائی سامنے آتی اور اس سے مسلم تہذیب پر برا اثر پڑتا ہو تو اس کا قلع  
تق کرنے کیلئے اپنے قلم کا تیر استعمال کرتے اور اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتے اور اسے روکنے کی پوری پوری سعی  
فرماتے۔ مثلاً مغربی سامراجیت جس نے پوری دنیا میں اپنی تہذیب کو پھیلانے اور پوری دنیا پر اپنا تسلط جمانے کے  
لئے جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کا دوسری قوموں پر بہت اثر ہو رہا تھا، مسلم قوم بھی اس کے چنگل میں پھنستی جا رہی تھی لہذا  
اسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”ان الاستعمار الغربى اخذ منا اللب واعطانا القشور لتعامل بها فى  
حياتنا المز خرفة الجوفاء ولم يعطنا الاجزاء يسراً قافها بالنسبة الى ما اكتسبه  
منا وما حباننا الا ما يعود علينا بالوبال والخسران ويقضى على منابع طاقتنا  
ومصادر افكارنا، نبدل عقلنا الشرق الاسلامى بالعقل الغربى الالحادى وامات  
فيما اشياء جوهرية باسم اليقضة والنهوض وافقدنا الشعور بالواجب  
والتقدير لشخصيتنا الاسلامية وادراك مالها من المزايا الجليلة والمسئوليات  
الضخمة ايقظ فينا الشهوات الجسد ونزعة الانكباب على منع وسؤل لنا ان  
ذلك هو التقدم والنهضة والحضارة والثقافة وشتان بين الامرين  
اس مضمون کے آخر میں استعماريت کے غلبہ کو جو لوگوں کے ذہن میں رچ بس گیا ہے ختم کرنے کے لئے  
ذمہ دار لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے تجزیہ پیش کرتے ہیں:

”فمن واجب القادة واتباعهم ان يحطمو اغلال الاستبعاد الفكرى فى  
اول فرصة سانحة ويجعلو احريتهم مكتملة الجوانب لا تشويهاً شائبةً من  
عبارة الاستبعاد والسيطرة الاجنبية يجب ان تكون احراراً بالمعنى الصحيح  
فى بناء حياتنا و وطننا على أسس فكرية سليمة مما توارثنا من تاريخنا  
الاسلامى العظيم وتعاليم الكتاب والسنة كئى يكون بين الحرية والحرية بين  
الحياة والحياة فارق محسوس ملموس للناس (۲)

۱- ”دعوة الحق“ ج ۳، شمارہ ۳، اگست ۱۹۶۷ء ص ۱۶۔

۲- ”دعوة الحق“ ج ۴، شمارہ ۳، مئی ۱۹۶۸ء ص ۳۔

آپ کے مضامین اکثر عرب سیاست پر مشتمل ہوتے تھے۔ ہندوستانی سیاست پر تبصرہ بہت ہی کم کرتے عرب سیاست پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہنے کی ایک وجہ عرب اسرائیل دشمنی اور اسرائیل کے مقابلے میں عرب قوم کی پسپائی عرب قوم میں انتشار آپسی دشمنی یہی وہ اسباب تھے جو آپ کو بارہا عرب قوم کو بیدار کرنے اور ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کیلئے ابھارتے تھے چنانچہ اپنے ایک مضمون ”روح الوحدة والتضامن في المواقف العربية“ میں آپ نے عرب قوم کو اس بات کا احساس دلایا کہ ان کے آپسی اختلافات دور ہو جائیں اور تمام ملکوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے تو بڑی سے بڑی طاقت ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ امت عربیہ کو آج جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ صرف اسلام کی وجہ سے ہوا اگر وہ اسلام کے لئے اپنی جان و مال کی قربانی نہیں دیں گے تو اللہ رب العزت یہ عزت و فخر ان سے سلب کر سکتا ہے اسی کو تحریر کرتے ہیں:

”ان الامة العربية اكتسبت كل ما اكتسبت من العز و الفخر في ماهيتها من دين الاسلام الذي رفع شانها واعلى كلمتها وجمع شملها والفتنات فتقلت خير دروس في ساحة الشرف ومنصة البروز من تعاليم الاسلام البراقة وهذا الدين هو الذي سلب توحيد شعوب مختلفة الاجناس واللغات والحضارات فذابت خصائص هذه الشعوب الذاتية الوطنية تحت تاثير دعوة الاسلام وبرزت الى افق العالم من جديد كامة واحدة في عنصرها ولونها ودينها وعقيدتها حتى وفي لغتها وثقافتها فلا شعب حجازي ولا نجدى ولا عراقى ولا شامى ولا مصرى ولا تونسى ولا لیبى ولا مغربى ولكنها كلها شعب عربى وبعبارة أخرى شعب اسلامى فان الاسلام هو الذي جعل هذا الشعوب المتعددة مصبوغة بصبغ واحد فاذا كان قوام شخصية هذا الامة العربية الاسلامية الى جوهرها واصلاها وتجسد باعمالها اولاً واقوالها ثانياً الهدف الوحيد“۔

آپسی نا اتفاقی اور انتشار کا سب سے بڑا نقصان یہ اٹھانا پڑا کہ دشمن ایک معمولی طاقت کے باوجود ہمیشہ کامیاب ہو تا رہا ہے اور ایک بہت بڑی قوم کو اس نے پسپا کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

”كان العدو ناجحاً في سياسة تفرقة بين العرب و المسلمين اكثر مما كان في جهة القتال اذ جند اقلام كثيرين من المسلمين لخدمة الاهداف ومصالحة وكانت هذا الاقلام منفث السموم وترمي قذائف السباب الشتم وتمطرو ابلاداً من الاتهامات على القادة العرب والجنود العرب عن عمدٍ او غير عمدٍ كما كان كثيرون من المخدوعين فتطاول السنتهم دائماً بالطعن في الشخصيات العربية ورميها بالكفر والحادو الفسوق عن الايمان ففي عام

سبع و ستين ۶۷ء حينما اصابت القوات الحربية نكسه ومناغة بل مخادعة من قبل الاعداء وقفت المعركة بصورة مفزعة وموقته ولكن احتدمت معركة حامية في صفوف العرب والمسلمين يتهم بعضهم بعضاً وينال من عرضه و يغزو عقيدته ويهجم على نيته دون رحمة ولاوعى وهكذا كانت التفرقة بعد المعركة اشد ماكانت قبلها (۱)

### اصلاحی مضامين

مولانا کی وسعت نظر جہاں سیاست میں نہایت ہی دقیق تھی وہیں دوسری طرف آپ نے عوام کی اصلاح کے لئے بھی مؤثر اقدامات کیے خاص طور سے عرب اور علماء کے لئے نو آپ نے بھرپور کوشش کی کیونکہ علماء ہی تمام امت کے لئے نمونہ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف لوگ عربوں کی بھی زیادہ تقلید کرتے ہیں لہذا آپ نے انہیں کی اخلاق و کردار کی اصلاح کے لئے بیڑہ اٹھایا اور اکثر و بیشتر اپنی تحریروں کو انہیں کے لئے خاص کر دیا، آپ کی تحریریں نہایت ہی دلسوزی کی نصیحتوں اور بلند ترین اخلاقی نکات سے بھرے ہوئے حکیمانہ نکات سے لبریز ہوتی اگر ان تحریروں کو اخبار و رسائل سے علیحدہ کر کے ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ ہماری درستی اخلاق کے لئے بہترین دستور العمل بن سکتی ہیں ایک جگہ امت کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو دور کرنے کی نصیحت فرماتے ہیں:

”رحم الله هذا الامة تملك من الثروات الخالدة ما لا نفاذ له ومن الطاقات ما لا حفاف لنا بيعه ولكن هاتسعى الى السراب كئى تطفى به ظمأها وتعدوا الى القشور كئى تتخذها غذاء اصيلاً و تهرع الى الظلام لتأخذ منه سبيلاً الى النور وتهطع الى الغمام كئى تستظل به الى الابدك وتجافى العدو واللذود و تخلص له الوفاء و تبذل له الولاء ليهدىها الى طريق النظر و مصدر الطاقات والاختصارات بالنعاسة والشقاوة“ (۲)

اسی طرح ایک جگہ بڑے بڑے شعراء علماء اور فلاسفہ کی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے دنیا میں اگرچہ بہت ہی شہرت پائی ہے اور آج بھی وہ لوگ پوری دنیا میں مشہور ہیں لیکن یہ تمام عظمت و شہرت انسانی زندگی کے لئے نمونہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے زندگی کے صرف ایک ہی پہلو کو سامنے رکھا ہے اور ان کی زندگی صرف ایک ہی صفت کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئی، جب ہم حضور کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس

۱- ”دعوة الحق“ ج ۹، شمارہ ۴، فروری ۱۹۷۴ء ص ۷۔

۲- ”دعوة الحق“ ج ۴، شمارہ ۳، مئی ۱۹۶۸ء ص ۳۔



میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے حیاتِ انسانی کے کسی گوشہ کو نہیں چھوڑا ہے اور تمام پہلوؤں کے بارے میں ہمیں سبق دیا ہے۔ چنانچہ ذیل کی عبارت میں اسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”لقد كان هو ميروس اليوناني شاعراً عظيماً عبقرياً ذاع صيته في دائرة الشعر واما افلاطون وارسطاطا ليس فقد كانا فيلسوفين عظيمين ذاعت شهرتهما في الآفاق بسبب آثارها الخالدة في الحكمة و آداب الاجتماع ولكنها لم ينبغافي النواحي الاخرى من الحياة الانسانية نبوغاً يعتد به ولكننا اذا معنا النظر في حياة سيد المرسلين عليه الصلوة والسلام وردسناها من كل نواحيها نجدها انها جمعت اسمى الصفات الانسانية واعظمها فائدة للمجتمع الانساني لجميع طبقاته، ولا جل ذلك كان عليه الصلوة والسلام خير اسوة الناس كافة يسيرون على سنة ويهتدون بهدية قال الله تعالى لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة“ (۱)

مولانا بار بار علماء کو اپنی تحریروں کے ذریعہ امت میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں اور علماء کے اندر کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے اور ان کو ان کی ذمہ داری یاد دلاتے اور ان کے مقام و مرتبہ کی قدر کرتے ہوئے ان کی رہنمائی بھی فرماتے، چنانچہ ایک مضمون جس کا عنوان علماء کے لئے ہی مخصوص ہے ” واجب العلماء فی وقت الراهن“ کے تحت لکھتے ہیں:

” ان واجب العلماء في الظروف الراهن بصورة عامة وواجب العلماء في البلاد العربيه والاسلامية بخاصة قد تتضخم اليوم بالسنبه للامس ولا تزال تتضخم مستوليائهم في العصر الحديث وتتضاعف يوماً فان الامة قد انحرفت ركبها عن الصراط المستقيم واتجه اتجاهها منعوجة تؤدى بها الى الها لك ، والقادة والزعماء الياسيون لن يقودوا هذاالركب الانساني العظيم عن قصد او جهل قيادة رشيدة مكفولها بالعز والكرامة. آخر میں فرماتے ہیں:

” قد آن الوقت وتحتم على العلماء ان يتركوا الدعة والحياة المريحة المنعزلة عن الشعب وابناء الوطن ويتخلوا عن المناصب المصطنعة والمظاهر الرسمية يعودوا الى منصبهم الجليل الذي شرفهم الله به في فضليته فلا

يصرفوا وقتهم الثمين وطاقتهم في حكومة وقائدة ولا يمنعهم عن الجهر  
 بالحق ملك ولا رئيس امير ولا سلطان“ (۱)  
 غرباء، مساکین اور فقراء کی رعایت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ صاحب حیثیت انسان کو چاہیے کہ مساکین اور  
 فقراء کا خیال رکھیں اور جہاں تک ہو سکے ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ فرماتے ہیں:

من اهم البواعث الخیر فی الانسان ان يستشعر فی نفسه الشفقة  
 ویفیض رقة و حیاتاً علی کل بائس ضعیف و یندفع بکل جوارحه الّتی  
 بحنیف ویلات المضطربین و مسح ودموع الیتامی و المعوزین والترفية عن  
 عضهم الفقر بنایة. واناخ علیهم الدهر بکلکله فافقد عزهم و جوفهم وجاههم  
 اذلا یعنی بمواساة الناس الامن تغلبت علیه عاطفة الشفقة والرحمة فكان  
 للتخیر نصیراً. والواجب ان یساعد المرء والمحرورمین بامدادهم بما هم فی  
 حاجة الیه وان یطعمهم الخدم مما یاکل منه، وان یمد یدالمساعد لذوی العاهات  
 والا مراض الّتی تعوقهم عن الکسب فیغنیهم علی المعیشة فی هذا الحیاة  
 وهناك أناس قد ملأت الرحمة قلوبهم انشؤ جمیعات خیرية لمساعدة الضعفاء  
 والفقراء فقامت هذه الجمعیات بانشاء المدارس لتمهد لهو لآء المساکین طریق  
 المعیشة وتذلّل لهم“ (۲)

آپ عقیدہ و عمل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی دن بدن زیادتی ہوتی جا رہی ہے جن  
 کے قول و فعل میں تضاد ہے ان کا عقیدہ کچھ اور ہے اور عمل اس کے خلاف ہے، اسلامی اصولوں پر یقین تو رکھتے ہیں  
 لیکن ان پر عمل نہیں کرتے:

ان الذی اعلن ایمانه بالله التزم علی نفسه جمیع ماتقتضی کلمة  
 الايمان فهو اقرار باللسان و تصدیق بالجنان، والتصدیق بالجنان یقتضی  
 العمل بموجبة فان العمل کترجمان للعقيدة ومظهر صحیح لها ومن غیر عمل  
 بماء المرء تقتضیه لعقيدة یكون تدینہ مجهولاً ولا یعتد به مستجیباً لله، ان  
 الممتدین بعقیدته دون عمله یكون متناقضاً مع نفسه اذ کیف یكون مصداقاً  
 بقلبه ومتخلفاً عن العمل بمقتضی ایمانه ثم یكون علی الايمان المنشور۔

۱- ”دعوة الحق“ ج ۵، شمارہ ۱، فروری ۱۹۶۹ء ص ۵۔

۲- ”دعوة الحق“ ج ۹، شمارہ ۲، مئی ۱۹۷۳ء ص ۴۸۔

ان العقيدة من غير عمل ككنز مدفون لا يعرف سبيله ولا اثر له خارجاً  
فهو شبه بالمعدوم حتى يكون له مظهر وجودي كما يريد الله .

ان من المسلمين في عددهم الغالب يكتفون بمجرد العقيدة كأنهم في  
غنى بعد ذلك عن كل التزام وعمل وانما هم متناقضون في ذلك يعلنون  
بلسانهم ، الايمان بالله ، والتدين بدين الاسلام واما اعمالهم فهي لا تتوافق مع  
اعلا نهم بل هناك تناقض يظهر في سلوكهم في جميع شعب الحياة انه لا ايمان  
لهم بالله ولا اعتماد عليه ، اليس هذا غدرآ بالعهد الذي التزمناه على السنتنا  
بقولنا ”آمنا بالله“ وهل يكون العذر بآية صورة كان معفوآ عليه ؟“ (۱)

## وفیات

ادب میں وفیات نگاری ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس پر فن کی حیثیت سے کبھی گفتگو نہیں  
کی گئی ، بادی النظر میں اس کا تعلق صحافت سے معلوم ہوتا ہے اور بلاشبہ ”وفیات“ کے متعدد جملے محض وقتی اور  
عارضی ہوتے ہیں لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سوانح اور خاکہ کا مزاج اور انشائیہ کی زبان و اسلوب  
کے ساتھ ساتھ ایجاز بیان و اسلوب کی روانی اور کمال تاثیر کے عمدہ نمونہ ”وفیات“ ہی سے دستیاب ہو سکتے ہیں  
وفیات میں دو چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اول جس میدان کا وہ مرد تھا اس کی مہارت کا دل کھول کر  
اعتراف اور قابل فخر کارناموں پر اظہار تحسین کیا جاتا ہے اس کا ایک ایک لفظ جچا ملا اور معنی خیز ہوتا ہے یہ دونوں  
عناصر ادبی صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اور انہیں پیش کرنے کے بعد مبالغہ آمیز طریقہ پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس  
شخص مذکورہ نے جو جگہ خالی کی اس کا پر ہونا دشوار ہے اور آخر میں مذہبی معتقدات کے تحت اس مرنے والے کی  
عافیت کی بہتری کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

وفیات دو قسم کی ہوتی ہے (۱) صحافتی اور اطلاعی وفیات ان کا تعلق عام اخباروں سے ہوتا ہے جن میں آئے  
دن یہ خبریں کس و ناکس کے لئے آتی رہتی ہیں۔ (۲) ادبی وفیات اس کو بھی دو شقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱)  
لائٹ لٹریچر یا تفریحی رسائل میں پیش کی گئی رسمی وفیات (۲) دوسری قسم ان ادبی وفیات کی ہوتی ہے جنہیں کوئی عالم  
یا ادیب علمی یا ادبی رسالوں میں بطور خاص لکھتا ہے اور پوری ادبی شان و شوکت کے ساتھ اس کی شخصیت کے مختلف  
پہلوؤں کو ایک ہی نظر میں اجاگر کر دیتا ہے ، مولانا وحید الزماں کی تحریر کردہ ”وفیات“ کا تعلق اسی قسم سے ہے ، چونکہ  
مولانا وحید الزماں مختلف رسائل کے مدیر تھے اور ان کے زمانہ ادارت میں سینکڑوں ان لوگوں کی وفات ہوئی جن  
سے وہ واقف تھے اور کسی نہ کسی اعتبار سے وہ قابل ذکر شخصیات تھیں۔ ان میں آپ بزرگ بھی ہوتے ، ہم عمر

بھی، خالص سیاسی شخصیتیں بھی تھیں خالص مذہبی بھی ان میں خادم قوم بھی تھے اور شاعر و ادیب بھی عالم اور محقق سبھی شامل تھے، ”دعوة الحق“ الکفاح، الداعی اور القاسم جدید کے شماروں میں اظہار تعزیت کے ایسے مضامین بکھرے پڑے ہیں جن پر آپ نے خامہ فرسائی کی ہے۔

مولانا وحید الزماں کے ادبی شعور کی پختگی و تابناکی کے ساتھ ساتھ ان کی وفیات میں بتدریج ارتقاء ملتا ہے ”دعوة الحق“ کے شروع کے شماروں سے ہی اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو آپ کی ادارت کے خاتمہ پر ہی تکمیل کو پہنچتا ہے، مختلف قسم کی شخصیات پر لکھی گئی۔ مولانا کی ”وفیات“ کے صرف چند نمونہ ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں، مثلاً علامہ بلیاویؒ کی وفات پر ایک تعزیتی مضمون میں لکھا جس میں آپ نے ادبی کمالیت کو عروج پر پہنچا دیا۔

”رجل مات ولا عجب فان الموت آت لا محالة“ کل نفس ذائقة الموت “

ولكن الذى توفاه الله الى رحمة لم يكن شخصامات كما يكون كما يموت كثير من الاحياء كلا ان وفاته كارثة اهتزت لها الا وساط العلمية والدينية و تفجعت لها آلاف و آلاف من القلوب وبكت لها آلاف و آلاف من العيون ،انها موت رجل دفنته ايدى الناس تحت اكوام من التراب فدفنت معه خزائن العلم و ذخائر اسرار الشريعة والفلسفة والا سلامية، وجفت تلك الينابيع التى استقى منها عشرات آلاف من العلماء فى الهند وباكستان والبلاد الاخرى وارتوى منها الاساتذة والمدرسون فى دارالعلوم وخارجها فياله من رجل عظيم وياها من خسارة كبرى ! يتسألون فى شبه ذهول من مات؟ مات أب جاني، مات شيخ كبير مات مربى عطوف، مات استاد عبقرى، مات عالم محنك ،ذلك العالم النحرير الذى عاش القرن الثالث عشر الهجرى الطويل فشهد الاحداث والكوارث والتطويرات الفكرية والانقلابات السياسية فارتبطت به حلقات من سلسلة تاريخ دارالعلوم الزاهر وجمع صفحاته المشرقة بين الدفتين من ذاكرته و صدره الواسع وافاض منها على كثير من الناس .

ذلك العالم الذى احتفظ بتراث استاذته العبقريين من العلم الراسخ والعمل الصالح و الحكمة البالغة وبساط فى العيش وتواضع فى الحياة ” ذلك الرحيل الذى عرفناه وعرفه رجال العلم والدين بالعلامة ”الشيخ محمد ابراهيم البلياوى “ رئيس هيئة التدريس ومدير الشؤون التعليمية بدارالعلوم ،ذلك الرجل الذى نعت بوفاته دارالعلوم والا وساط العلمية والمؤسسات الدينية

فی الساعة الحادية عشرة والنصف من ۲۴ رمضان المبارك شهر البركات  
والبشارات والرحمة والغفران فاهتزت ارجاءها وعمها من الحزن والاسى  
ماتتقطع له القلوب۔“

پھر مرحوم کی صفات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

كان المغفور له متضلعا في العلوم العقلية والنقلية وخاصة في الفلسفة  
الاسلامية فذاع صيته في جامعية دروسه وندرة اسلوبه الاستدلالي في  
التدريس، كان درسه في الحديث نموذجا لقلة الكلمات في وسعة المعاني  
واستيفاء المباحث واستيعاب الجوانب، وهبه الله علما واسعا وعقلا راجحا  
وقوة في التفكير والاستنباط وتوقدا في الذهن والذكاء يحل العويصات و  
المغلقات لغاية البساطة ويوضحها بالامثلة البديهة وكان دروسه شبه محاضرة  
علمية مركزة تخلو عن التكرار والحشو وتحفل بجوهر المسألة ولباب الموضوع  
الاصيل ينتفع بها حق الانتفاع التلاميذ الاذكياء والمدرسون (۱)

مصر کے صدر اور سپہ سالار جمال عبدالناصر کی وفات پر بھی آپ نے ایک تعزیتی مضمون لکھا، چونکہ جمال  
عبدالناصر سے مولانا بہت متاثر تھے ان کی نظر میں وہ اسلام کے سچے ہمدرد اور مجاہد تھے۔ ان کے خیالات سے مولانا  
پورے طریقہ پر متفق تھے۔ اسی تاثر اور لگاؤ کی وجہ سے آپ نے جمال عبدالناصر کی وفات پر ایک مختصر مگر ادبی  
حیثیت سے باکمال اور فصیح و بلیغ مضمون لکھا اس کا عنوان تھا ”الراحل العظيم جمال عبدالناصر“ اسی مضمون کا  
بعض حصہ ہم یہاں پر نقل کرتے ہیں:

”فی الثامن والعشرين من ستمبر الماضی الموافق السابع والعشرين  
من رجب وجئ العالم والامة العربية خاصة بوفاة القادة المغوار والزعيم  
المقدام المغفور له الرئيس جمال عبدالناصر رئيس الجمهورية العربية  
المتحدة اثر نوبة قلبية حارة أصيب بهابعد انتهاء آخر مراسم مؤتمر القمة  
العربی الطاری للملوك ورؤساء الدول العربية الذى انعقد فى القاهرة۔

وكانت وفاته الیمة تفجعت لها قلوب العرب والمسلمين وبكت عليه  
عشرات الملائين من العيون وذرفت دموعاً من الدماء على الفقيد العظيم الذى  
كان وحيد عصره فى قيادة قافلة الحرية وفريد دهره فى مقاومة الاستعمار  
الذى شاء وحاول جهده فى كل زمان ومكان ان يقضى على شخصية المسلم

وشوكة الاسلام ويفت في عضده وينخر جسمه متظاهراً بالوان من الود والصدقة فاقض الراحل العظيم مضجع اعداءه ونهض بشعبة وتفانى في بناء حياته واستر جاع مجده وكافح لبياده وللنهوض بالامة العربية كفاحاً مريراً حتى فارق الدنيا وهو تارك وراءه مجموعة اعمال خالده وبطولات منقطعة النظير وحسبه انه فتح في التاريخ باباً جديداً للصعود امام الطاغى والنهوض بالضعيف والخدمة للوطن والامة والانسانية جمعاء تغمدہ اللہ بغفرانہ وجعل خدماتہ التي اداها في مجال الدين من نشر مجموعات قيمة وابحاث ودراسات مسهبة عن الدين السلامي بتأسيس المجلس الاعلى للشئون الاسلامية وادارة البحوث الاسلامية ونشر القرآن الكريم ووقايته من التحريف على ايدي الاعداء اليهود والنصارى زاده لا خرتہ وسبباً لغفرانہ وعوض الامة العربية وكذا الشعب المصرى عن الراحل العظيم من يأخذ بيدها ويقودها الى مافيه مجدها وخيرها“ (۱)

آپنے مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی کی وفات پر بھی تعزیتی مضمون لکھا اگرچہ یہ بھی صرف تعزیت کے لئے تھا لیکن بحیثیت ادب اس میں گرانقدر ادبی شہ پارہ موجود ہے، شروعات کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

”كانت المجلة على وشك الطبع اذ فوجئنا بنبأ مفجع يلتاع له القلوب وتبكي له العيون اظلم جو دار العلوم وساد الحزن والغم على سماء العلم ان سقط نجم لامع من نجومها توفي الى رحمة الله مولانا و امامنا الاستاذ الشيخ ”فخر الدين احمد“ رئيس هيئته التدريس لدار العلوم ورئيس جمعية علماء الهند طار خبر وفاته من مراد آباد (وطن اقامته) في ستة ابريل الماضى الى ارجاء الهند فهلعت القلوب وتقطعت فكانت كارثة ذات وقع كبير واثر عميق فى قلوب تلاميذه و مجيبة المنتشرين فى انحاء الهند وخارجها اذ تتلمذ عليه عدد كبير من عطاش علم الحديث من بقاع الهند وخارجها مدة طويلة وكان رحمة الله قدوة صالحة لاسلافه وبقية باقية لافاضل علماء دار العلوم جاهد لتحرير الوطنى جهاداً مريراً وكافح للاسلام كفاحاً متوصلاً وخدم الدين والعلم خدمته يعجز عن الاحاطة بها القلم واللسان، عطلت دار العلوم واكثر المدارس العربية فى ذلك اليوم“ (۲)

۱- ”دعوة الحق“ ج ۲، شمارہ ۴، نومبر ۱۹۷۰ء ص ۵۷۔

۲- ”دعوة الحق“ ج ۸، شمارہ ۳، اگست ۱۹۷۲ء ص ۵۸۔

اس طرح آپ کی تحریروں کے بیسیوں نمونے یاد رفتگان کی زینت بنے ہیں اور مذکورہ حضرات کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچا ہے، جس میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ خطابت بھی در آئی ہے، ایجاز و تفصیل دونوں ہیں اور ساتھ ہی قلم کا اعجاز بھی اور ظاہر ہے جب جذبات متلاطم ہوں اور قلم اپنی نیرنگی دکھانے پر آئے تو اس سے ایجاز بیانی کو جراحت پہنچتی ہے اگرچہ آپ نے بہت سے لوگوں کی وفیات لکھی لیکن ہر ایک کا انداز الگ ہے اور طرز بیان بھی جدا ہے اس کے باوجود آپ نے اس فن میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ آپ کی وفیات ادبی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔

## باب پنجم

ادبی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ

اصلاحی تصانیف

معاصرین کی نظر میں مقام و مرتبہ

دارالعلوم میں مولانا کے اثرات



## ادبی تصانیف

مولانا وحید الزماں صاحب کو قدرت نے جہاں بہت سی کوبایں عطا فرمائی تھیں وہیں پر تصنیف و تالیف کا نہایت عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا جس سے آپ زندگی بھر کام لیتے رہے۔ اور اس صدی میں آپ نے عربی ادب کی ترویج و اشاعت میں جو مہتمم بالشان اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں بلاشبہ وہ آپ کا تجدیدی کارنامہ ہے جس میں انکا کوئی سہیم و نظیر نہیں ہے، آپ کی عربی زبان کی خدمت صرف درس و تدریس تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ نے عربی زبان کی مخلصانہ خدمات کے لئے کئی لغات بھی مرتب کی چونکہ ہر زبان کی بنیاد اسکی لغت ہوتی ہے اگر زبان کی لغات محفوظ نہیں ہیں تو اس میں ممکن ہے کہ جو لفظ کسی خاص مقصد کے لئے موضوع ہو اس کی معنویت ہی ختم ہو جائے اور اس میں اختلاف پیدا ہو جائے اسی طرح ادوار و زمانہ کے گزرنے کے ساتھ زبان بھی تبدیل ہو جائے قدیم فارسی اور قدیم اردو کو اگر آج اٹھا کر دیکھیں گے تو دوسری زبان معلوم ہوگی یہی معاملہ عربی کے ساتھ بھی ہوا۔ آجکل سرزمین عرب کی زبان قدیم عربی زبان سے قطعاً مختلف ہے، لیکن مسلمانوں کا عربی زبان سے ایک مذہبی رشتہ ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے اسکی حفاظت کی اور سیکھنے سکھانے کا سلسلہ قائم رکھا اور اسکی حفاظت کو اولین درجہ دیا، چنانچہ اس پر علماء امت کا اتفاق ہے کہ عربی زبان کی حفاظت اسلامی فرائض میں سے ایک فرض ہے۔

چونکہ ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ زبان اظہارِ مافی الضمیر کا ذریعہ ہے اور اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جغرافیائی حالات سیاسی تغیرات اور تعلقات کی وسعت اس کی تبدیلیوں پر گہرا اثر ڈالتی ہیں اس کی واضح مثال ہمارے سامنے اردو زبان کی ہے کہ کس طرح ہندوستان میں اردو عالم وجود میں آئی اور کون نہیں جانتا کہ ابتداء میں اس کا کیا حال تھا اور کس طرح رفتہ رفتہ ایک مستقل زبان بن گئی پھر تدریجاً اس ترقی یافتہ حالت کو پہنچی جیسا کہ ہم آج دیکھ رہے ہیں یہی حال عربی زبان کا ہے، اگرچہ شروع سے لیکر آج تک وہ اپنی حالت میں بدستور ہے لیکن قوموں عروج کے سبب اس نے بھی ترقی کی ہے اور جیسے جیسے دنیا نے ترقی کی ایسے ہی عربی زبان بھی ترقی کرتی رہی ضرورت کے مطابق کتابیں اور لغات تیار ہوتی رہیں لڑچکر بڑھتا رہا یہاں تک کہ آج لغت کی کتابوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو گئی اور تمام کتابیں ایک دوسرے سے مختلف انداز میں پیش کی گئی ہیں اور ہر ایک کا ڈھنگ جدا ہے اس فن میں سب سے پہلی کوشش خلیل بن احمد کی ہے جنہوں نے ”کتاب العین“ کے نام سے ایک ڈکشنری مرتب کی یہ اس وقت کی نہایت عمدہ کوشش تھی اور اس میں انھوں نے حتی الامکان تمام الفاظ کو حسب استطاعت سمیٹنے کی کوشش کی تھی، اس کے بعد درید نے اس موضوع پر ”جمہرۃ العرب“ لکھ کر اضافہ کیا، پھر لوگوں کا رجحان اس طرف بڑھتا گیا اور ہر اجناس و اشیاء

پر ایک ڈکشنری مرتب ہو گئی جیسے جیسے ضرورت بڑھتی گئی ویسے ہی اضافے بھی ہوتے رہے ہر علاقہ اور ہر زبان میں عربی لغات کے تراجم بھی شائع کئے گئے تاکہ اس زبان کے لوگوں کو عربی کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے اور عربی لکھنے، پڑھنے اور سیکھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔ اس میدان میں ہندوستان میں سب سے پہلی کوشش حسن بن محمد الصغانی لاہوری کی ہے جنکی کتاب ”العباب الزاخر“ اہل علم میں مشہور ہے اس کے علاوہ ”فتۃ اللسان“ جسٹس کرامت علی کی اور ”المبین“ سلیمان اشرف کی اس موضوع پر ایک اچھی کوشش ہے لیکن جدید عربی ادب کی جو اصطلاح مشہور ہے اس میں سب سے پہلی کوشش سید سلیمان ندوی کی ”لغات جدیدہ“ اور قاضی زین العابدین کی ”بیان اللسان“ ہے یہی جدید اصطلاح کی بنیاد ہے لیکن ان میں جدت کا لحاظ بہت ہی کم کیا گیا ہے اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے بانی اصل مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی ہیں جن کی تالیف ”القاموس الجدید“ عربی اردو اور اردو عربی بیسویں صدی میں عربی زبان کی جدید اصطلاحات و محاورات کے موضوع پر ایسی وسیع لغت ہے جس پر ہندوستان کی عربی تاریخ فخر کر سکتی ہے یہی لغات یہاں پر جدید عربی ادب کی بنیاد تھی یہ دونوں لغات بہت سارے نئے الفاظ کا احاطہ کرتی ہیں جو آج کل عالم عربی میں اخبار و رسائل اور روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ کو محیط ہیں۔“ (۱)

### القاموس الجدید

مولانا وحید الزماں صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے ہی جدید عربی الفاظ کی لغت کی کمی کا احساس تھا اور عربی کے طلبہ کو درپیش آنے والی مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا، اس لئے زندگی کی اہم مصروفیتوں کے ساتھ اسکو اولیت دی اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ نے یہ اصول بنایا کہ جب بھی کوئی اخبار یا مجلہ ہاتھ آجاتا تو اس کی ایک ایک سطر کو غور سے پڑھتے، نئے الفاظ اور نئی تعبیرات پر نشان لگاتے پھر کئی مقامات پر دیکھ لینے کے بعد جب معانی کا تین ہو جاتا تو اس کو اپنے مسودہ میں شامل کر لیتے ڈکشنری مرتب کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے برابر سائز کے کاغذ کے ٹکڑے کاٹ کر ان پر الفاظ لکھتے تھے پھر ان کو حرفوں کے حساب سے الگ الگ ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے مکمل ہونے کے بعد ان کاغذ کے ٹکڑوں کو کاپی میں منتقل کرتے، نہایت سلیقہ اور نظم سے یہ کام کیا جاتا۔

مولانا کیرانوی نے اپنی ”القاموس الجدید“ کے لئے قدیم قوامیس کو ماخذ بنانے کے بجائے عربی کے یومیہ جرائد و مجلات اور قصص وغیرہ کی ایسی کتابوں کو ماخذ بنایا جن میں دنیا بھر کے طول و عرض کی سیاسی اقتصادی، معاشی، تعلیمی، فوجی، سرکاری، غیر سرکاری، ہر سطح کی خبریں عربی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھی اور ان سے نئے موضوعات و اصطلاحات کا بھی علم ہوتا تھا، مولانا کا معمول تھا کہ انکا بڑی دیدہ ریزی سے مطالعہ کرتے اور پھر اردو اخبارات و رسائل میں اس کا استعمال تلاش کرتے اور اس لفظ کے مروجہ معانی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند“ جون، جولائی ۱۹۷۷ء مولانا ابو العاص وحیدی ص ۱۵-۴۰۔

نکالتے، حسب ضرورت لغت کی قدیم کتابوں سے بھی مدد لیتے۔

اس کام سے مولانا کا خاص مقصد یہ تھا کہ عربی کے طلباء قدیم عربی الفاظ و اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے تو ”مصابح اللغات“ وغیرہ سے مدد لیتے ہیں لیکن کلاسیکل ادب سے ذرا آگے بڑھکر انہیں آج کی نت نئی ایجادات اور اصطلاحات کا بھی علم ہونا چاہئے تاکہ موجودہ ہند عرب تعلقات میں ہر سطح پر روز افزوں اضافے ذرائع معاش کے بڑھتے ہوئے وسائل کے پیش نظر مدد حاصل کی جاسکے۔

مولانا کیرانوی کی لغت کی تیاری میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود تنگ دستی اور حالات کی ناسازگاری کے اپنے کتاب کی تیاری کے لئے ایک خاص وقت معین فرمایا تھا صبح سے دوپہر تک کتاب کی تیاری میں مشغول رہتے پھر شام میں دوسرے کاموں کو دیکھتے، دن رات محنت کرتے کیونکہ یہ دور ابتلاء یا علمی زندگی کا بہت پریشان کن دور تھا اس کے باوجود مولانا خندہ پیشانی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے اور اپنے احباب تک کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے اس دور کے بارے میں مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ایسا پریشان کن دور تھا کہ میں نے بیس بیس گھنٹہ تک کام کیا تاکہ حالات پر سکون ہو سکیں پھر القاموس کی طباعت کے سلسلے میں آپکو کن پریشان کن مراحل سے گزرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ پوری کتاب کی ترتیب اور کتابت کے بعد جب کتابت شدہ کا پیاں ”کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی“ پہنچ گئی اور عنقریب طباعت کا کام شروع ہونے والا تھا کہ کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر میں چوہوں نے صرف ”القاموس الجدید“ کو ہی درمیان سے کتر دیا جبکہ دوسری کتابیں بالکل محفوظ رہی، چنانچہ آفت رسیدہ کا پیوں کو دہلی سے دیوبند لایا گیا اور انکے متاثرہ حصوں پر بطور پیوند دوسرا کاغذ چسپاں کرنے کے بعد دوبارہ طباعت کے لئے کتاب بھیجی گئی۔“ (۱)

### خصوصیات

(۱) علمی ادبی ثقافتی، صحافتی، صنعتی، سیاسی، بین الاقوامی اور دیگر شعبہائے زندگی سے متعلق اصلاحات و

محاورات -

(۲) اسماء و افعال کے مترادف معنی اور فرق استعمال

(۳) اسماء کی مختلف صفات اور محل استعمال

(۴) افعال کے صلات، ترکیب استعمال اور مثالیں

(۵) بیس ہزار جدید و قدیم الفاظ کا ذخیرہ و تعبیرات۔“ (۲)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم جدید“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء ص ۶۲-۶۳۔

۲- ماہنامہ ”القاسم جدید“ اکتوبر ۱۹۹۱ء دارالفکر دیوبند ص ۸۔

## اہمیت

لغات کے سلسلے میں تمام عربی داں اس بات سے واقف ہیں کہ عربی اداروں میں تقریباً ۱۹۵۰ء تک عیسائی مؤلف معلوف یسوعی کی تالیف ”المعجم“ ہی مروج تھی اس کے علاوہ روزمرہ کے استعمال کے لئے کوئی لغت تھی ہی نہیں پھر ۱۹۵۰ء کے آس پاس مولانا عبدالحفیط کی تالیف ”مصابح اللغات“ وجود میں آئی جس کو ”المعجم“ کا ترجمہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا مگر بہر حال اس سے عربی کے طلباء و اساتذہ کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا اس کے علاوہ قاضی زین العابدین سجاد میر ٹھی کی تالیف ”بیان اللسان“ اور ”قاموس القرآن“ نے بھی کافی حد تک مدارس عربیہ کی ضرورت پوری کی مگر ان تمام کوششوں میں ایک تو اردو عربی کا گوشہ یکسر خالی تھا، دوسرے جتنی لغت کی کتابیں تیار کی گئی وہ قدیم قوانین کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی تھیں، موجودہ دور کی ترقی یافتہ اصطلاحات و تعبیرات کی تدوین پر کوئی خاص اور یکجا کام نہیں ہوا تھا اس لئے مولانا کیرانوی کی یہ جدید کوشش قدیم قوانین سے بالکل مختلف تھی۔“ (۱)

مولانا کیرانوی اس عربی لغت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”موجودہ ترقی یافتہ دور میں جس طرح زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ عمل میں نمایاں تغیرات ہو رہے ہیں۔ اسی طرح زبان و ادب، اسلوب نگارش اور طرزِ تعبیر میں بھی اہم تغیرات رونما ہو رہے ہیں اور صنعتی سائنسی، علمی، طبی، سیاسی صحافتی میدانوں میں ہزار ہائی اصطلاحات و تعبیرات وجود پذیر ہو رہی ہیں زندہ زبان خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو وہ اپنی وسعت داماں کا ثبوت اسی وقت دیتی ہے جب کہ اس کے دامن اشتقاق میں ان نئی ضروریات کی تکمیل کے لئے سہولت و بلا تکلف اصطلاحات و تعبیرات کو نمایاں جگہ مل جائے انگریزی زبان تو ان ممالک کی مادری زبان ہے جو زیادہ تر نئی ترقیات کا مرکز و منبع ہے اس لئے اس زبان میں نئے دور کی ضرورت کے لئے اصطلاحات اور تعبیرات کا وضع ہونا قابلِ تعجب نہیں بلکہ سہل بھی ہے اور ناگزیر بھی لیکن عربی چونکہ اپنی وسعت اور آفاقیت کے لحاظ سے دنیا کی زندہ اور وسیع تر علمی زبانوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس نے بھی اپنے دامن اشتقاق کو اس طرح پھیلا یا کہ آج اس میں مختلف النوع اصطلاحات و تعبیرات خوبی اور بے تکلفی کے ساتھ سمائی جا رہی ہیں جنکا اندازہ جدید لٹریچر اور جدید عربی معاجم کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔“ (۲)

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ماہنامہ دارالعلوم دیوبند“ جولائی ۱۹۷۲ء مولانا ابو العاص وحیدی ص ۴۱۔

۲- ”مقدمہ القاموس الجدید“ (عربی اردو) مولانا وحید الزماں کیرانوی۔

القاموس الجدید (عربی اردو) کو مرتب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہندوستان میں عربی اخبارات و مجلات اور جدید تالیفات کو سمجھنے کے لئے عربی داں طبقہ کو عرصہ سے ایک ایسی ڈکشنری کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس میں خاص طور سے نئی عربی اصطلاحات یا قدیم الفاظ کے نئے معانی کی وضاحت اردو میں کیجائے چونکہ اس سے قبل ”القاموس الجدید“ (اردو عربی) کو عربی داں حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا اس لیے اب ”القاموس الجدید“ (عربی اردو) کو ہدیہ نظر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اس کی ترتیب میں ”القاموس العصری“ (عربی انگریزی ڈکشنری) کو اساس بنایا گیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ضروری اضافوں اور تعبیرات کے ساتھ اس کا مخلص تیار کیا گیا ہے تو بیجا نہ ہوگا، الفاظ و اصطلاحات کے ترجمہ و تعین مراد کے لئے ”المعجم“ جدید سے بڑی حد تک مدد ملی گئی ہے اس طرح اس مختصر معجم میں نئی اصطلاحات کا معتد بہ ذخیرہ شامل ہو گیا ہے اسی کے ساتھ ایسے الفاظ جو بظاہر عام مردجہ کتب عربیہ میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں لیکن ذہنوں میں انکے ایک خاص معنی و استقامتی تراجم رچ بس گئے ہیں وہ بھی معنی اور ترجمہ کے جدید لباس میں پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہے الفاظ کے معنی اگرچہ قدیم و جدید کی صراحت کے بغیر بیان کئے گئے ہیں لیکن ہر معنی کا علیحدہ نمبر ڈال کر اختلاف معانی کو واضح کر دیا گیا ہے۔“ (۱)

مولانا کیرانوی نے ”عربی سے اردو لغت“ میں جو کام کیا اگرچہ وہ مصباح اللغات سے بالکل مختلف اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے لیکن اس طرح کے کام کی طرف آپ سے قبل کچھ لوگوں نے پیش قدمی کی تھی اور انھوں نے ایک راستہ ضرور دکھلایا تھا اگرچہ وہ لوگ اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن آپ نے اردو سے عربی میں جو کام کیا وہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا کام تھا آپ سے قبل کسی کے ذہن نے اس طرف رہنمائی بھی نہیں کی اس لئے اس میں آپ کو مقام اولیت حاصل ہے دونوں لغات میں آپ کی امتیازی شان یہ ہے کہ انھوں نے دورِ حاضر کی ترقی پر جدید عربی زبان، جدید اصطلاحات و محاورات اور عالمگیر صنعتی، اقتصادی اور سائنسی انقلاب کے بعد کی لسانی تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر لغات مرتب کی ہیں اس میدان میں ”مصباح اللغات“ کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود وہ مولانا کی مرتب کردہ لغات کی جگہ نہیں لے سکتی وہ ایک بالکل اچھوتا میدان اور خالی جگہ تھی جس کو انھوں نے پُر کیا وہ کسی چلے ہوئے راستہ پر نہیں چلے بلکہ انھوں نے اپنا الگ راستہ بنایا ہے ایسا راستہ جس کی شد بد ضروری ہے۔

ان لغات کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عربی ادب کے طلبہ و اساتذہ خواہ مدارس و جامعات میں ہوں یا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مولانا کے نام نامی سے ضرور بالضرور واقف ہوں گے ان کی واقفیت کا سبب علاوہ دیگر اسباب کے ”القاموس الجدید“ ہی ہے آپ نے ایسا کار نمایاں انجام دیا جسکی ضرورت کا احساس ہندوپاک میں عرصہ دراز سے محسوس کیا جا رہا تھا آپ نے ساٹھ کی دہائی میں ان لغات کو ترتیب دیکر عظیم خلاء کو پر کیا اور بر صغیر کے طلبہ و اساتذہ کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر کے جدید عربی سے واقفیت کے لئے مستغنی کر دیا۔ اس کام کی اہمیت اور اس سلسلہ کی جانفشانی اور عرق ریزی کا صحیح اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جسکو لغات کے بحر ذخار کی ادنیٰ سی شد بد ہو بر صغیر میں آج تک کسی عربی دان نے اس پر خار وادی کا سفر نہیں کیا۔ (۱)

”القاموس الجدید“ اردو عربی کے مقدمہ میں اپنی اردو عربی ڈکشنری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

”اس ڈکشنری کی ترتیب میں پیش آمدہ مشکلات پر قابو پانے کے لئے ان ضروریات کا لحاظ رکھ کر ترتیب دی گئی ہے جو دور ان انشاء ایک طالب علم کو پیش آتی ہے اور خاص طور پر اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ مفرد الفاظ کے ساتھ انکے استعمال اور متعلقہ ضروری ترکیبات دیجائیں تاکہ اردو سے عربی میں مفہوم کی ادائیگی اہل زبان کے محاورہ کے مطابق ہو اگرچہ الفاظ کے انتخاب اور استخراج کا مرحلہ دشوار گزار تھا لیکن اس کے لئے مختلف معاجم کے ساتھ ساتھ موجودہ عربی لغات معیاری رسائل و اخبارات اور مختلف تالیفات سے ہر موضوع اور ہر شعبہ ہائے زندگی کے متعلق الفاظ و اصطلاحات اور تعبیرات جمع کی گئی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں زبانوں کے الفاظ اصطلاحات اور تعبیرات کا باہم تبادلہ و ترجمہ اہم اور مشکل کام تھا جس سے مختلف طور پر وقوع اغلاط کا احتمال ممکن ہے احتیاط کے باوجود ترجمہ الفاظ ”تعیین معنی و مفہوم اور تعین مراد طریقہ تعبیر اور اعراب و ابواب میں اغلاط کا ہونا کوئی امر بعید نہیں ہے۔“ (۲)

## قابل لحاظ امور

(۱) الفاظ و تعبیرات کے ترجمہ میں لفظی ترجمہ اور انفرادی معنی کا لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ محل استعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا گیا ہے۔

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ماہنامہ ”الداعی“ دارالعلوم دیوبند مولانا نور عالم خلیل الامینی ص ۱۱۔

۲- مقدمہ ”القاموس الجدید“ (اردو-عربی)۔

- (۲) اردو الفاظ کی فہرست میں عربی انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل کئے گئے ہیں جو اردو زبان کا جز بن چکے ہیں یا ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔
- (۳) اردو کے مترادف الفاظ بالترتیب ہر حرف کے تحت لکھے گئے لیکن معنی صرف ایک جگہ لکھ کر بقیہ جگہوں میں اس کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔
- (۴) ایک سے زائد معنی رکھنے والے الفاظ کی بعض جگہ تشریح کی گئی ہے اور بعض جگہ نمبر ڈال کر تبدیل مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
- (۵) بنیادی لفظ لائن کے شروع میں اور بقیہ مشتق یا ضمنی الفاظ اسی کے تحت ایضاً کا نشان لگا کر لکھ دئے گئے ہیں۔
- (۶) جن الفاظ کے حصادر صیغہ ماضی سے بآسانی سمجھے جاتے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا صرف ضروری مصادر افعال کے ساتھ ذکر کر دئے گئے ہیں۔
- (۷) اردو کے مصدری معنی کے لئے صرف عربی مصدر نہیں لکھا گیا بلکہ عام طور پر پورا جملہ ذکر کر دیا گیا ہے جو فعل ماضی پر مشتمل ہے تاکہ لفظ کا جملے میں صحیح استعمال ہو سکے۔
- (۸) افعال کے بعد جو حرف جارہ لکھے گئے ان سے مراد صلات ہیں یعنی افعال متعدی کا مفعول بہ سے تعلق ان حروف وساطت سے ہوتا ہے جو افعال بغیر صلات استعمال ہوتے ہیں ان کی جگہ نقطہ دیکر خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔
- (۹) اسماء کی مختلف صفات حسنہ اور سیئہ دونوں موقع بموقع ذکر کر دی گئی انکا انتخاب و استعمال حسب موقع کیا جائے۔
- (۱۰) عموماً اسم فاعل اور اسم مفعول کی تانیث ذکر کی گئی ہے مذکر کے آخر میں تاء تانیث مربوط کر کے مؤنث بنایا جائیگا۔
- (۱۱) جمع مذکر سالم اور مؤنث سالم بھی عام طور پر ذکر نہیں کی گئی کیونکہ مفرد کے اخیر میں ”واؤنون“، ”ی نون“ اور ”الف ت“ بڑھا کر حسب قاعدہ بنائی جاسکتی ہے۔
- (۱۲) مصدر لام کے بعد ”الشی“ قائم مقام فاعل اور مصدر متعدد کے بعد قائم مقام مفعول بہ ہے۔ “(۱)

## القاموس الجدید علماء کی نظر میں:-

القاموس الجدید عربی اردو اور اردو عربی جس وقت منظر عام پر آئی تو اہل علم اور عربی دان طبقہ نے اسکو بنظر تحسین دیکھا اور اسکو نعمت غیر مترقبہ سے تعبیر کیا اور خطوط لکھ کر آپ کی ہمت افزائی کی اور اس کام کو سراہا انھوں نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح فرمایا۔

ماہنامہ ”صدق جدید“ لکھنؤ نے اپنے ۶ فروری ۱۹۶۰ء کے رسالہ میں اس طرح تبصرہ کیا:

”اب تک اس موضوع پر جو کتابیں موجود ہیں ان میں سب سے بہتر مفصل تر اور جامع ہے اس وقت اسکی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی، آپ کا یہ عظیم الشان کارنامہ رہتی دنیا تک کے لئے نور ہدایت ہے۔“

”ماہنامہ برہان دہلی“ نے بھی فروری ۱۹۶۰ء کے شمارہ میں اس طرح پذیرائی کی:

”کتاب کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں عربی اخبارات و رسائل اور لغات جدید پر حال میں جو کتابیں مصر و ہند میں شائع ہوئی ہیں انکی مدد سے کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ اردو میں رائج بس گئے ہیں ان کا بھی استقصا کر لیا جائے طلبہ و اساتذہ کو فائدہ اٹھانا چاہئے“

سہ روزہ دعوت نے یکم فروری ۱۹۶۰ء کے اخبار میں لکھا۔

”ضرورت ہے کہ ہمارے پاس ایسی کتابیں موجود ہوں جنکی مدد سے ہم موجودہ ادب سے بہرور ہو سکیں ”الہجد“ یا اس کے ترجموں سے مطلب پورا نہیں ہوتا اس سلسلہ میں ”القاموس الجدید“ مؤلفہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی بہتر مواد فراہم کرتی ہے الفاظ کا اچھا خاصہ ذخیرہ موصوف نے یکجا کر دیا ہے“

ماہنامہ تجلی دیوبند نے دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

”یہ اردو عربی لغت وقت کی اہم ضرورت کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرتی ہوئی سامنے آئی داد کے قابل ہے مرتب کی کج کاوی محنت اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے“

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند نے لکھا:

”بلاشبہ ڈکشنری بعض خصوصیات کی بنا پر اپنے طرز کی سب سے پہلی جامع تصنیف ہے“

مولانا محمد میاں ناظم جمعیتہ علماء ہند نے اس ڈکشنری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

”یہ کتاب جس طرح فاضل مصنف کے ادبیانہ کمالات کا آئینہ ہے ادب عربی کے فضلاء بالخصوص طلبہ عربی کے لئے نعمت بارہ اور نعمت غیر مترقبہ بھی“

مولانا قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:



## القاموس الاصطلاحی

مولانا وحید الزماں نے جہاں لغت کی کتاب القاموس الجدید (عربی-اردو اور اردو-عربی) تیار کیں وہیں آپکا کارنامہ ”القاموس الاصطلاحی“ کی ترتیب ہے کیونکہ اس موضوع پر ہندوستان میں اس قسم کا پہلا کام ہے اس سے قبل اس میدان میں کسی نے شہسواری نہیں کی اپنے باوجود مشغولیات کے لغت پر اتنا کام کر دیا شاید ہی ہندوستان میں کسی نے آپ کے مقابل ایک چوتھائی بھی کام کیا ہو، آپ کی پوری زندگی عربی زبان کو عام اور رائج کرنے میں گزر گئی نئی نئی ایجادات کی تعبیرات تلاش کر کے اس کا آسان اردو میں ترجمہ کرتے اور ہمیشہ کوشش کرتے رہتے کہ جتنے الفاظ ہندوستان میں عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں انکی عربی تلاش کیجاوے یا عربی اصطلاحات اردو تعبیرات میں بدل دیجائے انہیں کوششوں کا نتیجہ ”القاموس الاصطلاحی“ ہے۔

ان لغات میں اردو عربی کی ان جدید تعبیرات و اصطلاحات کے زیادہ تر حصہ کو شامل کیا گیا ہے جو موجودہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مستعمل ہیں جس طرح ”القاموس الاصطلاحی (عربی اردو)“ موجودہ عربی لٹریچر کو سمجھنے اور اسکو حل کرنے میں معاون ہے اسی طرح ”القاموس الاصطلاحی“ اردو سے عربی ترجمہ کرنے اور نئے موضوعات پر ضروری تحریریں مرتب کرنے میں معاون و مددگار ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اس طرح کی لغات کی انسان کو بلکہ ایک اسکالر کو ہر وقت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ محاورات و اصطلاحات کو سمجھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے بغیر قاموس کے انکو سمجھنا اور انکو اپنی زبان میں استعمال کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اس لئے انھوں نے ”القاموس الاصطلاحی“ کو مرتب کیا تاکہ اصطلاحات کو سمجھنا آسان ہو جائے اور اغلاط سے احتراز کیا جائے۔

مولانا وحید الزماں صاحب نے اسکی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”چونکہ اس سے قبل دو ڈکشنری ”القاموس الجدید“ اردو، عربی اور عربی، اردو قبول و استحسان کی نظر سے دیکھی گئی جس سے اس میدان میں مزید خدمت کا حوصلہ ملا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید لٹریچر کو سمجھنے کے لئے ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں زیادہ تر نئی اصطلاحات ہوں اور انکی ترتیب ابتدائی ضرورت کے لحاظ سے ہو تاکہ ہر معیار کے طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں چنانچہ ”القاموس الاصطلاحی“ کے نام سے ایسی ڈکشنری تیاری کی جس میں تقریباً بیس ہزار الفاظ و اصطلاحات کا اردو میں ایسا تطبیقی اور اصطلاحی ترجمہ کیا گیا ہے جس سے بوقت مطالعہ جدید عبارت کو حل کرنے میں آسانی ہو ترجمہ میں بعض اوقات ظاہری لفظ کی رعایت نہ کرتے ہوئے ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو موقع اور محل

کے لحاظ سے صحیح طور پر منطبق ہو جائے نیز بہت سے الفاظ کے ایسے متعدد ترجمے کئے گئے ہیں ان میں سے کسی نہ کسی ترجمے کا انطباق ضرور ہو جائیگا۔“ (۱)

## القرأة الواضحة

ایک ماہر لغت داں بنیادی طور پر لغوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب بھی ہوتا ہے، جہاں لغت میں وہ نئے نئے الفاظ پیش کرتا ہے وہیں پر اپنے ادب کے جواہر پاروں سے باذوق لوگوں کو معطر بھی کرتا ہے۔ یہی حال مولانا وحید الزماں کا ہے۔ جہاں ایک لغوی ہونے کی حیثیت سے وہ معروف و مشہور رہے وہیں پر ادیب ہونے کی حیثیت سے اپنے ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا ہے آپ نے ۱۹۶۶ء - ۱۹۷۰ء کے عرصہ میں ”القرأة الواضحة“ کے نام سے تین حصوں میں عربی زبان کا ریڈر لکھ کر عربی کے ابتدائی طلباء کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ اس میں آپ نے عربی زبان کے اسباق طلبہ کے معیار زبان دانی و ثقافت کا لحاظ کرتے ہوئے اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس میں منزل بہ منزل مکمل پابندی ہے۔ تینوں مراحل کا لحاظ کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو دشواری پیش نہ آئے۔ چنانچہ پہلا حصہ آسان ہے اور دوسرا قدرے مشکل ہے اور تیسرے حصہ کا معیار کچھ اور بلند ہے۔ ہر حصہ کے اسباق میں بھی آسان سے مشکل کی طرف آنے میں تدریجاً پیش قدمی کی گئی ہے۔ مولانا نے کوشش کی ہے کہ شروع سے ہی صرف و نحو کا دشوار بوجھ ایک مبتدی کے دوشِ ناتواں پر نہ پڑے کہ یہ بعض دفعہ ہمت ہار جانے کا سبب بھی بن جایا کرتا ہے (۲)

عربی انشاء کی ابتدائی تعلیم کیلئے مولانا نے عام کتابوں سے ہٹ کر بالکل جداگانہ انداز میں ”القرأة الواضحة“ کے تینوں حصے لکھے جو اپنے مقصد میں نہایت کامیاب اور اس فن کو سکھانے کیلئے تیر بہدف نسخے ثابت ہوئے انشاء پر دازی کے لئے اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے جو بڑی حد تک درست بھی ہے کہ ان کے ذریعہ چٹنگی پیدا نہیں ہوتی جب کہ قدیم طرز کی کتابوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہیں ایک تو تکلم پر عبور حاصل نہیں ہو گا دوسری طرف نئی تعبیرات سے وہ کتابیں بالکل خالی ہیں لیکن مولانا کے بتائے ہوئے طریقہ ”القرأة الواضحة“ کے ذریعہ انشاء پر دازی کی تعلیم کا جو طویل تجربہ کیا گیا ہے اس کے نتائج حیرت انگیز اور دوسرے طریقوں کے نقائص سے محفوظ ثابت ہوئے ہیں۔

مولانا کی یہ کتاب ان کے ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت ہے اسے مولانا کے طویل تجربہ کا حاصل کہا جاسکتا ہے اس میں اسباق کی تیاری میں انہوں نے عصری منہج کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ مسلمان طلبہ کی نفسیات اور مخصوص ماحول کو بھی ذہن نشین رکھا ہے۔ تعلیم کے دشوار اور اکتا دینے والے طریقوں سے اجتناب کیا ہے

۱- مقدمہ ”القاموس الاصطلاحی“ مولانا وحید الزماں کیرانوی۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھئے ”وہ کوہ کن کی بات“ مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۶۴۔

سہل سے دشوار کی طرف نہایت منطقی انداز میں پیش رفت کی ہے۔ اسباق کی بنیاد ضروری نحوی قواعد پر رکھی گئی ہے اور ان کی ترتیب میں عملی طریقہ پر زور دیا گیا ہے ہر سبق کے بعد مفید مشقیں دی گئی ہیں اور مثالوں کے ذریعہ طالب علم کے لئے آسانیاں پیدا کی گئی ہیں کہ وہ اسی طرح کے جملے اپنی طرف سے بنائیں ایک سبق کے لئے صرف ایک ہی قاعدہ پر اکتفا کیا گیا ہے اور کسی دوسرے قاعدہ کو خلط ملط سکرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی سبق ترکیب اضافی کے قاعدہ پر مبنی ہے اور اس سے قبل ترکیب توصیفی پر مبنی کوئی سبق نہیں گزرا ہے تو اس سبق میں کوئی جملہ ایسا نہیں لیا گیا جو صفت موصوف کے قاعدہ پر مبنی ہو اس طرح طالب علم کا ذہن ایک سبق میں صرف ایک ہی قاعدہ پر مرکوز رہتا ہے۔ (۱)

### مقبولیت:

اسمیں شک نہیں کہ اس کتاب کی تیاری کے پیچھے جو ذہن ہے وہ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم کا ہے جس کی گرفت تعلیم کے میدان میں زمانہ کی نبض پر بہت گہری ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ساہا سال سے نہ صرف مدارس بلکہ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے اور آج تک کوئی اسکی جگہ نہیں لے سکی ہے۔

### جزء اول کی ترتیب:

یہ چالیس اسباق اور ان سے متعلقہ مشقوں پر مشتمل ہے روزمرہ کی ضروریات اور گرد و پیش کے احوال ان اسباق کا موضوع ہیں۔ ابتدائی چودہ اسباق میں صرف جملہ اسمیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے ذیل میں اسم کی اقسام معرفہ اور نکرہ مذکر و مؤنث اسم اشارہ اور اسم ضمیر مرکبات ناقصہ میں مرکب اضافی، مرکب توصیفی، اشارہ، مشارالیه جار مجرور اور مرکب عددی تدریج و ترتیب کے ساتھ مذکور ہوتے ہیں۔ حروف جارہ اور حروف استفہام حسب ضرورت لئے گئے ہیں ہر سبق میں جملہ اسمیہ کی شکل اور نوعیت فہرست میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سبق نمبر ۱۵ سے جملہ فعلیہ شروع ہوتا ہے اس میں بھی اجزاء جملہ کی عددی اور نوعی ترتیب و تدریج ملحوظ رکھی گئی ہے۔ افعال کی ترتیب اسی طرح ہے کہ پہلے فعل ماضی، مضارع، امر و نہی اور صحیح ثلاثی مجرول لازم و متعدی، پھر فعل معتل ثلاثی مثال وادی مثال یائی، ناقص یائی پھر مضاعف و مہوز ہر فعل کے صرف پانچ صیغے اس جز میں لائے گئے ہیں دیگر اجزاء فعلیہ میں فاعل (معرفہ، نکرہ، مرکب اضافی) مرکب توصیفی، اسم ظاہر، اسم ضمیر کو مختلف شکلوں میں لایا گیا ہے۔ منصوبات میں مفعول بہ مفعول فیہ (ظرف زماں و مکان) پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ضمیر منصوب متصل (بطور مفعول) اور متعلقات بھی حسب ضرورت لائے گئے ہیں۔

مولانا کیرانوی نے ”القرآۃ الواضحة“ لکھی لیکن اسی کے ساتھ ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ اس کتاب کو جدید عربی کے لئے بطور سلم استعمال کیا جائے لیکن یہ معلم کے طریقہ تدریس پر ہے کہ وہ طالب علم کی

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”ترجمان دارالعلوم جدید“ خصوصی شمارہ ۹۹۵ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۱۵۱۔

کہاں تک اس سے رہنمائی کر سکتے ہیں اور ان کا طریقہ تدریس کیا ہوگا معلوم نہیں وہ اس مقصد کو ملحوظ بھی رکھیں گے جس کے لئے مصنف نے اس کتاب کی تالیف کی ہے۔ اس لئے ضرورت سمجھی کہ کچھ ہدایات معلم کیلئے بھی تحریر فرمائیں، طریقہ تدریس کے سلسلہ میں آپ نے اس طرح وضاحت فرمائی۔

### طریقہ تدریس :

”پڑھنے والے اگر کم سن بچے ہوں تو اس کیلئے ایک سبق کے دو حصے کر دیئے جائیں ایک دن میں پورا سبق بچہ کے دماغ و حافظہ پر بار ہوگا پہلے ان سے مفردات و مرکبات صحیح تلفظ اور صحیح اعراب کے ساتھ پڑھوائے جائیں پھر مفردات کے معنی بتلا کر بار بار وہی معنی اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں پوچھے جائیں۔ اس کے بعد مرکبات کا ترجمہ خود بخود بچوں ہی سے کرایا جائے۔ قواعد صرف و نحو یا اصطلاح کا استعمال کئے بغیر مفردات اور ان سے بنائے ہوئے مرکبات کے ترجمہ کا فرق (جو کا، کی، کے، اور) ہے وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے مختصر طور پر بتا دیا جائے زیادہ تشریح زیادہ الجھن کا باعث ہوگی اس مقصد کے لئے تختہ سیاہ کا استعمال مفید ہوگا اس پر وہ مفرد علیحدہ لکھ کر پڑھوایا جائے اور ترجمہ کرایا جائے۔ پھر ان دونوں کو یکجا لکھ کر ترجمہ کرایا جائے پھر یہ مرکب مٹا کر دوبارہ مفردات کو علیحدہ علیحدہ لکھ کر پڑھوایا جائے اس طرح کی عملی مشق سے بچہ کے ذہن میں مفرد و مرکب کا فرق راسخ ہو جائے گا۔ اس تمرین کے بعد پڑھایا ہوا سبق بچہ سے کاپی پر نقل کرایا جائے اور کچھ روز بعد اسی سبق کا املا بھی شروع کر دیا جائے اس طرح روز اول ہی سے مبتدی کو صحیح لکھنے کی بھی عادت ہوگی اور رفتہ رفتہ عربی رسم الخط کی بھی مشق ہو جائے گی۔ ہر سبق کے نئے الفاظ کے معنی نوٹ کرادیے جائے اگلے روز مفردات، مرکبات کے معنی پوچھنے کے بعد عربی میں مختصر سوالات کئے جائیں۔ پڑھنے والا اگر باشعور اور سمجھدار طبقہ ہو اور صرف و نحو سے قطعاً آشنا نہ ہو تو ایسے افراد کو حسب ضرورت مختصر طور پر قواعد بھی بتادئے جائیں۔ البتہ ابتدائی طور پر اصطلاحات صرف و نحو کا استعمال ایسے افراد کے لئے بھی چنداں ضروری نہیں۔

اس کتاب کے پڑھنے والے درس نظامی یا کسی عربی درس گاہ کے ایسے طلبہ ہو جو قواعد صرف و نحو پڑھ چکے ہو یا پڑھ رہے ہوں ان کے لئے اصطلاحات صرف و نحو کا استعمال ضروری حد تک کیا جانا مناسب ہوگا۔ لیکن انہیں ان اسباق کو نحوی و صرفی اشکالات اور لفظی تدقیقات کا موضوع بنانے کی اجازت نہ دی جائے ان کا ذہن غیر ضروری اور

غیر متعلق امور سے ہٹا کر الفاظ کے صحیح اور بر محل استعمال، افعال کے صلاحت و محل استعمال مرکب اضافی اور مرکب توصیفی، مذکر و مؤنث کے فرق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے انہیں عربی محاورات و تعبیرات کے استعمال کا عادی بنایا جائے۔“ (۱)

مولانا کیرانویؒ نے اس کی کتاب کی تالیف کے بعد اسکے استفادہ کے پیش نظر ایک دلیل مرتب کی جس میں ان کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی ترتیب سے استفادہ کا مقصد واضح ہو جائے اور طلبہ و اساتذہ اس سے پوری طرح مفید ہو سکیں اور مولف کا مشقی نقطہ نظر اور اسباق کا مقصد پورے طور پر واضح ہو جائے اس سلسلے میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

”جدید طرزِ تعلیم سے واقف حضرات کے لئے تو کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن ایسے حضرات معلمین کو کتاب کی تدریس و تمرین کا صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ متعین کرنے میں دشواری پیش آسکتی ہے جو قدیم طرزِ تعلیم کے سوا کسی نئے رنگ ڈھنگ سے واقفیت نہیں رکھتے یا انہیں تعلیمی و تدریسی تجربہ نہیں ہے اس لئے خود بھی اس ضرورت کے تحت ہر جز کی ایک دلیل لکھی اس میں اپنی معمولی استعداد کے مطابق آٹھ سالہ تدریسی تجربات کی روشنی میں ہر سبق کا مقصد اس کا طریقہ تمرین اور اس میں استعمال کردہ کلمات کے معنی بتانے کے لئے ساتھ ساتھ اردو سے عربی ترجمہ کے لئے منتخب جملے بھی لکھ دیے گئے ہیں تاکہ معلمین کو ترجمہ و انشاء کیلئے انتخاب عبارت و عنوان کی بھی زحمت گوارہ نہ ہو۔“ (۲)

آپ نے ضروری ”ملاحظات“ کے عنوان سے عربی خواں طلبہ اور معلمین کیلئے کچھ اصول و قواعد بھی مرتب فرمادیے تاکہ ان قواعد کے پیش نظر طلبہ غلطی کے ارتکاب سے بچ سکیں۔

### ضروری ملاحظات:

”(۱) ہر زبان کو سیکھنے اور جاننے کیلئے اسکے مفردات، مرکبات، قواعد اور طرزِ تعبیر سے واقفیت کے ساتھ اس کا رسم الخط، تلفظ اور لب و لہجہ جاننا ضروری ہے اس لئے معلمین حضرات کو زبان و ادب کی تعلیم کے آغاز ہی سے ان امور کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ (۲) زبان دانی میں قابلِ اعتماد اور فصیح اللسان اہل زبان کی تقلید ضروری ہوتی ہے صرف قواعد صرف و نحو پر زبان کی تعمیر نہیں ہو سکتی ہم اپنے قیاس سے نہ تو محاورات و تعبیرات ایجاد کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی لفظ محض اپنی قواعد دانی کے سہارے کسی خاص

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”دلیل القراءہ الواضحہ“ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۵۔

۲- ”دلیل القراءہ الواضحہ“ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۵۔

مفہوم و معنی کے لئے متعین کر سکتے ہیں۔ اس کیلئے اہل لسان کی سند کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً چشم اور خورد بین کے لئے اگر ہم قیاساً اسم آلہ کا استعمال کریں تو غلط اور اہل زبان کی اصطلاح کے خلاف ہو گا اور بالاتفاق چشم کو نظارہ اور خورد بین کو مجھڑ، اس لئے اگر ابتداء ہی سے طالب علم کو مفردات و مرکبات کی تحقیق و تدقیق اور نظری فلسفہ کی الجھنوں سے بچا کر ابتدائی مرحلہ میں صرف الفاظ کے صحیح اور بر محل استعمال کی عادت ڈالی جائے تو اس میں زبان کا ملکہ بھی پیدا ہو گا اور بعد کے مرحلہ میں الفاظ کی تحقیق و تدقیق اس کے لئے آسان اور زیادہ سود مند ہو گی اور بتدریج مرحلہ وار تعلیم اس کی استعداد کو پختہ اور راسخ بنائے گی۔ وہ نہ صرف و نحو و مفردات لغت کا عالم ہو گا بلکہ وہ بحیثیت مجموعی زبان کے تمام گوشوں سے واقف ہونے کے ساتھ اسے ایک زندہ زبان کی حیثیت سے نطق و انشاء میں بھی استعمال کرنے پر پوری قدرت ہو گی۔

(۳) تدریس کا زیادہ بہترین طریقہ استنباطی طریقہ ہے کہ معلم صاحب ہر بات کی خود تشریح کرنے کے بجائے طالب علم کو اپنے فکر و ذہن سے کام لینے کا عادی بنائیں۔ جو بات اس کے ذہن نشین کرانی ہو اس کی خود زیادہ وضاحت نہ کی جاوے بلکہ ضروری رہنمائی کے ذریعہ اسے مستبط کرایا جائے۔

(۴) قواعد کو محض رٹانے یا ان کی دور از کار تشریح کے بجائے بقدر ضرورت اور بلحاظ استعداد سمجھا کر عملی مشق و تطبیق پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ نیز عربی الفاظ کے، معنی جیسے اردو میں یاد کرائے جائیں اسی طرح اردو الفاظ کے عربی معنی بھی یاد کرائے جائیں اس طرح زبان کے دونوں رخ سامنے رہیں گے اور تکلم و انشاء میں سہولت ہو گی۔

(۵) ابتداء مترادف الفاظ کے باہمی فروق کی تدقیق تشریحات سے قطعی اجتناب کرتے ہوئے صرف ان کا محل اور موقع استعمال ذہن نشین کرایا جائے اس طرح الفاظ کا باہمی فرق خود کتاب سے واضح ہو جائے گا اور جس جگہ واضح نہ ہو وہاں دونوں کے ایک ہی معنی بتائے جائیں۔

(۶) افعال کے ساتھ جہاں جو صلات استعمال ہوں ان کو افعال کا ایسا جزء لازم تصور کرایا جائے کہ جب طالب علم اس فعل کو زبان یا نوک قلم پر لائے تو معاً اس کا صلہ بھی ذہن میں آ جائے مثلاً ذہب کے بعد ہمیشہ ”الی“ آئے گا اردو میں لفظ ”گیا“ کا سلسلہ خواہ ”پر“ خواہ ”میں“ یا ”تک“ یا ”طرف“ کہا جائے یا کوئی بھی لفظ نہ بولا جائے جیسے ”وہ باز آ گیا“ تمام صورتوں میں

ذہب کے بعد آئی ہی آئے گا اگرچہ اردو میں حسب موقع ترجمہ مختلف ہوگا۔

عام طور پر عربی مدارس کے طلبہ صلات کے استعمال میں فحش غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ حروف جارہ جو مخصوص معانی کے لئے وضع کیے گئے ہیں ان میں اور ان حروف جارہ میں جو افعال کا صلہ بنتے ہیں کوئی فرق نہیں کرتے جس کی بنا پر وہ افعال کا ترجمہ افعال سے اور حروف کا حروف سے کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ترجمہ خلاف محاورہ اور غلط ہو جاتا ہے اس لئے دو باتیں خاص طور پر قابل التفات ہیں اول یہ کہ جو حروف جارہ افعال کا صلہ بنتے ہیں ان کے الٹے وضعی معنی ملحوظ نہیں ہوتے ہاں اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے کہ حرف جر صلہ بھی بن رہا ہے اور اپنے مجرور کو موضوع بھی دے رہا ہے۔

دوم یہ کہ صلات ہر زبان میں ہوتے ہیں لیکن بوقت ترجمہ فعل کا فعل سے ہی تبادلہ ہوتا ہے صلہ کو صلہ سے نہیں بدلا جاتا مثلاً ہم اردو میں کہتے ہیں ”حامد نے خالد سے شکایت کی“ یہاں اردو میں شکایت کا صلہ ”سے“ ہے لیکن عربی میں شکی یشکو کا صلہ ”الی“ ہے اس لئے شکی حامد من خالد غلط ہو گا کیونکہ ”من“ شکی کا صلہ نہیں ہے۔ شکی حامد الی خالد ہوگا۔ اسی طرح اگر اس عربی جملہ کا ترجمہ اردو میں کیا جائے جو حامد نے خالد سے شکایت کی خالد کی طرف کہنا صحیح نہ ہوگا۔ بہت سے حضرات افعال کے صلات کا یاد رکھنا دشوار سمجھتے ہیں اور اس کے لئے کسی قاعدہ کلیہ یا ایسی کسی جامع کتاب کے متلاشی رہتے ہیں جس میں صلات افعال یکجا کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ صلات کا یاد رکھنا نہ دشوار ہے اور نہ اس کے لئے کسی قاعدہ کلیہ یا کتاب کی ضرورت ہے اس کی آسان اور صحیح صورت صرف یہ ہے کہ ہم صرف کتابوں کے مطالعہ کے دوران عبارتوں کا صرف مفہوم سمجھنے یا محض الفاظ مفردہ کے معانی محفوظ کر لینے پر ہی اکتفا کرنے کے بجائے افعال کے صلات اور مواقع استعمال کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں اس طرح افعال کے ساتھ ساتھ ان کے صلات بھی حافظہ کی گرفت سے باہر نہ ہونگے اور مواقع استعمال بھی محفوظ ہو جائے گا اور یہ طریقہ کار ہر فن کی کتب کے مطالعہ کے لئے ہونا چاہیے۔

(۷) ترجمہ کرتے وقت یہ بات بھی بطور خاص ملحوظ رہنی چاہیے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے اسی زبان کے قواعد و تراکیب کا لحاظ کیا جاتا ہے نہ کہ اس زبان کا جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اکثر عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ کرتے وقت اردو ترکیب کو ملحوظ

رکھنے میں غلطی ہوتی ہے۔ نتیجتاً دونوں ترجمے خلاف محاورہ اور غلط ہو جاتے ہیں اگر ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو اکثر غلطیوں سے بچا جاسکتا ہے (۱)

پروفیسر زبیر احمد فاروقی ”القرآۃ الواضحہ“ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قد صدرت لهذا الكتاب ثلاثة اجزاء حتى الآن و يريد المؤلف وهو الاستاذ وحيد الزمان الكيرانوى اصدار الاجزاء الرابع ايضاً فى وقت قريب وذلك ستنتم سلسلة الكتاب و قدراعى المؤلف فى اعداده الامور التالية المنهج العصرى لتعليم اللغة العربية نفسية طلاب الهند (المسلمين) و بيئتهم المدرسة الدينية، تجنب طريق وعرة و صعوبة للتعليم. التدرج من السهل الى الصعب. بناء الدروس على القواعد النحوية الضرورية مع الترتيب الطبيعى الا حتياجى لا القواعدى تمرين الطالب على التعبيرات العربية حسب القواعد المرعية فى الدرس بارشاد المعلم۔

الاهتمام بتمرينات مفيدة بعد كل درس وهى فى موضوع الدرس نفسه ذالك كنموذج ومثال لكئى يتسنى للطالب اعداد جمل أخرى من نفس الطراز بنفسه. الاكتفاء بتطبيق قاعدة واحدة فى درس معين و النحاشى عن الخلط بينها وبين قاعدة جديدة أخرى فمثلا اذا كان الدرس مبنياً على قاعدة التركيب الاضافى ولم يسبقه درس مبنى على قاعدة التركيب التوصيفى فيتجنب المؤلف ايراد اى مثال مبنى على قاعدة الصفة والموصوف الامر الذى لايسبب التعب والملل لدى المعلم او المتعلم وانهما يتفرعان لتركيز كامل انتباها على قاعدة معينة واحدة فقط هذا فى آخر كل جزء من الكتاب أورده قائمة للقواعد النحوية الصرفية التى بنت عليها الدروس، وفى بداية الكتاب ملاحظات مفيدة للمعلمين المعينين بتعليم اللغة العربية عن طريق هذا الكتاب۔

ومما يلا حذ ان القرآۃ الواضحة لوحيد الزمان الكيرانوى يحتل مكان الصادرة بين الكتب العديدة التى صدرت فى الاعوام باللغتين العربية والانكليزية فى الهند لتعليم المبتدين لغة الضاد ذالك للمزايا التى ذكرت فيما سبق فمامن فى مدرسة او معهد او جامع الاویدرسُ فيه خاصة ضمن المناهج المقررة للمبتدين“ (۲)

۱- ”دليل القرآۃ الواضحة“ مولانا وحيد الزمان کیرانوی ص ۵۔

۲- ”ثقافة الهند“ ج ۳۸ شمارہ ۱۹۸۷ء پروفیسر زبیر احمد فاروقی ص ۷۳۔



## نفحة الادب

مولانا وحید الزماں نے عربی زبان و ادب کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے اور طلبہ میں انشاء پر دازی کا رجحان پیدا کرنے کے لئے جہاں ایک طرف ”المقراة الواضحة“ مبتدی طلبہ کے لئے مرتب کی وہیں پر طلبہ کی اخلاقی و ذہنی پستی کو دور کرنے اور ان کے اخلاقی اقدار کو نمایاں کرنے کے لئے ”نفحة الادب“ جیسی نصابی کتاب تالیف کی کیونکہ اس سے قبل ادب کی اکثر کتابیں جو ادب و انشاء سے متعلق تھیں ان میں حکایات و واقعات کو بطور ادبی حیثیت کے پیش کیا جاتا تھا۔ ان میں بہت سی حکایات کا طلبہ کے ذہن پر برا اثر پڑتا تھا اور اس سے اخلاقی گراؤٹ سامنے آتی تھی لہذا اسی چیز کے پیش نظر دارالعلوم کی انتظامیہ نے مولانا وحید الزماں سے درخواست کی کہ اس طرح کی کتاب مرتب کریں جس سے انشاء کے طلبہ کو بھی زیادہ فائدہ ہو اور اس سے اخلاقیات پر بھی اچھا اثر پڑے۔ چنانچہ آپ نے اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے ”نفحة الادب“ تالیف کی آپ نے اس کی ترتیب میں ہر چیز کا خیال رکھا اور کوئی ایسی چیز پیش نہیں کی جس پر تنقید کی جاسکے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب ”نفحة الادب“ کی وجہ تحریر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”دارالعلوم دیوبند میں عرصہ سے ہی احساس پایا جا رہا تھا کہ درس نظامی میں ابتدائول عربی نثر اور کتاب ”نفحة الیمن“ جس میں بعض ایسے نامناسب قصے اور اشعار درج ہیں جو عریاں نویسی کے دائرے میں آتے ہیں۔ صرف دینی مدرسوں کے ماحول اور اسکے اعلیٰ و ارفع مقاصد سے ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ ان نوعمر طلبہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں جو عمر کی اس منزل میں تاثر و انفعال کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تجویز کے مطابق حضرت مولانا نے مذکورہ کتاب کے متبادل کے طور پر عربی حکایات و قصص پر مشتمل ”نفحة الادب“ کے نام سے عربی نثر کا ایک نمائندہ مجموعہ تالیف فرمایا جو دارالعلوم اور دیگر بہت سارے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے“ (۱)

مولانا وحید الزماں اس کتاب کے مقدمہ میں وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قد كانت الكتب الادبية العربية المقررة تدريسها منذ قديم محتوية على مادة رُبما لا تتوافق مع عقلية التلميذ الناشئ وميوله و مداركه ، وربما تعود عليه باضرار خليقة بما فيها من حكايات غزلية و هزلية خرافية لا يلائم

تدریسها فی الطفولة فرأى المسئولون فی دارالعلوم من اعضاء مجلس الشورى ان توضع مكانها كتب تحتوى مادة صالحة نافعة من حيث الادب و تهذيب الاخلاق فلذا كلفنى المجلس المؤقر بهذا العمل العسير ثقة بى مع ضالة شخصيتى فى العلم والادب

اعدتُ هذا المجموعة المشتملة على النصوص الادبية واللغوية المختارة من كثير من كُتب المطالعة الحديثة و كُتب الادب القديمة واهمَّتْ فى الاخذ و الاختيار بان تكون كل قطعة ملائمة لذوق الناشئ لائقة بمستواه من الناصية الادبية والخلیقة ولم أعمد تبويب المتحویات على حسب الموضوع او النوع او الاسلوب مراعاة لنفسية التلميذ الناشئ فانه یودُّ ان يتذوق الوانا مختلفة من مائدة الادب فمزجت النصوص القديمة والحديثة مزجاً يتنوع به المذاق الادبی و يكون مدعاة لا للطالب الى قراراتها والا استفادة منها دون سامة و ملل (۱)

آپ نے اس کتاب کی تالیف کے بعد اس کی شرح بھی لکھی اور اس میں اس کتاب کی افادیت سے متعلق کچھ اصول بھی مرتب کئے اور خاص طور سے اساتذہ کے لئے جو اس کتاب سے متعلق ہو اس کتاب کی تدریس کے لئے بطور ہدایات کچھ اشارات لکھے چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”اس کتاب کے پڑھانے کا کما حقہ فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ خود پڑھانے والے استاد کے ذہن میں افادیت بھی ہو اور الفاظ و قواعد کی رعایت کرتے ہوئے با محاورہ ترجمہ کرانے کی صلاحیت بھی ہو نہ تو ترجمہ ایسا ہو کہ الفاظ کی ترتیب اور قواعد نحوہ کا کوئی لحاظ ہی نہ ہو اور نہ ایسا محاورہ ہو کہ عبارت سے اس کا کوئی ظاہری تعلق باقی نہ رہے۔ عام طور پر ہمارے مدارس میں جو ترجمہ کیا جاتا ہے اس میں اس زبان کے قواعد ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے حالانکہ ترجمہ کا مسلم اصول اسکے برعکس ہے یعنی جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے قواعد ملحوظ رکھے جاتے ہیں اس صورت میں ترجمہ سلیس و شگفتہ ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کے حسب موقع متعدد ترجمے کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ ایک ہی ترجمہ ہر مقام پر منطبق نہیں ہوتا کبھی مفردات کا ترجمہ کچھ اور ہوتا ہے اور عبارت میں موقع و محل کے لحاظ سے کچھ فرق ہو جاتا ہے لیکن قدرے مشترک روح ہر ترجمہ میں ایک ہی ہوتی ہے اگر وہ بدل گئی تو معانی و مطالب سے انحراف سمجھا جائے گا۔“ ”نفحة الادب“ کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو صحیح ترجمہ کرنے

میں متعدد وجوہ سے دشواری پیش آتی ہے اور اکثر و بیشتر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی کوئی مختصر سی شرح تیار کی جاوے جس میں بطور خاص ترجمہ کا اسلوب بتایا جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مختصر شرح تیار کی گئی ہے۔

اس میں ابتداءً تمام الفاظ کے انطباقی معنی ذکر کئے گئے ہیں افعال کا ماضی مضارع اور مصدر بتاتے ہوئے حسب ضرورت صلات افعال بھی بتائے گئے ہیں۔ اگرچہ وہ خود سبق میں بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد سبق کی ترتیب کے مطابق ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو عبارت سے قریب تر ہونے کے ساتھ اردو محاورہ اور اس کے قواعد کے مطابق ہے۔

اس کتاب میں جو مرکبات اور جملے استعمال کئے گئے ہیں ان کا مقابلہ اردو زبان کے مرکبات سے کرایا جائے نیز ہر مرکب کا موقع و محل استعمال بھی ذہن نشین کرایا جائے عربی میں فلاں موقع پر کیا جملہ اور کس طرح اس جملہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اردو میں ایسے موقع پر کیا جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح افعال کے صلات بھی ملحوظ رکھے جائیں تو انشاء اللہ عربی بولنے لکھنے کا بھی سلیقہ پیدا ہوگا اور اس کتاب کے مقصد کی تکمیل بھی ہوگی اگر ہر جملہ کے سوالات بنا کر طلبہ سے جوابات لئے جائیں تو اس سے عربی استعداد پختہ ہوگی۔ ہر جملہ جتنے اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے اس سے اتنے ہی سوالات بنتے ہیں ہر دفعہ ایک جز کو مجہول قرار دے کر سوال بن جاتا ہے۔ جیسے ایک مختصر جملہ ہے۔ لما وصلت الزوجة الى المنزل فتحت الصندوق امام زوجها۔ اس سے حسب ذیل سوالات بن جائیں گے (۱) اين وصلت الزوجة؟ (۲) ماذا فعلت الزوجة؟ (۳) من وصل الى المنزل؟ (۴) ماذا فعلت الزوجة لما وصلت الى المنزل؟ (۵) من فتح الصندوق؟ (۶) ماذا فتحت الزوجة (۷) متى فتحت الزوجة الصندوق؟ (۸) امام من فتحت الزوجة الصندوق؟ (۹) أفتحت الصندوق امام ابنها؟

اس طرح یہ نو جملے بن گئے ان کے جوابات مذکورہ ایک جملے سے ملیں گے وہ بھی نو ہونگے اس طرح کل اٹھارہ جملے ہو گئے۔ اگر ہر سبق کے جملوں سے اسی طرح سوال و جواب پر مشتمل جملے بنائے جائیں تو اندازہ لگائیے کہ کتنی تعداد ہوگی اور پوری کتاب سے تو ہزار ہا جملے بن جائیں گے۔ عربی زبان سیکھنے کے یہ خواہش اور سکھانے کا یہ طریقہ ہو تو استعداد کی پختگی کے ساتھ زبان کا مقصد بھی حاصل ہوگا۔ الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی مع

صحیح استعمال ذہن نشین ہو جائے گا دراصل اس کتاب کے پڑھانے کا اصل طریقہ یہی ہے“ (۱)

## القاموس الوحید

جس طرح قومیں آشنائے عروج و زوال ہوتی ہیں اسی طرح انکی زبانوں کو عروج و زوال کے نشیب و فراز دیکھنے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بولنے والے اور سمجھنے والوں کی تعداد بالکل محدود یا کالعدم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج بعض زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے بولنے والے موجود نہیں ہیں۔ مثلاً سنسکرت جو بہت قدیم زبان بلکہ الہامی زبان شمار کی جاتی ہے اور اس کی قدامت کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن آج کتنے اصحاب سنسکرت بولنے والے پائے جاتے ہیں۔

لیکن عربی زبان کا معاملہ کچھ اور تھا اس زبان میں بذات خود اہتمام و اوصاف موجود تھے جو اسے وسیع عالمگیر بنادیتے ہیں مگر عربوں کی جغرافیائی اور سیاسی حالت اس کی توسیع کی راہ میں حائل تھی۔ رحمت کاملہ نے دنیا کو امن عامہ کی بشارت اور پیغام توحید سنانے کیلئے اسی زبان کو منتخب کیا۔ یہ پیغام عالمگیر تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس زبان کا حلقہ اثر محدود ہونے کے بجائے وسیع اور عالمگیر ہونا چاہیئے۔ اسلام کے سیاسی و معاشرتی نظام کی توسیع کے باعث عربی زبان کو بھی اپنے محدود جزیرہ نمائے عرب سے نکلنے اور پھیلنے کا موقع ملا۔ چنانچہ جب اسلامی فتوحات کا دائرہ اکناف ارضی تک پھیلا اور عجمی اقوام حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو عربی اور عجمی زبانوں کے امتزاج سے عربی زبان بگڑ گئی حتیٰ کہ شہری حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو عربی اور عجمی شہری زبان استناد و اعتماد کے قابل نہ رہی اب عربی زبان کے محافظ علماء اس بات کے لئے مجبور ہوئے کہ دیہات میں جا کر خالص فصیح عربی زبان سیکھیں جو ہنوز ہر قسم کے اختلاط سے پاک تھی۔

عربی زبان کے تحفظ کے سلسلے میں علماء لغت کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر دوسری زبانوں کے اختلاط سے عربی زبان کو پاک نہیں کیا گیا تو عنقریب یہ پتہ لگانا مشکل ہو جائے گا کہ کون سا لفظ عربی ہے اور کون سا عجمی اس سلسلے میں علماء لغت نے ڈکشنریاں ترتیب دینی شروع کر دی۔ اس میں عربی و غیر عربی الفاظ کو بالکل علیحدہ کر دیا گیا اور عوام کی صحت الفاظی کے سلسلے اپنی مساعی جاری رکھیں وہ کلمات غیر فصیحہ پر نقد و جرح کرتے اور لوگوں کو ان کے استعمال سے باز رکھتے۔ انہوں نے عربی زبان کے تحفظ کے سلسلے میں جس عرق ریزی اور جانکاہی کا ثبوت دیا ہے دنیا کی کوئی زبان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

جہاں عربوں نے عربی زبان کے تحفظ و بقا کے لئے انتھک کوشش کی وہیں اہل ہند نے اس زبان کو عام کرنے اور غیر زبانوں سے اسے ممتاز کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اگرچہ کچھ صدیوں میں اس پر جمود طاری رہا لیکن بیسویں صدی میں اس پر جتنا کام ہوا شاید اس کی نظیر کسی صدی میں ملنا مشکل ہے اسی صدی

میں ہر موضوع پر علیحدہ ڈکشنری لکھی گئی۔ قدیم الفاظ کے لئے الگ ڈکشنری جدید لغات کے لئے علیحدہ اور قرآنی لغات اور اصطلاحات وغیرہ سب پر بہت زیادہ کام ہوا اور الحمد للہ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

بہر حال زندہ زبانیں ہمیشہ انسانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہیں اور ان میں نمود و ارتقاء ترمیم و اضافات کا عمل برابر جاری رہتا ہے اس لئے ان سے متعلق لغات کا کام بھی کبھی بند نہیں ہوتا پھر لغات کی دنیا میں ہر سال بہت سے الفاظ کے اضافہ کے ساتھ نئے ایڈیشن آتے ہیں ”آکسفورڈ“ سے شائع ہونے والی ڈکشنریوں نیز ”المنجد“ اور ”المورد“ کے ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ملے گا۔ لیکن عربی اردو ڈکشنریوں میں قدیم معاجم اور قوامیس ہی کل کائنات سمجھی جاتی ہے۔ جدید اضافے تہذیب و تنقیح کا کام برسوں سے رکا پڑا تھا۔ چونکہ ہندوستان میں عربی سے اردو کی چند ڈکشنریوں کے علاوہ کوئی ایسی جامع ڈکشنری موجود نہیں تھی جس میں قدیم و جدید، فنی و سائنسی تمام اصطلاحات موجود ہوں۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے اسی احساس کے پیش نظر اپنی پیرانہ سالی، کمزوری صحت اور ذیابیطیس کے مرض کے باوجود دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی کے آخری سالوں میں ایک ضخیم اور مفصل عربی اردو ڈکشنری کا کام شروع کر دیا جس کی تالیف مصر سے شائع شدہ مستند ڈکشنری المعجم الوسیط کو بنیاد بنایا اور اسی کے ساتھ دیگر متداول لغات کو بھی پیش نظر رکھا اور اس کام میں اس قدر انہماک دکھایا کہ سفر و حضر ہر جگہ مختلف مراجع اپنے ساتھ رکھتے اور کام برابر جاری رہتا ساتھ ساتھ کتابت بھی کراتے رہتے۔ بالآخر آپ نے اس کام کو مکمل کر کے ہی دم لیا لیکن وقت نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی طباعت و اشاعت آپ کی زندگی میں مکمل ہو پاتی۔ اس ڈکشنری کو مرتب کر کے جہاں مولانا وحید الزماں نے عربی داں طبقہ پر ایک عظیم احسان کیا ہے اور ان کی بہت سی مشکلات کو دور کر دیا ہے وہیں پر میں سمجھتا ہوں اس سے بڑا احسان مولانا عمید الزماں صاحب (برادر خورد مولانا وحید الزماں) کا ہے کیونکہ اگر آپ اس کی تکمیل کا بیڑہ نہ اٹھاتے تو یہ ڈکشنری بھی ان لاکھوں غیر مطبوعہ کتابوں اور مخطوطات کا حصہ ہوتی جن پر آج تک کسی نظر تک نہیں گئی یا پھر کچھ دنوں بعد ردی کی ٹوکری میں نظر آتی لیکن مولانا عمید الزماں صاحب نے برادر اکبر کے نقوش اور ان کے خوابوں کی تکمیل کے لئے اپنی عیش و آرام اور باعزت ملازمت تک کو خیر باد کہہ دیا (موصوف سعودی سفارتخانہ میں صحافتی سیکشن کے انچارج تھے) اور دن رات کی مسلسل محنت اور انتھک کوششوں کے بعد یہ ڈکشنری اس قابل ہوئی کہ اسے زیور طبع سے آراستہ کرایا جاسکے کیونکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے تھے جو مولانا نے ایسے وقت میں تحریر کئے تھے جہاں شاید کوئی مراجع مہیا نہ ہوئے ہوں بعد میں مراجعت وغیرہ کیلئے اس جگہ کو خالی چھوڑ دیا گیا لیکن بعد میں شاید اس کا موقع ہی نہ مل سکا ہو ان مقامات کو پر کرنا ایک مشکل ترین مسئلہ تھا۔ لیکن مولانا عمید الزماں صاحب نے اپنی عربی دانی اور فہم و فراست سے ان مقامات کو ایسے مناسب الفاظ سے پر کر

دیا کہ شاید مولانا بھی وہاں پر وہی الفاظ و معانی استعمال کرتے۔ پوری ڈکشنری کا لفظ بہ لفظ از سر نو معائنہ کیا گیا، جہاں کچھ شک و شبہ محسوس ہوا وہاں دوسری ڈکشنریوں سے مراجعت کی گئی اگر شک صحیح ثابت ہوا تو اس کی تصحیح کر دی گئی اور اس مراجعت کے دوران سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ ہر تبدیلی کے وقت مبدل منہ معنی و تشریح کے طول و اختصار کے پابند رہے کیونکہ پوری قاموس کتابت شدہ تھی۔ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس ڈکشنری کی تیاری میں مولانا وحید الزماں کے خاص شاگرد مولوی عبدالقدوس نیرانوی نے پورا پورا تعاون کیا۔ نظر اول، نظر ثانی اور نظر ثالث تمام مراحل میں پیش پیش رہے۔ آخری مرحلہ میں مولانا وارث مظہری کا بھی تعاون رہا۔ یہ ڈکشنری دو جلدوں میں اٹھارہ سو (۱۸۰۰) صفحات پر مشتمل ہے جس میں تقریباً ایک لاکھ صنعتی، سائنسی، علمی، ادبی، طبی، سیاسی، صحافتی تمام الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ڈکشنری کا سب بڑا کمال یہی ہے کہ اس میں موجودہ طبائع کی رعایت کے پیش نظر لغت عربی کو ایسے انداز پر ترتیب دیا گیا ہے جس سے استخراج لغت کافی آسان ہو گیا، ساتھ ہی اختصار عبارت کے لئے علامات ایسی مقرر کر دی ہے جن سے حروف کی حرکات الفاظ میں بیان کئے بغیر آسانی سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس ڈکشنری کی ترتیب میں جن چیزوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے وہ ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

- (۱) یہ ڈکشنری قدیم و جدید ایک لاکھ الفاظ پر مشتمل جامع ترین ڈکشنری ہے۔
- (۲) المنجد (مشہور عربی ڈکشنری) میں جو اغلاط ہیں ان سے پاک ہے اور اس کے مقابلہ میں الفاظ کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور لفظ کے معنی بھی زیادہ اور معنی خیز ہے۔
- (۳) دور حاضر کی ضروری اور مروجہ اصطلاحات بیان کی گئی ہیں۔
- (۴) کتاب و سنت اور اسلامی علوم فنون کی اصطلاحات اور ان کے خصوصی مفہیم کی تشریح اس کا طرہ امتیاز ہے۔

- (۵) وضاحت طلب مقامات پر قرآن و حدیث سے شواہد پیش کئے گئے ہیں۔
- (۶) المعجم الوسیط (قاہرہ) اس کی بنیاد ہے اس پر عربی انگریزی، القاموس العصری عربی انگریزی القاموس الاقتصادی، القاموس الطبی، القاموس القرآن اور لغات القرآن سے مفید اضافات کئے گئے ہیں۔

- (۷) اس میں ہر مادہ کو نمایاں رکھنے کیلئے ایک بڑا نقطہ شروع سطر میں لگایا گیا ہے۔
- (۸) ہر لفظ ابتداء سطر سے شروع کیا گیا ہے جس سے تلاش میں دشواری نہیں ہوتی۔
- (۹) افعال کے بعد تمام مصاور و مشتقات حروف تہجی کے طرز پر درج کئے گئے ہیں جس سے مراجعت آسان ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بڑی تلاش و محنت کے بعد الفاظ کے تطبیقی اور معنی خیز اصطلاحی ترجمہ کئے گئے ہیں جس کے باعث استفادہ کرنے والے تطبیق کی الجھن سے بچ جاتے ہیں۔ (۱)

## اصلاحی تصانیف

مولانا وحید الزماں نے عربی ادبیات اور لغات کے علاوہ دینیات کے موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی اور چھوٹی چھوٹی دینی کتابیں لکھ کر اور ان کے حقوق اشاعت فروخت کر کے ایک تو معاشی پریشانی کا حل نکال لیا دوسرا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ عوام جو باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری نہ رکھ کر دینیات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کو ان کتابوں کے ذریعہ آسانی مسائل کا حل مل سکے اور معاشرہ میں پھیلی چھوٹی چھوٹی برائیاں جو اکثر بھیانک قسم کا رخ اختیار کر لیتی ہیں۔ لوگوں سے وہ برائیاں ختم کی جاسکیں۔

چنانچہ اپنے اخلاقیات سے لے کر سماجیات تک شرائع سے بدائع تک بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ ڈالی۔ اگرچہ یہ کتابیں ضخامت کے اعتبار سے مختصر لیکن افادیت کے اعتبار سے بڑی بڑی کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کار آمد ثابت ہوئیں اور لوگوں میں یہ کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں اور ان کتابوں کا جو ذخیرہ شائع ہوا وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ کتابیں نایاب ہو چکی ہیں اور بڑی مشکل سے صرف چند کتابوں کی ایک ایک ہی کاپی مل سکی۔ ان کتابوں میں خدا کا انعام، اسلامی آداب، شرعی نماز، انسانیت کا پیغام، آخرت کا سفر نامہ، اچھا خاوند اچھی بیوی اور تخلیق کائنات ہیں۔

## شرعی نماز

اس کتاب کے نام سے جیسا کہ ظاہر ہے کہ فرائض اسلامی کے سب سے اہم فرض نماز سے متعلق ہے۔ اس میں احادیث کو بڑے مدلل انداز میں پیش کرتے ہوئے نماز سے متعلق فقہی مسائل بھی جا بجا ذکر کئے گئے ہیں۔ فضائل نماز کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مزید برآں احادیث کے ساتھ ساتھ اس فریضہ کے سلسلے میں قرآنی آیات کو بھی پیش کیا گیا ہے، ترغیبی و ترہیبی ہر قسم کی آیات و احادیث پیش کرتے ہوئے اس مضمون کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے، غرض مفید اور گراں قدر آرا کا مجموعہ اس کتاب میں موجود ہے۔

شروع میں اپنے نماز کا مطلب بیان کیا ہے کہ نماز کیا ہوتی ہے اور اس کا عبادات میں کون سا مقام و مرتبہ ہے اس کی ابتداء کیسے ہوئی پھر اس کی فضیلت قرآن و حدیث میں کیسے بیان کی گئی ہے اس کے بعد نماز کے اقسام، واجب، فرض، سنت، شرائط اور طریقہ کار، اگرچہ یہ کتاب بہت ہی مختصر ہے لیکن پھر بھی اس میں تمام نمازوں کے سلسلے میں مختصر اور ضروری مسائل سے بحث کی گئی ہے یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے

آپ اس کے مقدمہ میں وجہ تحریر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآن حکیم اور سنت نبویہ میں نماز کی تاکید و فضیلت اور اس کے فوائد بے شمار بیان کئے گئے ہیں۔ اگر ان تمام کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً ان کے لیے صفحات کی محدود تعداد کسی طرح کافی نہیں تاہم پیش نظر کتاب میں اس بات کا پورا لحاظ کیا گیا ہے کہ نماز کے فضائل و منافع، ابتداء فرضیت، فقہی اصطلاحات کی ضروری تشریح، نماز کی دعائیں اور وظیفے وغیرہ آسان اور عام فہم زبان میں اس مختصر سی کتاب میں پیش کئے جائیں تاکہ عوام الناس کو کم وقت اور تھوڑی محنت میں نماز کی ضروری معلومات اور مسائل وغیرہ سے واقفیت ہو جائے۔“ (۱)

### انسانیت کا پیغام

ہر انسان فطری طور پر دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے۔ ان کے باہمی روابط کی نوعیت تفصیل تر ہے۔ خلاصہ کے طور پر تمام انسانی تعلقات فرائض و حقوق میں منحصر ہیں، کسی کا کسی پر کوئی حق ہوتا ہے بحیثیت دوست، بحیثیت استاد، بحیثیت والدین، بحیثیت اولاد، بھائی، بہن، یہ تمام فرداً فرداً ایک دوسرے کے حقوق سے مرتبط ہیں، کوئی بھی شخص کلی طور پر مستقل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کا احترام کریں اور ان کو اچھے طریقے پر بجالائیں تو دنیا میں کسی قسم کا فساد برپا نہ ہو گا اور نہ ہی کسی طرح کی بد امنی پھیلے گی کیونکہ تمام فسادات کی جڑ سلب حقوق یا اپنے واجبات میں کوتاہی کے سبب ہے۔ چنانچہ مولانا نے اس مختصر سی کتاب میں انسانی حقوق و فرائض کو بیان کیا ہے۔ سماج میں رہنے کے لیے اور اپنے آپ کو ایک اچھا شخص ثابت کرنے کے لیے تمام ان واجبات کو ادا کرنا ضروری ہے۔ جو ایک انسان کے دوسرے انسان پر واجب ہے تاکہ ان حقوق پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کی صحیح اور سچی تعبیر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس کتاب میں سب سے پہلے انبیاء کے حقوق مختصر اُبیان بیان کئے گئے ہیں کیونکہ انھیں کے ذریعہ خداوند کریم کے تمام احکام بندوں تک پہنچے اور انہی کے ذریعہ حقوق انسانیت کا علم بلند ہوا انبیاء میں بھی سب سے پہلے حضور اکرم محمد مصطفیٰ کے حقوق بیان کئے گئے ہیں اس کے بعد درجہ بدرجہ تمام انسانوں کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل ہے جو اپنے موضوع پر نہایت ہی کامیاب ہے جو مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ (۲)

۱- ”مقدمہ شرعی نماز“ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۳۔

۲- ”مقدمہ انسانیت کا پیغام“ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۳۔



## اسلامی آداب

اسلامی قوانین اور تعلیمات جس طرح زندگی کے تمام گوشوں اور حیات انسانی کے تمام شعبوں کے لیے کامل و مکمل ہیں۔ اسی طرح اخلاقیات میں بھی اس کی تعلیمات انسان کو انسانیت کے اعلیٰ درجات پر پہنچانے کے لیے بے نظیر و بے مثال ہیں۔

علم الاخلاق جو مستقل فن کی حیثیت سے روشناس کرایا جاتا ہے اور اسکولوں و کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا اہم ترین جز ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علم الاخلاق کے متعلق اسلامی نظریہ عام علمی نقطہ نظر سے کہیں زیادہ اور وسیع تر ہے کیونکہ علم الاخلاق کے تمام نقطہ نظر کے مطابق صاحب اخلاق اگر سعادت و فضیلت کے اعلیٰ درجات پر پہنچتا ہے تو اس کا دائرہ صرف دنیا ہی تک محدود ہے جو فانی اور زوال پذیر ہے اس کے برخلاف اسلامی علم الاخلاق دنیاوی فضائل و سعادت کے ساتھ ساتھ اخروی فضائل و سعادت کا بھی کفیل و ضامن ہے۔ پھر یہ کہ اسلام میں صرف نظریاتی علم الاخلاق ہی نہیں بلکہ اس میں مکمل اخلاقی تربیت اور اخلاقی فاضلہ کے عملی مظاہر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ کتاب اسلامی آداب کے لحاظ سے ایک مکمل اور تقریباً معاشرہ میں جن چیزوں کی اہمیت ہے اور اسلام میں ان آداب کے ملحوظ رکھنے کو نہایت ضروری قرار دیا گیا ہے حضور اکرمؐ نے بھی اپنی بعثت کا مقصد اخلاقی تربیت بیان کیا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ ”انما بعثت لا تتم مکارم الاخلاق“ لہذا اس مختصر سی کتاب جو صرف ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے ان تمام چیزوں کو مختصر اُسیٹھ کی کوشش کی گئی ہے جس کی تعلیم حضور اکرمؐ نے اپنے اخلاق کریمانہ سے پیش کی ہے۔ اگرچہ اس میں علم الاخلاق کے موضوع پر ان صفحات میں تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی اور نہ اسلامی علم الاخلاق اور جدید علم الاخلاق کی تعریفات اور ان کے ذوق و باہمی امتیازات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مختصر طور پر ان اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی گئی جو روزمرہ ہماری زندگی کے لیے کارآمد ہیں اور ان پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ ان میں انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے اخلاق و عادات یعنی حقوق و آداب۔ اجتماعی و شخصی فضائل و محامد کو ضروری اور بقدر کفایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب شخصی فضائل و اخلاق کے بیان میں، دوسرا باب اجتماعی فضائل و اخلاق کے بیان میں، تیسرا باب آداب کے بیان میں اور چوتھا باب اخلاقی امراض کے بیان میں، یہ چاروں ابواب متعدد فصولوں پر مشتمل ہیں۔ (۱)

## خدا کا انعام

یہ ایک بہت ہی مختصر کتاب ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اگرچہ حجم کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”اسلامی آداب“ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۴۔

افادیت کے اعتبار سے بڑی بڑی کتابوں سے کم نہیں ہے، یہ بھی اسی سیریز کا ایک حصہ ہے جو اپنے دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد قیام دہلی کے دوران لکھی، اس کتاب میں ان اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جو ہم پر لازم ہیں اور جو چیز لازم ہوتی ہے ان پر دنیاوی اعتبار سے انعام حاصل کر لینا ضروری نہیں چہ جائیکہ کہ ان پر کوئی نہ کوئی انعام مل جائے البتہ جو چیزیں ہم پر واجب اور فرض قرار دیدی گئی اگر ان کو بحسن و خوبی ادا کر لیا جائیں تو بسا اوقات انعام مل جاتا ہے۔

چنانچہ اس کتاب میں ان اہم چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جو ہم پر لازم ہیں اور وہ چیزیں ہماری ڈیوٹی میں شامل ہیں، طوعاً و کرہاً ہمیں کرنا ہے مثلاً ایمان باللہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اکل حلال یہ سب چیزیں ہم پر واجب ہیں اور ان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے انکار سے کفر اور نہ کرنے سے گناہ لازم آتا ہے، یعنی ہم لوگ ان پر عمل کرنے کے لیے مجبور اور پابند ہیں اور ان کاموں کی اجرت اللہ رب العزت نے ہم کو پہلے ہی عطا کر دی ہے۔ یعنی اس کائنات کی تمام نعمتیں ہوا، پانی، آگ، مٹی، اس کے علاوہ اشرف المخلوقات بنانا اور عقل و شعور سے نوازا غرض یہ کہ کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جس سے ہم کو نوازا نہ گیا ہو۔ لہذا ان نعمتوں کے بدلے ہم پر کچھ چیزیں لازم بھی کر دی گئی اور کچھ چیزوں پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ یعنی ان نعمتوں کے بدلے کچھ اعمال کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے اجرت دی گئی اور پھر کام کا مطالبہ لہذا ایسی صورت میں ہمیں وہ کام بحسن و خوبی انجام دینا چاہیے۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے بنائے اصولوں کے مطابق کام کرو گے تو اس کام اور اس کی حسن و خوبی کے اعتبار سے انعام بھی دیا جائے گا اور وہ انعامات ابدی ہوں گے۔

چنانچہ مولانا وحید الزماں صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں پہلے ان اعمال کا تذکرہ کیا پھر ان اعمال پر ملنے والے انعامات کا تذکرہ کیا مثلاً سب سے پہلے ایمان و عمل صالح کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد اس پر ملنے والے انعامات کا تذکرہ کیا ہے کہ جس شخص کا ایمان جس قدر کامل ہو گا اسی اعتبار سے اللہ رب العزت اس کو آخرت کے آرام اس کی مغفرت اور جنت جیسی بڑی بڑی نعمتوں سے نوازے گا۔ اسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی صحیح ادائیگی پر مختلف قسم کے انعامات حاصل ہوں گے۔

اگرچہ یہ کتاب بہت ہی مختصر ہے لیکن جو چیزیں اس میں بیان کی گئی ہیں وہ مستند ماخذوں پر مبنی ہیں ان کو پڑھتے وقت اس پر نظر جائے گی کہ اس کتاب کے لکھنے میں حدیث اور تفسیر کی بڑی اور مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے یہ مختصر رسالہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جس موضوع پر بھی مولانا لکھتے اس کے لیے مواد جمع کرنے میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے اس میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ بہت ہی مستند ہے (۱)

## تخلیق کائنات

مولانا وحید الزماں "کیرانوی کو قدرت خداوندی نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ ادیب اور ماہر لغت کی حیثیت سے ممتاز تھے وہیں پر حد درجہ حساس اور علم سے گہرا لگاؤ بھی رکھتے تھے تفسیر میں بھی وہ لطیف و پاکیزہ ذوق کے حامل تھے۔ ہر کام میں عمدگی اور جدت ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے ان کی حیثیت ایسے آلہ کی تھی جو فضاء کی ہلکی سی جنبش اور ہلکی سے ہلکی تھرا تھراہٹ کو بھی ریکارڈ کر لیتا ہو۔ عربی زبان و ادب کے ساتھ قرآن پاک اور تفسیر سے تعلق بھی عہد طفولیت سے ہی تھا اور یہ بھی آپ کے والد ماجد کی تربیت کا اثر تھا۔ چونکہ والد محترم کا شغل قرآن پاک سے بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک کی تعلیم کے دو دودرسہ کی نگرانی کرتے تھے۔

مولانا کیرانوی مفتی محمد شفیع صاحب کے علمی کاموں سے کافی متاثر تھے اور ان سے قلبی تعلق بھی تھا طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان کی تفسیر "معارف القرآن" کا مطالعہ کرتے رہتے اور اکثر و بیشتر اس تفسیر کے علمی و تاریخی مضامین اپنے رسالہ "ماہنامہ القاسم" اور "دعوة الحق" میں "من توجہ القرآن" کے نام سے شائع بھی کرتے رہتے۔ گویا کہ مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کی تفسیر پر شروع ہی سے گہری نظر تھی اور اسی زمانہ میں اس تفسیر کو بنیاد بنا کر کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن وقت کی تنگی، کام کی مشغولیات اور نامساعد حالات نے کبھی آپ کو اس کام کے لیے فرصت نہیں دی۔ لیکن جب آپ نے دارالمؤلفین قائم کیا اور اس ادارہ سے اپنے اکابر کی کتابیں اور ان کی علمی خدمات کو اجاگر کرنے اور ان کی تحریروں کی تسہیل و تفہیم پر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اس تفسیر پر کام کرنا شروع کیا اور دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد تو پوری توجہ اسی پر صرف کر دی اور زندگی کے آخری دور ۱۹۹۴ء میں مفتی صاحب کی آٹھ جلدوں پر مشتمل اس مقبول عام تفسیر کے منتخب، تحقیقی، علمی اور تاریخی مضامین کو "جواہر المعارف" کے نام سے مرتب کیا، جس کی پہلی جلد ادارہ دارالمؤلفین سے تخلیق کائنات کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ چھ سو اسی صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں تخلیق کائنات، خلافت الہیہ، بعثت انبیاء، توحید و رسالت، جزاء و سزا سے متعلق تفسیری مضامین و مباحث کو منتخب کیا ہے۔ ان مضامین کو اپنے سلسلہ دار اور ایسی مربوط شکل میں پیش کیا جس سے قاری کو اصل متن دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو بلکہ اس کے سامنے ایک کے بعد ایک چیز خود بخود واضح ہو جائے مثلاً شروع میں آپ نے تخلیق کائنات کو بیان کیا ہے، پھر اس کے بعد نمبر آتا ہے تخلیق آدم کا تخلیق آدم کے بعد پھر انبیاء انبیاء میں درجہ بدرجہ اور مرتبہ کا خیال کیا گیا ہے، "جواہر المعارف" کے تمام مضامین اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔ البتہ مضامین کی ترتیب بالکل مختلف ہے، تفسیری ارتباط ختم کر کے مستقل مضمون کی حیثیت دینے کے لیے کہیں کہیں حذف عبارت اور اضافہ اس طرح کیا گیا

ہے کہ مضمون یا مقاصد میں کوئی تغیر و نقص پیدا نہ ہو<sup>(۱)</sup> ان تفسیری مضامین کو مرتب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”احقر نے اس تفسیر کا بالاستیعاب تو مطالعہ نہیں کیا ہے۔ البتہ وقتاً فوقتاً اس کے تحقیقی مباحث نظر نواز ہوتے رہے، ان مضامین و مباحث کی بجائے خود عمومی افادیت کے پیش نظر خیال آیا کہ اس قرآنی خدمت میں احقر کا بھی معمولی سا حصہ ہو جائے، تو شاید کفارہ سینات ہو جائے اور حضرت مفتی صاحب کے علوم و معارف کا دائرہ وسیع کرنے کی ایک گونہ سعادت حاصل ہو جائے۔“

اس خیال کے پیش نظر احقر نے بنام خدا اپنے امراض اور متعدد مصروفیات کے باوجود چار سال قبل اس خدمت کا آغاز کیا، ابتداً جن مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے وہ طویل بحثیں تھیں۔ جو حضرت مفتی صاحب نے مستقل عنوانات کے تحت ان کو تحریر فرمایا تھا۔ ان کو پانچ ابواب پر مستقل عنوانات کے تحت تحریر فرمایا تھا۔ ان کو پانچ ابواب پر تقسیم کر کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب برائے طباعت تیار ہو چکی تھی۔ پانچ ابواب یہ تھے: عقائد و عبادات، احکام و تعلیمات، اخلاق و معاشرت، فضائل و خصائص اور واقعات و شخصیات۔

کتاب پر لیس میں جانے والی تھی کہ یکا یک خیال آیا کہ تفسیر پر ایک نظر اور ڈالی جائے تاکہ مزید مضامین منتخب کر لیے جائیں۔ چنانچہ ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہوا لیکن دشواری یہ تھی کہ اکثر مضامین تفسیری سلسلہ سے مربوط تھے چنانچہ کوشش و محنت کے بعد منتخب بحثوں کو تفسیری سلسلہ سے اسی طرح علیحدہ کرنے کی سعی کی گئی کہ وہ مستقل مضامین بن جائیں اور ماقبل سے ایسا ربط بھی نہ رہے کہ مطالعہ کنندگان کو ماقبل کی مراجعت ضروری ہو جائے۔ اس عمل پر التزام یہ کیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کی عبارت میں کوئی تفسیر و اضافہ قطعاً نہ ہو عنوانات بھی انہی کے باقی رہے۔ البتہ تفسیری ارتباط ختم کر کے اور مستقل حیثیت دینے کے لیے کہیں حذف عبارت کی ضرورت پیش آئی تو حسب ضرورت اسے اس طرح کیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کے مضمون یا مقاصد میں کوئی تغیر و نقص پیدا نہ ہو، نیز ہر بحث و مضمون کا اصل عنوان اگرچہ قائم کیا گیا ہے لیکن وہ حضرت علیہ الرحمۃ کے عنوانات سے ہی ماخوذ ہے۔

چونکہ یہ مستقل تصنیف نہیں ہے کہ تمام مضامین و مباحث میں ربط اور تفصیل و اختصار کا توازن ہو، یہ تفسیری مباحث ہیں جو حسب موقع تفصیل و اختصار اور بعض جگہ تکرار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ناظرین کرام کو یہ بات ملحوظ رہے گی تو کوئی الجھن پیش نہ آئے گی:

”پیش نظر کتاب میں پہلے تخلیق کائنات سے متعلق مضامین ہیں اس کے بعد تخلیق

۱- تفصیل کے لیے دیکھئے ”کوہ کن کی بات“ مولانا نور عالم خلیل الایمنی ص ۶۹۔

انسان جس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت اور ان کی دعوت و تبلیغ دین، توحید رسالت، اصلاح اعمال جزاء و سزاء اور پھر قیامت اور اس کے متعلق مضامین ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ کائنات کا وجود انسان کے لیے عمل میں آیا اور انسان کا وجود خدا کی عبادت کے لیے ہوا اس لیے یہ ترتیب قائم کی گئی درمیان میں بہت سی متعلقہ تحقیقات بھی آگئی ہیں۔ ان تمام مضامین میں ایسا ربط تلاش کرنا مناسب نہ ہو گا جیسا کہ باضابطہ تصنیف میں ہوتا ہے“ (۱)

## معاصرین کی نظر میں مقام و مرتبہ

مولانا انظر شاہ کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، وقف) وہ شخص ہیں جنہوں نے ایک عرصہ مولانا وحید الزماں کے ساتھ گزارا ان کا عسریہ دیکھا۔ ان کی طالب علم کے زمانہ سے لے کر آخری عمر تک کی زندگی سے مکمل طور پر واقف تھے پھر دونوں حضرات نے بحیثیت استاد دارالعلوم دیوبند میں ایک مدت تک ساتھ ساتھ کام بھی کیا۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف تھے۔ اگرچہ آخر میں بعض ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی عظمت کے قائل تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد ابناء قدیم کے تعزیتی جلسہ میں مولانا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا انظر شاہ صاحب نے فرمایا:

”اس اسٹیج پر کچھ لوگ مولانا سے بڑے ہوں گے، کچھ چھوٹے ہوں گے، لیکن غالباً میں واحد شخص ہوں جو مولانا کا رفیق درس رہا ہوں اور جس نے مولانا کی طالب علمی کی زندگی دیکھی ان کا عسریہ دیکھا۔ ان کا عروج دیکھا اور پھر ان کو زبردستی ایک خوفناک و المناک زوال میں مبتلا کرنے کی ناپاک کوشش کا بھی مشاہدہ کیا، میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے عسر کے باوجود کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، انہوں نے اپنے توکل، عزت نفس اور قناعت کو جو ان کے قلب دروہ میں ودیعت تھی کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی..... مولانا وحید الزماں اپنے بڑوں کی شان میں کبھی گستاخ نہیں تھے وہ جس بات کو حق سمجھتے بر ملا اس کا اظہار کرتے، لیکن اگر کبھی ان سے چوک ہو جاتی اور پھر انھیں معلوم ہو جاتا کہ سیدھی راہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے تو مولانا کو راہ بدلنے اور صراط مستقیم اختیار کرنے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا مجھے بارہا اس کا تجربہ ہے۔ مولانا کا ذہن انقلابی اور تعمیری تھا۔ وہ جدوجہد کے خوگر تھے۔ لیکن ان میں ضد اور ہٹ دھرمی یا کسی کی توہین کا جذبہ بالکل نہیں تھا۔ اگر وہ دیکھتے کہ کسی معاملہ میں انصاف دوسری جانب

ہے تو اپنے فیصلے سے رجوع کرنے میں نہ ان کو حجاب محسوس ہوتا تھا نہ عار مولانا وحید الزماں ایک مردم ساز شخصیت تھے اور مردم ساز شخصیتیں دو چار ہوتی ہیں جن میں ایک مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی شخصیت تھی اور (بیچ کی کڑویوں کو چھوڑے ہوئے) پھر مولانا وحید الزماں صاحب کی شخصیت تھی۔

آپ یوں نہ کہیے کہ مولانا وحید الزماں صاحب علامہ، بحر العلوم اور ملک العلماء تھے وہ سب کچھ تھے لیکن ان کا اصلی جوہر یہ تھا کہ وہ انسان بناتے تھے۔ اپنی دیدہ وری اور تربیت سے وہ بہت سی زندگیوں کو سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔

جہاں تک یادگار کا معاملہ ہے تو کان کھول کر سن لیا جائے کہ مولانا وحید الزماں صاحب کسی کے محتاج نہیں ہے۔ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کوئی یادگار قائم کرتے ہیں تو ان پر کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ان کے غیر معمولی احسانات کے تئیں آپ کی ممنونیت کا معمولی اظہار ہوگا۔ مولانا کے تلامذہ و محبین کا فرض ہے کہ ان کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے ادھرے کاموں کی تکمیل کریں اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنائیں۔“ (۱)

حضرت مولانا صدیق احمد باندوی : ہر کا ہم جو اس زمانہ کے شیخ طریقت بھی رہے اور آپ کا شمار یگانہ روزگار اور عہد حاضر کے بہت بڑے بزرگ کی حیثیت سے ہے۔ مولانا سے آپ کا تعلق بہت قریبی تھا اور مولانا وحید الزماں صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ مولانا کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں لکھتے ہیں:

”مولانا مرحوم سے میرا تعلق دیرینہ رہا ہے۔ راقم ان کی شرافت نفس، حق گوئی و بے باکی، اخلاص فی العمل اور دوسری گوناگوں خوبیوں بالخصوص عربی زبان و ادب میں ان کی مہارت و خدمات اور انتظامی صلاحیت سے بہت متاثر تھا۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ مولانا کچھ دنوں کے لیے باندہ آکر مدرسہ میں قیام کریں، یہاں کے نظم و نسق کا معائنہ کریں اور انتظامی اصلاحات کے لیے مشورہ دیں، نیز ان کی زیر نگرانی یہاں عربی زبان میں تخصص کا شعبہ قائم کیا جائے مولانا مرحوم نے میری تجویز بڑے انشراح قلب کے ساتھ منظور کر لی تھی اور انھوں نے کئی بار سفر کا عزم بھی کیا، لیکن افسوس کہ ناگہانی عوارض، ان کی مسلسل علالت اور پھر انتقال پر ملال کی وجہ سے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔“ (۲)

مولانا اسیر ادروی : ایک عظیم مصنف بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کے اچھے دوستوں میں

۱- مولانا انظر شاہ کشمیری ”ترجمان دارالعلوم جدید“ نئی دہلی ج ۲، شمارہ ۱۱-۱۲، اپریل- مئی ۱۹۹۵ء ص ۲۲-۲۳۔

۲- مولانا صدیق احمد باندوی ”ترجمان دارالعلوم جدید“ خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۲۱۔

سے تھے دونوں کے درمیان ذہنی و فکری رشتہ بھی تھا۔ دونوں جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ تھے۔ اس اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف تھے یہاں تک ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے بھی باخبر رہتے تھے آخری عمر تک تعلقات نہایت ہی خوشگوار رہے۔ مولانا کی وفات پر ایک بہت ہی طویل تعزیت نامہ لکھا جس میں مولانا کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تعزیتی مقالہ کا کچھ حصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

مولانا کیرانوی قدرت کی عطا کردہ حیرتناک صلاحیتوں کا ایک دلنواز پیکر تھے۔ نیت کے سچے، دھن کے پکے، جدوجہد کا مزاج، اخلاص ان کا جوہر ذاتی، دماغ الوالعزمانہ منصوبوں اور اسکیموں کا خزانہ، اپنی ہر اسکیم اور ہر منصوبہ میں انتہا پسند، آغاز و انجام میں ان کے نزدیک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہتا تھا جس کام کا آغاز کرتے دھوم دھام سے کرتے اور انجام تک پہنچ جانے کا حوصلہ رکھتے۔ عملی جدوجہد کا کوئی بھی خاکہ بناتے تو اس میں رنگ بھرنے میں پے درپے ناکامیاں بھی ان کا حوصلہ پست نہیں کر سکتی تھیں، ان کو نچلا بیٹھنا نہیں آتا تھا وہ سیماب صفت انسان تھے۔ انھیں احاطہ دارالعلوم میں باریابی کا موقع ملا تو پہلے ہی مرحلہ پر انھوں نے سوچا کہ جدید عربی صحافت و وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ دارالعلوم کے طلبہ کی اس سے محرومی ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئی انھوں نے عزم بالجزم کر لیا کہ وہ اس سمت میں طلباء دارالعلوم کی مکمل رہنمائی کر کے ان کو منزلوں تک پہنچا کر رہیں گے اور انھوں نے کام کا آغاز کر دیا۔ اس منصوبہ میں ان کا کوئی شریک و سہم نہیں تھا وہ تنہا اس مہم کو سر کرنے کے لیے چل پڑے اس مرحلہ پر ان کی سیمابی فطرت کا مظاہرہ بار بار ہوتا رہا۔ انھوں نے پرانے طریقہ تدریس کو بدل دیا جس میں سارا بار استاد پر ہوتا تھا انھوں نے طلبہ کی اصولی رہنمائی کرنے کے بعد سارا بار طلبہ پر ڈال دیا۔

مولانا کیرانوی اسم با مسمیٰ تھے۔ تگ و دو ان کے خمیر میں شامل تھی وہ جس طرف رخ کرتے تھے تو پورے عزم و ارادہ اور اپنی فطری توانائیوں کے ساتھ کام کرتے تھے پھر اس کام کے لیے اپنا پورا وجود وقف کر دیتے تھے۔ دارالعلوم میں انقلاب کے بعد نئے نظام میں ارباب مجلس شوریٰ نے ان کو معاون مہتمم بنا دیا۔ انھوں نے نہ اس کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نہ ہی اس کے طالب تھے۔ یہ دارالعلوم کا عبوری دور تھا پورے نظام پر کنٹرول کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔ ارباب شوریٰ کی نگاہ میں اس کام کے لیے مولانا کیرانوی سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی۔ ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو یہ عہدہ سونپ دیا گیا۔ اب ان کی ساری توانائی اسی محاذ پر صرف ہونے لگی اور شب و روز نئے نظام کو مستحکم بنانے میں مصروف ہو گئے۔

مولانا کیرانوی کا ذہن بہت تیز سوچتا اور فیصلہ کرتا تھا۔ ان میں قوت فیصلہ بدرجہ اتم موجود تھی۔

کبھی وہ کسی مسئلہ میں جیص و بیص کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ سوچا، غور کیا اور فیصلہ کر لیا اور کام کا آغاز کر دیا۔ وہ جمعیت علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور اس کے شعبہ مرکز دعوت اسلام کے سربراہ تھے، عہدہ قبول کرتے ہی انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کا دائرہ کار متعین کر لیا اور کام کا خاکہ بنالیا۔ انھوں نے اس شعبہ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا پلان بنایا اور سب سے پہلے میری تحریر شدہ کتاب ”جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار“ کو اس ادارہ سے شائع کرایا اس کام میں اتنی سرعت دکھائی کہ صرف چار مہینہ کے قلیل وقفہ ہی میں یہ کتاب منظر عام پر آگئی۔ مولانا کیرانوی بڑے وضع دار عالم تھے۔ جب بہت قریب سے ملتے تب اس کا اندازہ ہوتا ہے وہ اساتذہ ہی کو نہیں بلکہ طلبہ کو بھی خود شناس بنانا چاہتے تھے ان کا نظریہ تھا کہ علماء کو اس انداز سے رہنا چاہیے کہ دوسروں کی ان پر حقارت آمیز نظر نہ پڑے دوسروں کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہوں۔ اس کے لیے خود شناسی ضروری ہے، خود داری غرور نہیں ”من لم یکرم نفسہ لایکرم“ کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ طلبہ کے اگر ہاتھ میں روٹی اور کٹورے میں سالن وغیرہ لے جاتے دیکھ لیتے تو فوراً تنبیہ فرماتے اور نصیحت کرتے کہ سالنوں اور فقیروں کی وضع اختیار کرو گے تو دنیا تمہاری کیا عزت کرے گی تمہارے ہی جیسے لوگ علماء کے وقار کو مجروح کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

آپ فرماتے! کہ:

”غربت اور امارت سے وضعداری میں فرق نہیں آنا چاہئے، دونوں صورتوں میں انسان کو اپنی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، احساس خودی انسان کی بہت بڑی دولت ہے، آئینہ میں چمک نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تواضع و انکساری یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر دو، وہ چاہتے تھے کہ اساتذہ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں، جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے حوصلے مرجائیں گے اس کی امنگیں دم توڑ دیں گی ایسا آدمی کبھی بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اس کا نفس کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا اس لیے عربی مدارس سے وابستہ ہر ایک کو ایک خود دار انسان کی طرح دوسروں کے سامنے آنا چاہیے“ (۱)

مولانا صدر الدین انصاری : ایک مشہور و معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ مولانا وحید الزماں صاحب اور آپ نے جمعیت میں ایک ساتھ کام کیا دونوں ہی جمعیت علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، جمعیت سے اختلاف کے باعث دونوں نے ہی جمعیت سے علیحدگی اختیار کر لی، پھر جب مرکزی جمعیت علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تو



مولانا وحید الزماں صاحب کو صدر اور آپ کو ورکنگ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ علم و فضل کی کمالت کے ساتھ ساتھ سیاست کے بھی داؤں پیچ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی کے ایک ایک گوشہ سے اچھی طرح واقفیت ہے۔ ان کی وفات پر ایک مختصر مگر جامع اور حقائق سے لبریز ایک تعزیت نامہ لکھا جو پندرہ روزہ ”خبردار“ دہلی میں شائع ہوا اس تعزیت نامہ کا کچھ حصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

”مولانا وحید الزماں کی عمر اگرچہ ۶۴ سال تھی مگر اس پوری زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں وہ متحرک، مستعد اور فعال نظر نہ آئے ہوں۔ جہد مسلسل اور عمل پیہم کا نام تھا مولانا وحید الزماں کیرانوی۔

مولانا کی شخصیت ان کی تعمیری، تعلیمی طویل خدمات اور کارناموں کی وجہ سے اس قدر محبوب اور ہر دلعزیز ہو گئی تھی کہ ہر خاص و عام فرط عقیدت و محبت اور انتہائی احترام سے ان کا نام لیتا تھا اور سر جھکا تا تھا۔ ان کی محبوبیت، مقبولیت اور مرجعیت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ رجال سازی ان کا ایک اہم اور وصف خاص تھا۔ انہوں نے بہت سے سنگ ریزوں کو ہمپایہ لعل و گوہر بنایا، خاک سے اٹھا کر افلاک پر بٹھایا، غریب و نادار اور غیر مستطیع طلباء کی ہر محاذ پر اعانت، حوصلہ افزائی اور دل جوئی کر کے ان کے لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کو حصول علم کے لیے مرکوز کیا۔ کڑی محنت، نظم و ضبط، ڈسپلن، حسن اخلاق، ادب و شائستگی ان کی تعلیم و تربیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں جس قدر لگن اور کڑی محنت سے علم حاصل کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کے تلامذہ بھی اس نہج اور طرز کے عادی ہوں وہ کسی بھی کام میں جمود و تعطل کو پسند نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ ان کے تلامذہ پوری دنیا میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً ہزاروں کی تعداد میں اہم اور کلیدی عہدوں پر سرفراز ہیں اور پوری ذمہ داری سے مفوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

وہ عربی زبان و ادب کے رمز آشنا اور نکتہ شناس تھے۔ ان کی عربی، ادبی تخلیقات مدارس عربیہ اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں، بلاشبہ وہ طلباء کے محسن، سرمایہ رحمت ربانی اور شفیق باپ کا درجہ رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے جنازہ میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد سات ہزار سے بھی زائد تھی جو سو گوار اور اشکبار تھے۔

نظم و نسق اور حسن کا کردگی کے اعلیٰ اوصاف اور خوبیوں کی وجہ سے وہ دارالعلوم

کے معاون مہتمم بنائے گئے۔ ہر شعبہ میں نمایاں ترقی ہوئی اور عرصہ سے چلی آرہی بد نظمی دور ہوئی اور تعطل ختم ہوا۔ طلباء مسرور و مطمئن اور اساتذہ و ملازمین خوش ہوئے۔“ (۱)

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی : مہتمم مدرسہ عربیہ منج العلوم، موائی بارہ بنکی مولانا وجید الزماں کے غم و خوشی عسرویسر ہر حال میں مولانا کے ساتھ رہے، دونوں طرف سے ہمیشہ جذباتی لگاؤ تھا۔ ایک مشکل ترین دور میں مل جل کر کام کر چکے تھے۔ دارالفکر جن چار ستونوں پر قائم تھا ان میں سے ایک مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی صاحب بھی تھے ماہنامہ ”القاسم جدید“ جو دارالفکر سے شائع ہوا کرتا تھا اس کے ایڈیٹر بھی رہے، ہر کام میں ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کرتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے راز و نیاز سے بھی واقف تھے۔ مولانا کی وفات پر آپ نے اپنے ایک تفصیلی تعزیت نامہ لکھا، جس میں آپ کی شروع زندگی سے لے کر انتقال کے وقت تک کے تمام حالات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تعلقات کی بنا پر حقائق سے چشم پوشی اور کسی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس طویل مقالہ کے کچھ حصہ کو یہاں تحریر کرتے ہیں۔ آپ کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

”میں نے مولانا کا عروج بھی دیکھا ہے جب کہ اچھے اچھے قبلہ نما حضرات مولانا کے گرد و پیش لگے رہتے تھے بعض تو مولانا کے مکان، زماں منزل، کی طرف آتے ہوئے دیوان دروازہ کے سامنے ہی سے بغرض ”خفض جناح الذل“ سینہ دھنسا کے مونڈھے جھک لیتے تھے تاکہ مولانا کے سامنے پہنچتے ہی اظہار خشوع و خضوع میں ٹائم نہ لگے، اگرچہ اس قسم کے بہر دیوں کی کچھ کمی نہ تھی لیکن مولانا مرحوم کے فدا یوں اور شیدائیوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جو نہایت مخلص اور مولانا مرحوم سے والہانہ و عقیدت مندانہ تعلق رکھتی تھی اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنوں کے یعنی اپنائیت کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھوں بہت کچھ نقصان اور اذیت پہنچی مشکل کی گھڑی میں ماضی کے بیشتر احباب و متعلقین نے مصلحت اندیشی اور بے وفائی کا مظاہرہ کیا۔ اسی بات کا اظہار کسی نے بایں طور کیا ہے۔

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے..... دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے۔

مولانا مرحوم جس نوع کی دماغی، روحانی و جسمانی اذیتوں سے دوچار تھے وہ تکلیف دہ بات تو تھی ہی مجھ جیسے حساس انسان کو یہ دیکھ کر شدید ذہنی اذیت ہوتی تھی کہ وہ لوگ بھی مولانا سے محبت اور گریزاں تھے جن پر مرحوم کے بے انتہا احسانات تھے اور جو کسی

زمانہ میں اگر میں مبالغہ کی زبان استعمال کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے تلوے چاٹا کرتے تھے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مولانا مرحوم کمزوریوں سے پاک تھے ان سے غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں یا ان کا ہر قدم قابلِ تائید تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی مبنی بر خلوص رہا ہو پھر بھی ہم لوگ عموماً جوابی کاروائی یا انتقامی اقدام کے وقت ”وان عاقبتہم فعاقبو بمثل ماعو قبتہم بہ“ کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں شاید مولانا کچھ اسی قسم کی صورتِ حال کا شکار ہو گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی طرف سے زیادتی ہوئی لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا پر ظلم ہوا ظاہر ہے کہ اب بحث سے کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ جن لوگوں پر الزام ہے کہ انھوں نے مولانا کے ساتھ زیادتی کی، ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کہ جامہ انتقاء میں ملبوس ہیں اور یہی وہ جامہ ہے جو نہ صرف یہ کہ الزام پر وف ہوتا ہے بلکہ الزام شکن بھی۔

دارالعلوم میں جس قدر ظاہری و معنوی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ اظہر من الشمس ہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وہ سب مولانا مرحوم کی شب و روز کی محنت و جگر کاوی ہی کا ثمرہ تھیں اور ہیں، جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے مولانا اپنی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے (جو کسی بھی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے) اور ہار نہ ماننے والے مزاج کی وجہ سے انتقامی کاروائیوں کی زد میں آگئے علاوہ ازیں مولانا کا کوئی قصور نہ تھا۔ لوگوں کو مولانا کی ذات سے ہی پرِ خاش تھی۔

سألت و ما ذنبی فقالت مجيبة وجودك ذنب لا يقاس به ذنب  
مولانا کا مزاج تھا کہ جو کچھ سوچتے ہیں فوراً متشکل ہو کر سامنے آجائے ورنہ برافروختہ ہو جاتے اسی مزاج کی وجہ سے راقم الحروف کی مولانا مرحوم سے کبھی نہیں بنی لیکن دلی تعلقات اور جذباتی لگاؤں میں کبھی کمی نہیں آئی ”اللہ تعالیٰ مرحوم کی نعتوں کو معاف فرمائے آمین۔“

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے“ (۱)  
پروفیسر زبیر احمد فاروقی سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی فاضل دارالعلوم دیوبند آپ کا شمار عربی کے ایک کامیاب استاد اور مصنف و مترجم کی حیثیت سے ہوتا ہے، عربی و غیر عربی حلقہ میں آپ کی کافی شہرت ہے، مختلف رسائل و اخبارات میں سو سے زیادہ مقالہ شائع ہو چکے ہیں، مولانا وحید الزماں

کیرانوی سے بہت اچھے تعلقات رہے اور کسی موقع پر بھی کبھی کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا، مولانا کی وفات پر ایک تعزیتی مقالہ لکھا جس میں آپ نے مولانا کی علمی و ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا اس مقالہ کے کچھ خاص حصوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

”عالمانہ بصیرت، عملی جدوجہد، مقصد کی لگن، حق گوئی و بیباکی، خلوص و تواضع، حکمت و تدبیر و وسعت نظر، انتظامی مہارت، وقار و تمکنت اور تلخ نوائی برائے کارِ تریاتی، ان تمام عناصر کو یکجا کرنے سے جو انسانی تصویر ابھرتی ہے وہ ہے مولانا وحید الزماں مرحوم جیسی شخصیت کی تصویر مولانا مرحوم کی شخصیت میں ”علماء“ کی تمام صفات صالحہ موجود تھیں لیکن وہ ”مولویوں“ کی تنگ نظری اندھی تقلید، کم علمی کے ساتھ کبر و نخوت، بغض و حسد، سہولت پسندی، محنت و مشقت سے اجتناب اور سازشی ذہنیت جیسے ناپسندیدہ اوصاف سے کوسوں دور تھے۔

مولانا کی شخصیت کا جو اصلی جوہر تھا اور جو انہیں اپنے متقدمین اور ہم عصروں سے نمایاں طور پر ممتاز کرتا ہے وہ ہے مردم سازی کے میدان میں ان کی بے پناہ صلاحیت، دارالعلوم کی تاریخ میں بڑے بڑے بحر العلوم اور اساتذہ فن گزرے ہیں۔ ایسے علماء جو علم و فن کے میدان میں اپنی مخصوص مہارت کے علاوہ مردم سازی اور تربیت کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال ہوں چند ہی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں نام مولانا حبیب الرحمن عثمانی کا ہے اور دوسرا وحید الزماں کیرانوی کا۔

مولانا ایک اجتہادی تعمیری اور انقلابی ذہن و فکر کے مالک تھے اور اسی ذہن و فکر نے انہیں دارالعلوم میں ”نشاۃ ثانیہ کے نام پر اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کیا۔ وہ دارالعلوم کو موروثی تسلط کے دائرہ سے نکال کر ایک آزاد علمی اور ڈیموکریٹک فضاء میں لانا چاہتے تھے، لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کو کچھ ارباب غرض اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال کر لیں گے اور دارالعلوم پر ایک ایسا جاگیر دارانہ نظام مسلط کر دیں گے جو پہلے سے بھی بدتر ہو اور جسے علمی ترقیوں سے کم اور ذاتی مفادات سے زیادہ دلچسپی ہو۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا کو ان کی ہمہ جہتی صلاحیتوں کی بنا پر منصب اہتمام پر بٹھادیا جاتا تاکہ اس منصب کا علمی اور انتظامی وقار پھر سے بحال ہو جاتا۔

مولانا نے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں معولی سی تبدیلی کے ذریعہ دارالعلوم کی فضاء میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی وہ دارالعلوم جس کے طلبہ و اساتذہ عربی میں گفتگو

کرنے سے شرماتے اور کتراتے تھے اب اس کے درودیوار سے عربی لہجہ سنائی دینے لگا۔ علمی سطح پر مولانا نے دارالعلوم کے طلباء کو اس احساس کمتری اور مرعوب ذہنیت سے آزادی دلائی جس کا وہ ندوۃ العلماء کے طلبہ کے مقابلہ میں برسوں سے شکار تھے اور جس کی وجہ سے صرف عربی میں اظہار تعبیر کی صلاحیت سے انکی محرومی تھی مولانا نے ہی پہلی دفعہ استاد اور شاگرد کے درمیان وہ سچا رشتہ قائم کیا جو ان سے پہلے تعلیمی کم اور خادم و مخدوم کا زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ جتنی مقبولیت طلبہ کے درمیان مولانا کو حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی اور کے حصہ میں آئی ہو۔“ (۱)

پروفیسر بدالدین الحافظ، شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی مولانا کے رفیق خاص اور مخلص دوستوں میں سے تھے دارالعلوم کے تعلیمی زمانہ میں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے ہر لمحہ اور ہر حال میں ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے خوشی اور غم میں دونوں ایک ساتھ رہتے ہمیشہ ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہے لیکن اسے اتفاق کہتے یا مشیت ایزدی کہ پوری عمر ایک دوسرے کی خبر رکھنے کے باوجود مولانا کے آخری دیدار سے محروم رہ گئے اور جب خبر ہوئی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی آپکی وفات پر ایک تعزیتی مقالہ لکھا جس میں آپنے شروع سے لیکر تا وفات پوری داستان قلم بند کر دی اور ایک کر کے مولانا کے تمام اوصاف بیان کئے اس مقالہ کو مختصر انداز میں ہم یہاں بیان کرتے ہیں :

”چونکہ میں نے مولانا مرحوم کی بنیاد و خدمات کے آغاز کو چشم خود دیکھا اور اسے زمانے کے ماحول کے تناظر میں سمجھا اور پرکھا ہے اس لئے نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا وحید الزماں صاحب سے قبل دارالعلوم دیوبند میں عربی تقریر و تحریر اور انشاء پر دازی کا ماحول تھا ہی نہیں وہاں جو کچھ بھی علمی یا دینی و ادبی کام ہوا اس کا تعلق انشاء پر دازی یا عربی صحافت وغیرہ کی ذہن سازی سے نہ تھا اور اس چھٹی دہائی میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں اساتذہ کرام میں صرف حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ وہ واحد شخص تھے جو بے تکلف عربی زبان میں عربوں سے گفتگو کر سکتے تھے اور جہاں تک طلبہ کا تعلق ہے اس وقت پورے دارالعلوم میں گنتی کے چار چھ طلباء، عربی انشاء یا گفتگو کی قدرت رکھتے تھے ان میں مولانا وحید الزماں اور مولانا محمد اسماعیل افریقی کا نام مجھے یاد ہے۔ اور ان طلباء کی صلاحیت بھی انکے ذاتی شوق اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔

اسے حسن اتفاق کہیے کہ چند سال بعد وحید الزماں کو صف عربی کے مدرس کی

حیثیت سے دارالعلوم نے قبول کر لیا اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق انتھک محنت اور شوق و ذوق سے طلباء کو عربی ادب کی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا طلباء میں شوق پیدا کرنے اور صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے انھوں نے جو طریقے اختیار کئے وہ بھی دارالعلوم کی تدریسی تاریخ میں قطعی منفرد حیثیت رکھتے تھے مثلاً النادی الادبی کا قیام اس عربی کلب کے ذریعہ کہیں تعلیمی پروگرام چلائے گئے جن میں عربی کی جدید کتب و رسائل و اخبارات کی لائبریری کا قیام اور ہفتہ واری، ماہانہ اور سالانہ جلسوں کا پروگرام شامل ہے جن کی ساری کاروائی اول تا آخر عربی زبان میں ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھنی چاہئے کہ ابتداء میں طلباء کے اس منجمد ماحول کو متحرک کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ایک اکیلے استاد کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی، اس کو تعلیم و تربیت کا تجربہ رکھنے والا شخص ہی بخوبی سمجھ سکتا ہے بہر حال اس مسلسل کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دارالعلوم کی چہار دیواری میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے طلباء مل سکتے ہیں جو عربی تقریر و تحریر میں نہ صرف عربوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ جو علماء فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں متعدد اعلیٰ مناصب پر اپنی عربی صلاحیت سے طلباء اور عوام کو فیضاب کر رہے ہیں ان کا شمار مشکل ہے ان تمام ناموران علم و ادب کو وحید الزماں ہی کے فیض صحبت و شرف تلمذ نے جلا بخشی ہے۔“ (۱)

## دارالعلوم میں مولانا کے اثرات

مولانا وحید الزماں کیرانوی کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف حمیدہ سے متصف کیا تھا وہ عموماً کم ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں مولانا نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے اندر وہ صلاحیتیں جمع کر لی تھیں جن کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند ہی میں نہیں بلکہ برصغیر کے تمام علمی و ادبی حلقوں میں انکی صلاحیتوں کو بنظر تحسین دیکھا جاتا تھا یہاں تک کہ آپکو ملک سے باہر کئی معروف یونیورسٹیوں کی طرف سے پیش کش ہوئی مگر آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں اور کمالات کا فائدہ اپنے مادر علی (دارالعلوم اور وہاں کے طلباء عزیز کو پہنچانا بہتر اور افضل سمجھا۔

آپ نے دارالعلوم میں ملازمت کے دوران تدریسی، تنظیمی اور خاص طور پر تربیتی میدانوں میں جو مثالی کردار ادا کیا، اسکی نظیر نہیں پائی جاتی اوقات کی پابندی، وقت کی قدر و قیمت، خود کو فعال اور منظم رکھنا اور نظم و نسق کے ساتھ طلبہ کی زندگیوں میں شعور و سلیقہ مندی کا رنگ بھرنا اور وقتاً فوقتاً طلبہ عزیز کی خبر گیری

۱- پروفیسر بدر الدین الحافظ ”ترجمان دارالعلوم جدید“ خصوصی شمارہ ۱۹۹۵ء ص ۴۲۰-۴۲۱

انکے دکھ درد میں شامل رہنا مولانا مرحوم کے اس مخلصانہ کردار اور جذبہ دایثار کو دیکھ کر طلبہ عزیز نے ان کو اپنا سمجھا مربی اور محسن بنالیا تھا۔

اس گلشن علمی کو جن جلیل القدر علماء نے اپنے خون پسینے سے سینچا ہیں اس کی ترقی اور استحکام کے لئے راحت و آرام کو قربان کیا اور اس کو ایشیاء کی عظیم ترین درس گاہ بنایا انہیں میں سے ایک مولانا وحید الزماں بھی ہیں بلکہ وہ بعض کمالات میں منفرد ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ مجموعہ کمالات تھے زبان و ادب حدیث و فقہ، تفسیر و تالیف، صحافت و خطابت اور انتظامی و تعلیمی صلاحیتوں میں فرد وحید تھے، کسی ایک شخص میں اتنے کمالات کا جمع ہونا محض فضل خداوندی ہے۔ جو ہر شخص کو نہیں ملتا اس بات میں قدرت کی طرف سے انتخاب کا خاص دخل ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر چمنستان دارالعلوم کی آبیاری کی ہے بلکہ ازسرنو اس کی چمن بندی کی ہے۔ اپنی جان سے زیادہ اس کو چاہا ہے چنانچہ آپ کی مساعی سے دارالعلوم ایک بنیاد دارالعلوم بنا، ہر شعبہ ترقی و استحکام اور جمال و کمال کا آئینہ دار ہوا آپ نے اپنے طالب علمی ہی کے زمانہ سے دارالعلوم میں عربی زبان و ادب کی کمی کو محسوس کر لیا اور اس خامی کو دور کر نیکاً عزم بالجزم کر لیا اسی وقت سے اس سمت میں کوشش بھی شروع کر دی اور اپنے قریبی طلبہ کو اس طرف راغب کرنا بھی شروع کر دیا انھیں خود پڑھاتے اور عربی اخبارات وغیرہ پڑھنے کا ذوق پیدا کرتے، عام طلبہ کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے عربی کی چند تعبیرات لکھ کر دارالعلوم کے کسی شارع عام پر آویزاں کر دیتے یا کسی نوٹس بورڈ پر لگا دیتے جسے پڑھکر دوسرے طلبہ کے اندر بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

بہر حال فراغت کے بعد چند سال ادھر ادھر گزارے پھر طلبہ کی اصلاح اور انکے عربی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے دارالفکر نامی ایک ادارہ قائم کر دیا جہاں دارالعلوم کے طلبہ کو خالی وقت میں عربی تمرین و تمرن اور اپنے ماضی الضمیر کو عربی میں ادا کر نیکاً سلیقہ سکھاتے اس طرح آپ دارالعلوم سے باہر رہتے ہوئے بھی طلبہ میں کافی مشہور و مقبول ہو گئے تھے۔“ (۱)

لیکن اسے حسن اتفاق کہے یا قدرت کا کرشمہ کہ کچھ دنوں بعد آپ کو صف عربی کے درس کی حیثیت سے دارالعلوم نے قبول کر لیا لیکن اس وقت تک بھی وہاں عربی زبان و ادب کا کوئی شعبہ نہیں تھا آپ نے اہل دارالعلوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور باقاعدہ عربی ادب کے شعبہ کی تشکیل دی گئی آپ نے اپنی عادت کے مطابق انتھک محنت اور شوق و ذوق سے طلباء کو اس شعبہ کی طرف متوجہ کر لیا طلباء میں شوق پیدا کرنے اور صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے آپ نے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ بھی دارالعلوم کی تدریسی تاریخ میں قطعی منفرد حیثیت رکھتے تھے کچھ ہی دنوں میں اس شعبہ نے دارالعلوم میں اپنی انفرادیت کا سکہ جمادیا اس

شعبہ کے طلبہ کے لئے نئی نئی کتابیں تالیف کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنی چاہئے کہ ابتداء میں طلباء کے اس منہج ماحول کو متحرک کرنے اور انکی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ایک اکیلے استاد کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کو تعلیم و تربیت کا تجربہ رکھنے والا شخص ہی بخوبی سمجھ سکتا ہے بہر حال اس مسلسل کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دارالعلوم کی چار دیواری میں سیکڑوں کی تعداد میں ایسے طلبہ مل سکتے ہیں جو عربی تقریر و تحریر میں نہ صرف عربوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کر سکتے ہیں، علاوہ ازیں اس شعبہ سے فراغت حاصل کر کے مولانا کے شاگرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہندوستان و بیرون ہند میں اپنے استاد کا نام روشن کر رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت میں چار چاند لگا رہے ہیں آج وہ عربی اخبارات و مجلات کے مدیر و کالم نگار ہیں، عربی کے بہترین ادارے لکھتے ہیں، فی البدیہہ تقریر کرتے ہیں۔ اپنی مادری زبان اردو سے بھی کہیں زیادہ روانی کے ساتھ وہ عربی مضامین لکھتے ہیں۔ مولانا کے تلامذہ ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جو اپنے استاد کے ساتھ اپنے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی سرخ روئی کا باعث اور اس کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔“ (۱)

یہ تو آپکی تدریسی محنت کا نتیجہ تھا اب اگر یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے تحریر و تقریر کے میدان میں طلبہ کی کس حد تک رہنمائی کی اور آئندہ کے لئے کیا سرمایہ چھوڑا ہے تو اس کے لئے ہم ”النادی الادبی“ کو پیش کر سکتے ہیں۔ جس کے ذریعہ صرف طلباء کو عربی گفتگو کی مشق ہی نہیں بلکہ عربی خطابت کا بھی سلیقہ سکھایا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ سماجی زندگی میں جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے وہ تمام چیزیں اس تنظیم میں سکھائی جاتی ہیں، آپ نے اس کے پروگراموں کو بھی اس انداز پر ترتیب دیا کہ تمام طلبہ اس انجمن سے جڑ جائیں چنانچہ جمعرات کی شام بعد نماز مغرب (جو مدارس کے طلبہ کے لئے چھٹی کا وقت ہوتا ہے) اس کے پروگراموں کے لئے وقت مقرر کیا، اس انجمن کے پروگراموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے تمام پروگرام عربی میں ہوتے ہیں ایک درس گاہ میں بیس پچیس طلبہ ہوتے ہیں جن میں ایک نگران ہوتا ہے جو اس پروگرام کی کاروائی کو چلاتا ہے تقریر اور سوال و جواب عربی میں ہوتے ہیں خلاصہ یہ کہ اس انجمن سے متعلق تمام طلبہ عربی بولنے کے پابند ہیں۔

بہر حال ”النادی الادبی“ کا قیام مولانا کا وہ کارنامہ ہے جس نے دارالعلوم ہی نہیں بلکہ دارالعلوم کے طرز پر چلنے والے دیگر دینی مدارس میں بھی عربی کا ولولہ پیدا کر دیا، اسی نہج پر دوسرے مدارس میں بھی اس طرح کی انجمن قائم ہوئیں جن کے نتائج بہت ہی حوصلہ کن رہے۔

طلبہ میں تحریری صلاحیت پیدا کرنے کے لئے دیواری پرچوں کا اجراء کیا اور ”سلسلۃ الدروس



العربية“ کے نام سے ایک دیواری پرچہ کے اجراء فرمایا، جس سے طلبہ میں عربی تحریر کی مشق و مقالہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اس سے قبل دارالعلوم میں اس طرح کا کوئی پرچہ یا اخبار نہیں نکلتا تھا، چنانچہ اس دیواری پرچے کو دارالعلوم میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور آہستہ آہستہ دوسرے طلباء نے بھی اس پرچہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم میں عربی مضمون نگاری اور عربی میں گفتگو کر نیوالے نظر آنے لگے بعد ازاں دارالعلوم سے ایک سہ ماہی عربی مجلہ ”دعوة الحق“ کے نام سے جاری کیا یہ مجلہ تقریباً دس سال تک آپکی ادارت میں عرب دنیا میں دین و ادب کا جادو جگاتا رہا۔ دارالعلوم سے شائع ہونے والا عربی کا یہ پہلا مجلہ ہے، جس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی دارالعلوم کے نام کو روشن کیا، اس کا سہرا بھی مولانا وحید الزماں صاحب کے سر ہے، جنہوں نے پورے مجلہ کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھا ”دعوة الحق“ کے بند ہو جانے کے بعد ”الداعی“ پندرہ روزہ عربی اخبار نکلتا شروع ہوا تو آپ کو اس کا نگران مقرر کر دیا گیا آپ نے اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا۔ چنانچہ پورے اخبار کو شروع سے لیکر آخر تک بنظر عیقت دیکھتے پھر اسکو شائع کراتے، آخری سالوں میں ”آئینہ دارالعلوم“ کے نام سے ایک پندرہ روزہ اردو اخبار جاری کیا، جو دارالعلوم کی اندرونی خبروں اور کچھ مضامین پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔“ (۱)

شعبہ عربی ادب کے قیام کے بعد مولانا کو عربی تمرین و تمرن اور درسی کتابوں کی شدت سے کمی محسوس ہوئی آپ نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ”القرأة الواضحة“ کے تین اجزاء تالیف کئے جو اپنی جدت اور سہل پسندی کی بنا پر اس قدر مقبول ہوئی کہ آج بہت سے دینی مدارس کے علاوہ گورنمنٹ کے اداروں میں بھی داخل نصاب ہے، دہلی کے اسکول آف فارن لنگویجز (School of foreign languages) اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سرٹیفکٹ کورس میں داخل درس ہے، اس کے علاوہ ”نختہ الادب“ جسے دارالعلوم کی انتظامیہ کی گزارش پر تالیف کیا، تاکہ طلباء کے ذہنی تندر اور اخلاقی گراؤٹ کو دور کیا جائے، یہ کتاب اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہی اور اہل علم میں بھی بہت مقبول ہوئی، آج بھی دارالعلوم اور دیگر دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔

اس کے علاوہ ”القاموس الجدید“ (عربی-اردو، اردو-عربی) لغات نے جہاں جدید الفاظ و اصطلاحات کے حل کی مشکلات کو دور کیا وہیں پر عربی زبان و ادب کے فروغ میں بھی ایک اہم رول ادا کیا، یہ لغات ہندوستان میں شائع ہونے والی پہلی وہ لغات ہیں جنہوں نے عربی الفاظ و اصطلاحات کے شائقین کی تشنگی کو دور کیا، ہندوستان میں شاید ہی کوئی عربی داں ایسا ہو جو ان لغات سے واقف نہ ہو۔

یہ تو آپکی اس محنت اور جدوجہد کا نتیجہ تھا جو طلبہ یا دارالعلوم کی فضاء کو عربی زبان و ادب سے معطر

کرنے پر لگائی، اب اگر ہم دیکھنا چاہیں کہ دارالعلوم کی تزئین و تہئیں میں کیا رول ادا کیا تو موجودہ دارالعلوم کو ماضی کی نگاہ سے موازنہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ دارالعلوم میں کوئی ایسی جگہ نہیں ملے گی جہاں تزئین و تہئیں کے عنوان سے کوئی کام نہ کیا گیا ہو اور طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر آپ نے حتی الامکان کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جس میں طلباء کی رہائش، انکی تعلیم کے لئے درسگاہیں اور انکی ضروریات کے پیش نظر عمارتیں نہ تعمیر کرائی ہوں، دارالعلوم میں پختہ راستے اور بڑے بڑے خوبصورت لان یہ سب مولانا کے ذوق کی غمازی کرتے ہیں، آج بھی جگہ جگہ لکڑی کے کتبے، عربی اور اردو زبان میں ہدایت نامے اور نصیحت آمیز جملے دیواروں پر چسپاں ہیں یہ مولانا کے جدت پسند ذہن کا ایک نمونہ ہے۔“ (۱)

## خاتمہ

گزشتہ اوراق میں مولانا وحید الزماں کی متنوع شخصیت اور ادبی اکتسابات کا بہت شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ مولانا موصوف صرف فاضل و محقق اور مفسر و مترجم ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک صاحب طرز ادیب، بلند پایہ صحافی، ماہر لغت اور منفرد مکتوب نگار بھی تھے مبداء فیاض سے انہیں گونا گوں صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں ان کی ذات والا صفات میں اتنے متنوع اور گونا گوں کمالات جمع ہو گئے تھے جن کا کسی فرد واحد میں جمع ہونا نادر احوال میں شمار کیا جاتا ہے قدیم صالح، جدید نافع کے باہمی امتزاج کا ایسا دلکش متوازن اور مثالی نمونہ جسکی نظیر اس زمانہ میں تو کجا اس عہد میں ملنا بھی مشکل ہے ان کی سادگی قناعت پسندی، اخلاص اور للہیت اور ان کے علمی اکتسابات اور تحقیقی فتوحات کو دیکھا جائے تو یقین نہیں آتا کہ اتنے مختلف النوع موضوعات پر اتنی وسعت معلومات مہارت فن دقت نظر اور مجتہدانہ شان سے کسی فرد واحد نے لکھا ہے۔

اگرچہ مولانا وحید الزماں کے تبحر علمی اور جلالت شان کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا اور علم و حکمت کے ایسے ایسے موتی چن کے لائے گویا کہ یہی موضوع انکا موضوع خاص تھا اور اس کی تحصیل ان کا حاصل زندگی، لیکن حق یہ ہے کہ ان کا اصلی میدان کار جہاں انکی ژرف نگاہی جولانی فکر اور مجتہدانہ شان اپنے منہاء کمال پر نظر آتی ہے وہ لغت کا موضوع ہے، لغات پر غور و خوض اور تدبر و تفکر کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی اور اسی کو مقصد حیات بنالیا تھا، انہوں نے لغت و ادب کو باہم آغوش کر دیا اور ان دونوں کے سنگم سے اپنی ادبی فتوحات میں وزن اور وقار پیدا کیا۔ مولانا کی زندگی دراصل حرکت و عمل سے عبارت تھی اور چونٹھ پینٹھ سال کی عمر میں انہوں نے جس قدر مختلف النوع کارنامے انجام دئے ہیں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے وہ صرف مدرس ہی نہیں بلکہ

اعلیٰ مربی بھی تھے مروجہ سازی اور رچال سازی کی تیاری میں وہ اپنی مثال آپ تھے، ایک بلند پایہ مدرس و عالم ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مقرر بھی تھے علاوہ ازیں غیر معمولی تصنیفی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے اپنی انتہائی مصروف و ہنگامہ خیز زندگی میں نہ جانے وہ کس طرح تصنیف و تالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔

مولانا کیرانوی کو عربی علوم و فنون میں ملکہ حاصل تھا وہ عربی ادب میں اہم مقام کے مالک تھے عالم عرب انکی عربی دانی سے حد درجہ متاثر تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں انکی خدمات قابل قدر و قابل ستائش رہی ہیں آپ برصغیر کے ان قابل اور خوش نصیب علماء دین میں سے ہیں جن کے شاگرد بالواسطہ یا بلاواسطہ مدارس عربیہ کے اساتذہ و طلباء ہیں ادب عربی میں جدید تعلیمی رجحانات کو عملی شکل میں ایک شعبہ کی حیثیت سے قائم کر دینے میں مولانا کی خدمات نقش اول کی حیثیت سے نمایاں اور یادگار رہیں گی مولانا اپنے ہم عصر اہل علم کے طبقے میں علم و بصیرت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ مقام رکھتے تھے علاوہ ازیں نہایت بے پاک، نڈر اور حق گو قائد انتظامی امور میں نہایت تجربہ کارانہ صلاحیت کے حامل گفتار و کردار میں توازن یہ ایسے اوصاف ہیں جو مولانا کی شخصیت میں جمع ہو گئے تھے۔

طلباء کی اصلاح و تربیت میں مولانا کو بڑی مہارت تھی، اپنے مخصوص انداز اور شیریں بیانی سے بہت جلد طلباء کو فریفتہ کر لیتے تھے مطالعہ کی سچی لگن کتاب سے تعلق زبان و قلم کی صلاحیت پیدا کر دینے میں مولانا بے حد طویل رکھتے تھے، معمولی استعداد والے طالب علم کی بھی اتنی ہمت افزائی کرتے کہ اس کے اندر بھی خود اعتمادی کا جذبہ ابھر جاتا، طلباء کو ایک حد تک تقریر و تحریر کی آزادی دیکر ان پر کنٹرول رکھنا مولانا کا ممتاز وصف تھا۔

مولانا کی نادر علمی کاوشیں اور ادبی نگارشات جس عہد میں منصفہ شہود پر آئیں وہ مختلف حیثیتوں سے ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین دور شمار ہوتا ہے دنیاء ادب میں جدید میلانات اور تقریر پر رجحانات برابر پروان چڑھ رہے تھے۔ انہوں نے عربی کو نہ صرف اسلوب کا ایک معیاری سانچہ دیا بلکہ عربی لغات کے دبستان و امام بھی قرار پائے آپ نے اقتضاء عصر کے مطابق دارالعلوم کو ڈھالنے کی کوشش کی آپ اپنی تقریباً ۴۰ دہائیوں پر محیط تصنیفی زندگی میں عربی زبان و ادب کو سر بلند کرنے کے لئے بہت بلند پایہ مقالات لکھے، بلاشبہ مولانا کے مقالات، لغات اور ادبی کاوشوں کو ملک کے عربی داں حلقوں میں قبول عام کی سند حاصل ہوئی ان سے فکر و نظر کی نئی راہیں کھلیں اور قلب و ذہن کو روشنی کی دولت ملی مولانا کی عربی صحافت کا چراغ ”دعوة الحق“ کے صفحات سے روشن ہوا اور پھر ”الکفاح“ اور ”الداعی“ میں آپ کی صحافت نگاری کے جوہر نمایاں و تاباں ہوئے لیکن انکی صحافت مبتذل و سطحی اخباری صحافت سے یکسر مختلف تھی، آپ کا کارنامہ یہ ہیں کہ اپنے ہندوستان میں عربی صحافت کو علمی وقار، ادبی پاکیزگی اور اسلوبی متانت عطا کر کے اس کی سرحدوں کو تخلیقی

ادب سے ملا دیا چنانچہ ”دعوة الحق“ الکفاح اور الداعی کے اوراق میں مولانا نے ایسے بکثرت مقالات اور ادارے لکھے جو ادب العالیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا کی زندگی واقعتاً عزم و عمل کی ایک کھلی کتاب تھی، انہوں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ بھی جس میدان میں قدم رکھا اپنے علم و کمال عزم و جلال کا لوہا اپنے حریفوں اور مخالفوں سے بھی منوالیا اور جو کچھ زبان سے کہا کر دکھایا، دارالعلوم کی زندگی میں جو شعبہ بھی انکے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کی بلکہ وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھے۔ علمی مسائل میں مولانا بہت سنجیدہ اور قابل عمل رائے رکھتے تھے جذباتی اور غیر سنجیدہ امور اور طریق کار سے انکو سخت اختلاف ہوتا تھا، مولانا کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ جو رائے قائم کرتے اسکو جرأت و بیباکی سے ظاہر کرتے، مصلحت کو شی کی سیاست کے وہ قائل نہ تھے ان میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ جس سے جو شکایت ہوتی اس کے سامنے برملا اس کا اظہار کر دیتے۔

مولانا نے جس میدان میں بھی قدم رکھا اس میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی، جمعیتہ علماء ہند ملی جمعیتہ علماء ہند اور مرکزی جمعیتہ کے پلیٹ فارم پر بھی سیادت و قیادت اور علمی سرگرمیوں کی اپنی تاریخ بنائی وہ اس میدان کے چابکدست شہسوار تھے ملی و بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے واقعات پر بے لاگ تبصرہ کرتے تھے ہر مسئلہ پر اپنی پختہ رائے رکھتے تھے اور پورے اعتماد سے اپنی دو ٹوک رائے کا اظہار کرتے تھے، بیجا مداخلت منصب کا غلط استعمال شورائیت کی بے حرمتی موقع پرستی اور وقتی مفاد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

## الفہرس

### کتابیات

آثار رحمت	امداد صابری یونین پرنٹنگ پریس دہلی
اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ	سید عبداللہ لاہور
اسباب بغاوت ہند	مقدمہ فوق کریمی کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۱ء
اسلامی صحافت	سید عبید السلام زینی مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۹۰ء
اسلامی آداب	مولوی وحید الزماں کیرانوی مکتبہ دینیات آصف علی روڈ دہلی
انسانیت کا پیغام	مولوی وحید الزماں کیرانوی مکتبہ دینیات آصف علی روڈ دہلی
تاریخ تحریک آزادی ہند	تارا چند قومی کونسل برائے فروغ اردو ترقی بیورو دہلی ۱۹۸۰ء
تاریخ دارالعلوم دیوبند	محبوب رضوی دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۷ء
تاریخ جمعیت علماء ہند	مولانا اسیر لاروی شعبہ اشاعت جمعیت علماء ہند نئی دہلی ۱۹۸۳ء
تاریخ مسلم لیگ	مرزا اختر حسن مکتبہ لیگ بمبئی
تحریک ریشمی رومال	مولانا عبدالرحمن (طبع دوم) کلاسک ۳۲ دی مالی لاہور ۱۹۶۶ء
تحریک آزادی اور مسلمان	مولانا اسیر لاروی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء
تخلیق کائنات	مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء
حدیث دفاع (کتابچہ)	دفتر عالمی تنظیم و فضلاء ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند
خدا کا انعام	مولوی وحید الزماں کیرانوی کتب خانہ حسینہ دیوبند
دارالعلوم سے میری سبکدوشی (مدلل جواب کتابچہ)	مولانا وحید الزماں کیرانوی
دارالعلوم کالمیہ واقعات کے آئینہ میں (کتابچہ)	مولوی حبیب الرحمن قاسمی شعبہ نشر و اشاعت تنظیم ابناء قدیم ۱۹۹۰ء
دلیل القرآۃ الواضحہ	مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء
سیاست ملیہ	محمد امین زبیری عزیزی پریس آگرہ ۱۹۴۱ء
شرعی نماز	مولوی وحید الزماں کیرانوی اسلامی تبلیغی مشن مٹھ محل دہلی
صحیفہ ابرار	تنویر احمد علوی ادارہ مطبوعات نور محمدیہ جھنجھانہ مظفر نگر
علاء ہند کا شاندار ماضی مولانا سید محمد میاں	الجمعیتہ بکڈ پوگلی قاسم جان دہلی ۱۹۵۷ء

القاموس الجدید مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالفکر دیوبند ۱۹۵۹ء  
 القاموس الاصطلاحی مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء  
 القراءة الواضحة مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء  
 قضیہ دارالعلوم دیوبند واقعات و حقائق کی روشنی میں شعبہ نشر و اشاعت وقف دارالعلوم دیوبند  
 مسلمانوں کا روشن مستقبل طفیل احمد منگھوری کتب خانہ عزیز یہ دہلی ۱۹۵۴ء  
 مظفر نگر گزیٹر دنگی پرساد ورون حکومت اتر پردیش ڈپارٹمنٹ آف  
 ڈسٹرکٹ گزیٹر لکھنؤ

مفتاح كنوز السنۃ رشید رضا مصری لجنۃ دائرة المعارف الاسلامیہ مصر ۱۹۳۳ء  
 فقہ الادب مولوی وحید الزماں کیرانوی دارالمؤلفین دیوبند ۱۹۸۸ء  
 وہ کونہ کن کی بات مولوی نور عالم خلیل الایمنی ادارہ علم و ادب دیوبند ۱۹۹۰ء  
 ہندوستانی سماجیات جعفر حسن انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۵۵ء  
 ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج و زوال رفیق زکریا ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۰۷ء  
 ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں سید عابد حسین یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۶ء  
 ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر ڈاکٹر محمد اشرف (طبع اول) مارچ ۱۹۶۳ء  
 ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۹۰ء  
 ہندوستانی مسلمان (ایک تاریخی جائزہ) مولانا ابوالحسن علی ندوی مجلس تحقیقات و نشریات اسلام  
 ندوۃ العلماء لکھنؤ

## رسائل و اخبارات

آئینہ دارالعلوم دیوبند اپریل ۱۹۹۵ء دارالعلوم دیوبند پریس  
 اظہار حقیقت خبرنامہ عالمی تنظیم فضلاء دارالعلوم دیوبند ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء  
 البعث الاسلامی جون - جولائی ۱۹۹۵ء لکھنؤ  
 ماہنامہ البدر مئی ۱۹۹۵ء کاکوری  
 ترجمان اسلام ۱۹۹۵ء دارالعلوم بنارس  
 ثقافت الہند ج ۳۸، شمارہ ۱-۴، ۱۹۸۷ء دہلی  
 ماہنامہ حسن اخلاق جون ۱۹۹۵ء نئی دہلی  
 پندرہ روزہ خبردار مئی ۱۹۹۵ء مراد آباد

ترجمان دارالعلوم جدید (خصوصی شمارہ) تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند ۱۹۹۵ء نئی دہلی	
ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (مختلف شمارے) ۱۹۷۳ء	
ماہنامہ دانشور	فروری-مارچ ۱۹۹۵ء گورکھپور
ماہنامہ دینی مدارس	۱۹۹۵ء دہلی
دعوت (ہندوستانی مسلمان نمبر)	نئی دہلی ج ۷ ۴ شمارہ ۲۸، مارچ ۱۹۹۹ء
ماہنامہ الداعی	جون ۱۹۹۵ء دارالعلوم دیوبند
دعوت الحق (مختلف شمارے)	دارالعلوم دیوبند
الرائد	ندوة العلماء لکھنؤ ۱-۱۶ مئی ۱۹۹۵ء
ماہنامہ رفیق منزل (مسلم تعلیمی تحریکات و شخصیات نمبر)	مئی و جون ۱۹۹۷ء دہلی
ماہنامہ ریاض الجنۃ	اپریل ۱۹۹۵ء جونپور
روزنامہ عزائم	۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء لکھنؤ
عکاظ	۲۳ جون ۱۹۹۵ء سعودی عرب
فکر اسلامی	دسمبر ۱۹۹۵ء دارالعلوم بستی
ماہنامہ الفرقان	اکتوبر ۱۹۸۱ء لکھنؤ
فکر و نظر (تحریک آزادی نمبر)	۱۹۸۵ء علی گڑھ
قومی آواز	اپریل ۱۹۹۶ء دارالعلوم دیوبند
ماہنامہ القاسم جدید (مختلف شمارے)	۱۹۶۰ء دارالفکر دیوبند
الکفاح	(مختلف شمارے) مرکز دعوت اسلامیہ (جمعیت پریس) دہلی
گلگن (ہندوستانی مسلمان نمبر)	بہمنی ۱۹۷۵ء
ندائے دارالعلوم دیوبند	مئی ۱۹۹۵ء دارالعلوم دیوبند
ندائے شاہی	مئی ۱۹۹۵ء مرآۃ آباد
نئی دنیا	ج ۱ شمارہ ۲۳ ۷ دسمبر ۱۹۸۱ء دہلی